تذکرۂ دربار حیدرآباد

رمن راج سکسینہ

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

TAZKIRA DABAR-E- HYDER ABAD
BY
RAMAN RAJ SAXENA

سنہ اشاعت: جنوری، مارچ 1988 — شک 1909

پہلا اڈیشن: 1000
قیمت: 20/50
سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 577
کتابت: وکیل الرحمٰن ملک

ناشر: ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی-110066
طابع: جے کے آفسٹ پرنٹرز 3/5 جامع مسجد دہلی 110006

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قائم کیا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں، تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے۔ کیوں کہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مُسلّم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا، ذولسانی اور اردو۔ اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلا پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہو سکیں۔

یہ کتاب بھی بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو

فہرست عنوانات

پہلا دور ۱۱۵۰ھ تا ۱۲۰۰ھ

یعنی ۱۷۵۳ء تا ۱۸۰۳ء

دوسرا دور

۱۲۰۰ھ تا ۱۲۲۵ھ

یعنی ۱۸۰۰ء تا ۱۸۲۵ء

تیسرا دور

۱۲۲۵ھ تا ۱۳۰۰ھ

یعنی ۱۸۲۵ء تا ۱۸۸۴ء

چوتھا دور

۱۳۰۰ھ تا ۱۳۳۰ھ

یعنی ۱۸۸۴ء تا ۱۹۱۱ء

پانچواں دور

۱۳۳۰ھ تا ۱۳۵۵ھ

یعنی ۱۹۱۱ء تا ۱۹۳۶ء

دیباچہ

میرے کرم فرما جناب رمن راج صاحب سکسینہ ایڈوکیٹ نے ازراہ مہربانی مجھے اپنی کتاب "تذکرہ دربار حیدرآباد" کا مسودہ ایک نظر دیکھنے کا موقعہ عنایت فرمایا۔ میں نے یہ کتاب بڑی دلچسپی سے پڑھی۔ مصنف نے اس کی دلکشی کو برابر قائم رکھا ہے۔ انداز بیان سلیس اور شگفتہ ہے۔

رمن راج صاحب کو اردو ادب اور شاعری سے بڑا لگاؤ ہے۔ وہ اردو ادب کی علمی، ادبی اور تہذیبی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے حصّہ لیتے رہے ہیں۔ وہ خود بھی حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار اور نمایندہ ہیں۔ بانی شہر حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ کی تقریب کو ہر سال جس اہتمام سے منایا جاتا ہے وہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کے والد شری رائے ست گرو پرشاد صاحب حیدرآباد کی قدیم روایات اور تہذیبی قدروں کے علمبردار ہیں۔ رائے صاحب کو حیدرآباد کی تاریخ سے گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ انھوں نے حیدرآباد کے آثار سے متعلق جو کتاب "فرخندہ بنیاد حیدرآباد" لکھی ہے وہ بڑی مستند ہے۔ علم وادب اور تاریخ کا یہ ذوق۔ رمن راج سکسینہ کو ورثہ میں ملا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے اس کام کو جاری رکھا۔

حیدرآباد کے حالات اور تاریخ پر بہت کم لوگوں نے قلم اٹھایا ہے۔ پاکستان سے کچھ کتابیں چھپی ہیں مگر وہ نہ تو مستند ہیں اور نہ اس قدر معیاری کہ اس پر کچھ لکھا جاسکے۔ البتہ ہارون خاں صاحب شیروانی نے نئے ڈھنگ سے دکن کی تاریخ لکھی ہے اور ڈاکٹر زور نے اس دور کی علمی وادبی سرگرمیوں پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اب تو مورخین تاریخ کے ان اوراق ماضی کی طرف توجہ کرنا ہی نہیں چاہتے اور بہت سے اس کو اہمیت نہیں دیتے۔ آصف جاہی دورِ حکومت عمدہ نظم ونسق اور عدل گیری میں بہت مشہور رہا ہے۔

یہ آصف جاہی دورِ حکومت کی سیاسی مذہبی اور علمی تاریخ ہے مصنف تاریخ نویسی کی قدیم روایات سے ہٹ کر اس کو اس دور کی علمی، شعری اور ایسی محفلوں اور تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں تک لے آیا ہے جن میں والی ریاست عابدین شہرا اور دوسرے امراء بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ہمیں یہ تفصیل آصف جاہ اوّل سے لے کر آصف جاہ سابع تک کے حالات میں ملتی ہے۔ اس میں آصف جاہی دور کے تمام امراء کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آصف جاہی عہد کے شعراء اور ان کے کلام پر تنقیدی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہی اس تذکرہ کی جان ہے۔ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کو بھی جا بجا بتایا گیا ہے۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں انگریز سامراج کا کتنا ہاتھ تھا۔
سنہ 1938ء سے سنہ 1948ء تک حیدرآباد میں جو سیاسی ہل چل مچی ہوئی تھی اس کی تفصیل اس میں ملتی ہے۔ حیدرآباد میں غیر ملکی تحریک جس انداز میں چلتی رہی اور مقامی (TALENTS) کو جس طرح نظرانداز کیا جاتا رہا اس کی ایک مکمل تاریخ اس تصنیف میں ہمیں ملتی ہے۔

رمن راج صاحب سکسینہ قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے آصف جاہی دورِ حکومت کی تاریخ کو ایک نئے انداز سے لکھ کر ہمیں روشناس کرایا ہے۔ تاریخی واقعات کے تسلسل کو اس انداز سے تحریر کیا ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

امجد یوسف زئی

۲۵ر دسمبر ۱۹۸۰ء

میں بعد مرگ بھی بزم وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر میری محفل میرا مزار نہ پوچھ

سیماب اکبرآبادی

کتابیات

1. My Public Life .. By Mirza Ismail
2. List of the leading Officials nobles and personages .. Published by Hyderabad Residency, Govt. Press 1937
3. The story of the Integration of the Indian States .. By V.P.Menon
4. An Engineering Wizard of India .. Mr. Dildar Hussain
5. Hyderabad in Retrespect.. Nawab Ali Yawar Jung
6. End of An Era .. K.M. Munshi

   Asif Jah the First .. Dr. Yousuf Hussain Khan

۷- دبدبۂ نظام

۸- کارنامہ سروری .... نواب سرورالملک

۹- تاریخ قلمرو نظام .... آئی. کلاڈ کیمبل ترجمہ طالب علی شمس الدین

۱۰- بستان آصفیہ .... مانک راؤ وٹھل راؤ

۱۱- میر عالم .... سراج الدین طالب

۱۲- سید لشکر خاں رکن الدولہ .... شمس اللہ قادری

۱۳- خطبات نواب بہادر یار جنگ .... نذیر الدین احمد

13- تاریخ عدالت آصفی .... میر باسط علی خاں
14- حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کی تاریخ .... جی۔ راماچاری
15- تاریخ مجلس اتحاد المسلمین مملکت آصفیہ اسلامیہ 1928ء تا 1940ء .... دارالاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین
16- نظام حیات تذکرۂ نواب سر نظامت جنگ .... نظیر حسین فاروقی
17- حیات آصف .... محمد محبوب جنیدی
18- حیات ماہ لقا .... غلام صمدانی خاں گوہر
19- وقایع مرزا یار جنگ .... سید منظر علی مطبوعہ 1342ھ
20- ارمغان عرفانی (حیات عثمانی) .... شیخ یعقوب علی عرفانی تاریخ اشاعت 1936ء
21- تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن .... ابو ظفر مویدالدین حسن
22- مملکت آصفیہ .... شائع کردہ ادارہ محبان دکن کراچی
23- سراغ رسانی اور تفتیش .... محمد مرتضیٰ خاں
24- حیدرآباد کے بڑے لوگ .... غلام پنجتن شمشاد
25- مشاہدات .... نواب ہوشیار جنگ (ہوش بلگرامی)
26- یادوں کی برات .... جوش ملیح آبادی
27- منظر الکرام .... سید منظر علی اشہر سنہ اشاعت 1345ھ
28- راجہ راجیشور راؤ اصغر .... ٹی۔ نرہری
29- ذکر یار چلے .... مرزا ظفر الحسن نفیس اکاڈمی کراچی 1978ء
30- دکن اداس ہے یارو .... مرزا ظفر الحسن حسامی بک ڈپو حیدرآباد
31- شہر حیدرآباد .... سلسلۂ مطبوعات سیاست حیدرآباد
32- حیدرآباد نگینہ .... " " " "
33- فرخندہ بنیاد حیدرآباد .... ڈاکٹر محی الدین قادری زور
34- حیدرآباد فرخندہ بنیاد .... رائے ست گرو پرشاد
35- صورت گران حیدرآباد .... سلسلۂ مطبوعات سیاست

36- داستان ادب حیدر آباد .... ڈاکٹر محی الدین قادری زور
37- مرقع سخن جلد اول و دوم .... ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد
38- تاریخ ریاست حیدر آباد .... نجم الغنی
39- تاریخ گولکنڈہ .... عبد المجید صدیقی
40- تزک محبوبیہ ....
41- مکتوبات نواب بہادر یار جنگ .... نذیر الدین احمد
42- دستوری اصلاحات .... شائع کردہ حیدر آباد پیپلز کنونشن کمیٹی

دکن لا رپورٹ مشین پریس جام باغ حیدر آباد

چند وضاحتیں

دربار حیدرآباد کا یہ محض ایک " تذکرہ " ہے۔ کوئی مسلسل تاریخ نہیں۔

اس تذکرہ کا منشا یہ ہے کہ عمادین سلطنت کو ان کے اپنے ماحول اور ان مسائل کے ساتھ پیش کیا جائے جن میں وہ سانس لیتے رہے۔ تاکہ ان اصحاب کی کامیابی ناکامی اور مجبوری واضح ہو سکے۔

ساتھ ہی ساتھ ہر امیر کے طور طریق۔ ملنے جلنے کے آداب اور حفظ مراتب کو ظاہر کیا گیا ہے تاکہ ماضی کے یہ "آداب" جو اب تیزی کے ساتھ فراموش کیے جا رہے ہیں۔ کم از کم کاغذی طور پر محفوظ رہ سکیں۔

حکمراں اور وزراء کی اُن مجبوریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کی بنا پر وہ انگریز کمپنی، برٹش گورنمنٹ اور رزیڈنٹ حیدرآباد کے ارشادات کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے لیے مجبور کیے جاتے رہے۔

حیدرآباد کے امراء، علم و فراست، تدبر و دانش میں کسی علاقہ کے سربرآوردہ مدبرین سے کسی طرح کم نہ تھے۔ لیکن یہ زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ انھیں کسی ایک طاقتوں کا ایک ساتھ سامنا کرنا پڑا۔ دربار پونا۔ ٹیپو سلطان۔ فرانسیس اقتدار اور انگریزی ڈپلومسی۔ یہ وہ حدود تھے جن میں حیدرآباد گھر چکا تھا۔ دکن میں توازن قوت کی برقراری تمام تر حیدرآبادی دربار کے طور و طریق پر منحصر تھی۔

یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کبھی ایک حلیف کی تائید کرتا رہا اور کبھی مخالفت۔ لیکن اس حکمت عملی کا صحیح جائزہ نہ لیا جاسکا۔

اس "داستان گوئی" کا اصل مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ حیدرآباد کا اپنا ایک معاشرہ اور تمدن تھا۔ جس کو بنانے اور قائم رکھنے میں حکمراں۔ امیر اور غریب سب برابر برابر کے شریک تھے۔

....

پہلا دور

۱۱۵۰ھ تا ۱۲۰۰ھ

یعنی ۱۷۵۳ء تا ۱۸۰۳ء

سنہ ۱۱۵۰ھ ــــ ۱۲۰۰ھ کے عرصہ میں" خاندان آصفیہ کے تین حکمراں گزرے ہیں۔ نواب قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ اول نواب ناصر جنگ شہید اور نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ایک نئی ریاست کی بناڈالی گئیں۔ اندرونی سازشوں، بغاوتوں اور سیاسی بے چینی کے باوجود علمی وادبی سرگرمیاں حکومت کے ایوانوں اور امراء کے دیوان خانوں میں جاری رہیں۔ یہ تینوں حکمران نہ صرف علم وفضل شعر وسخن کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے بلکہ ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی بھی کیا کرتے تھے آصف جاہ اوّل آصفؔ اور شاکر تخلص کرتے تھے اور عبدالقادر بیدلؔ سے اصلاح سخن لیا کرتے تھے۔

ناصر جنگ شہید تین چار سال حکمراں رہ کر سنہ ۱۱۶۴ھ میں شہید ہوئے ان کا تخلص ناصرؔ تھا اور اردو وفارسی کے باکمال شاعر تھے۔ ایک شعر ہے ؎

روز بد میں کس سے ہے یارو رفاقت کی امید
گر زوال آتا ہے ٹل جاتا ہے سایہ ساتھ سے

سنہ ۱۱۶۷ھ سے ۱۲۰۰ھ تک کا دور نظام علی خاں آصف جاہ ثانی اور ان کے امراء و وزراء کی سیاسی، علمی وادبی سرگرمیوں سے عبارت ہے اس دور کے پچاس سے زاید دکھنی شعراء کا مختلف تذکروں میں ذکر ملتا ہے۔ ان شعراء میں اکثریت اورنگ آبادی شعراکی ہے۔ اس دور کے شعرائیں شاہ سراج اورنگ آبادی، مرزا نوازش علی شیدا، شاہ تجلی علی تجلی، داؤد اورنگ آبادی، مرزا علی نقی، ایجادؔ

بالاجی ترمبک نایک، ذرہ، مرزا جمال اللہ، لال چند رنگین، سرونجی رائے لالہ، موہن لعل مہتاب، لالہ جے کشن بے جان، محما یگ رضا چند قابل ذکر شعرا ہیں۔ ان تمام شعرا کا کلام گل عجائب، گلشن بے خار، گلزار سفیہ، چمنستان شعراء، تذکرہ شعراء اورنگ آباد میں ملتا ہے۔

اس دور کے شمالی ہند کے شعراء نجم الدین علی خاں آبرو، انعام اللہ خاں یقین مرزا جانِ جاناں، مظہر، محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر حسن، شیخ ظہور الدین حاتم، یکرنگ، احسن اور بیدار قابل ذکر ہیں [1]

---

[1] مرقع سخن جلد اوّل

نظام الملک آصف جاہ اوّل

نظام الملک بانی مملکت آصفیہ نے "محمد شاہ غازی" کی دم توڑتی ہوئی شہنشاہیت کو سہارا دینے کی لاکھ کوشش کی لیکن آب شمشیر و سنان کا دور بہت عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا اور طاؤس و رباب کا دور دورہ تھا اور شہنشاہیت کی وسعت "از دلی تا پالم" رہ گئی تھی۔ راگ اور بھرویں کی تانوں میں رعایا دم توڑ رہی تھی اور دیوان عام جو کبھی شاہ جہانی اور عالم گیری جلال، جبروت کا مظہر تھا اب ارباب نشاط کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔ ان حالات میں، آصف جاہ اوّل نے دہلی کی کمزور اور دم توڑتی شہنشاہیت سے وزارت دکن کی سند حاصل کی اور اپنے مٹھی بھر جاںنثاروں کے ساتھ دکن کی جانب روانہ ہوئے۔ دوسری یا تیسری محرم سنہ ۱۱۳۷ھ م ۱۷۲۴ء کو صوبہ برار سے چالیس کوس کے فاصلہ پر قصبہ شکر کھیڑ کے قریب دکن کے نائب صوبہ دار مبارز خاں نے حسین علی خاں سادات بارھا کے اشارہ پر آصف جاہ کا راستہ روکا لیکن میدان جنگ میں کامرانی آصف جاہ کے حق میں لکھی گئی تھی۔ مبارز خاں لڑائی میں کام آیا۔ آصف جاہ اطراف و اکناف کے علاقوں کا انتظام کرتے ہوئے حیدرآباد تشریف لائے اور گوشہ محل کے باغ میں خیمہ زن ہوئے[1] شہامت خاں پسر مبارز خان نے چند روز محصور رہ کر سنہ ۱۱۳۸ھ میں قلعہ اور شہر کی کنجیاں آصف جاہ کے حوالہ کر دیں اور اطاعت قبول کر لی[2] اس طرح دکن میں مغلوں کی صوبہ داری کا سلسلہ جو زوال گولکنڈہ کے بعد سید بہادر دل خاں سے شروع ہوا تھا۔ بہادر خاں سبزداری، رستم دل خاں، اور مبارز خاں کی صوبہ داری پر ختم ہوا[3] اور ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔

آصف جاہ اول کا سلسلہ نسب

نواب آصف جاہ اول کا سلسلہ نسب شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی تک پہنچتا ہے[4]

---

[1] حیات آصف ص ۳۴۰

[2] " " " دبستان آصفیہ جلد اول ۲ ۳۰

[3] دبستان آصفیہ ص ۴۰ جلد اوّل

[4] صفو ۱ حیات آصف مولانا محمد محبوب جنیدی دبستان آصفیہ جلد اوّل ص ۴۱

خواجہ عابد خاں جو سمرقند کے مشائخین میں ممتاز مقام رکھتے تھے شاہجہاں کے دور میں ہند آئے، اور دربار سے وابستہ ہوئے۔ چین قلیج خاں خطاب اور پنج ہزاری منصب سے سرفراز کیے گئے۔ محاصرہ گولکنڈہ کے دوران زخمی ہوئے اور سنہ ۱۰۹۸ھ میں انتقال کیا۔ گولکنڈہ کی نواحی بستی عطاپور میں دفن کیے گئے[1]

غازی الدین خاں فیروز جنگ

خواجہ عابد خاں کے فرزند شہاب الدین خاں دربار عالم گیری کے اہم رکن تھے۔ انھیں غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب ہفت ہزاری منصب اور ہفت ہزار سوار کا اعزاز حاصل تھا۔[2]

بیجاپور کی فتح کے بعد "فرزند ارجمند" کا خطاب عطا ہوا۔ عالم گیر کے بعد جب بہادر شاہ اول تخت نشیں ہوئے تو نواب فیروز جنگ کا اعزاز اسی طرح برقرار رکھا گیا۔ نئے بادشاہ نے مالوہ کی صوبہ داری ان کے تفویض کی وہ چار سال تک اس خدمت پر فائز رہے۔ ۱۱۲۲ھ میں انتقال کیا۔ میت دہلی لائی گئی اور اجمیری دروازے کے قریب خود ان کی تعمیر کردہ خانقاہ میں دفن کی گئی ہے[3] نواب فیروز جنگ نے نواب عمدۃ الملک سعید اللہ خاں صدر المہام، شاہ جہاں بادشاہ کی دختر سے عقد کیا تھا[4] اور ان ہی کے وطن سے نواب قمرالدین خاں آصف جاہ اول ۱۴- ربیع الاول سنہ ۱۰۸۳ھ کو تولد ہوئے۔ "نیک بخت" سے سن ولادت نکلتا ہے[5]

نواب قمرالدین خاں آصف جاہ اول

جب آپ عالم گیر کے دربار میں اپنے والد کے ساتھ پہلی بار باریاب ہوئے تو

---

[1] صفحہ ۴۲ حیات آصف مولانا محمد محبوب جنیدی دبستان آصفیہ جلد اول

[2] ۳۰۲ ،، متاثر عالم گیری

[3] ،، ۲، حیات آصف مولانا محمد محبوب جنیدی

[4] ،، ۳، ،، ،، ،، ،،

[5] ،، ۳، ،، ،، ،، ،، دبستان آصفیہ صہ ۴۲

عالم گیر نے کہا" اس بچّہ کو ہفتہ میں ایک بار ہمارے پاس بھیجا کرو"۔ ایک بار عالم گیر چند امرا کے ساتھ باغ کی سیر کر رہے تھے۔ ہمراہی میں کمسن نظام الملک بھی تھے۔ بادشاہ نے ایک درخت کے پاس کھڑے ہو کر کہا" ہم دیکھتے ہیں کہ یہ درخت زمانہ سے اس قدر ہے" کمسن نظام الملک نے عرض کیا درخت کے پاس دیگر تناور درخت ہیں۔ عالم گیر نے بیساختہ کہا" ایں کودک بے تخت و تاج بادشاہی خواہد کرد"۔

نواب قمرالدین خاں جب سن شعور کو پہنچے تو دربار عالم گیر سے انھیں خطاب" چین قلیچ خاں اور منصب چار ہزاری عطا کیے گئے۔ بہادر شاہ کے عہد میں" خان دراں خاں بہادر " کا خطاب اور اودھ کی صوبہ داری عطا کی گئی[1] لیکن آپ نے خدمت صوبہ داری سے کنارہ کشی اختیار کی اور شاہ جہاں آباد (دہلی) میں قیام کو مناسب سمجھا[2] فرخ سیر کے پر آشوب دور میں آپ کو" فتح جنگ" نظام الملک کے خطابات اور ہفت ہزار منصب اور ہفت ہزار سوار دے کر صوبہ داری دکن مرحمت کی گئی[3] نواب آصف جاہ تین سال تک اس خدمت پر فائز رہے۔ لیکن جب برادران سادات کا زور بڑھ گیا اور سید حسین علی خاں نے صوبہ داری کی سند حاصل کر لی تو آپ مراد آباد کی فوجداری پر فائز کیے گئے[4] اب مغلیہ رعب و جلال آخری سسکیاں لے رہا تھا۔ کمزور بادشاہ طاقتور سرداروں کے اشارہ پر ناچ رہا تھا۔ اسی افراتفری میں روشن اختر، محمد شاہ کے لقب سے سنہ ۱۱۳۱ھ میں اپنے رنگیلے عہد کا آغاز کیا[5] آصف جاہ کو مالوہ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا[6] لیکن دو سال بعد ہی آصف جاہ نے یہ مناسب سمجھا کہ دکن کو تسخیر کیا جائے اور وہ مالوہ سے برہان پور، بالاپور اور اورنگ آباد پہنچے۔

---

[1] صفحہ ۸۰ حیات آصف مولانا جنیدی
[2] " " " " "
[3] " ۹۹ " " ۲۸ منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم
[4] " ۱۱۵ " " حدیقۃ العالم مقالہ دوم صنہ
[5] " ۱۴۱ حیات آصف
[6] " حیات آصف ۱۴۵

برہان پور فتح کرنے کے بعد آصف جاہ وہیں ٹھہر گئے۔ اس زمانہ میں سید دلاور علی خاں سے مقابلہ ناگزیر ہوگیا۔ آصف جاہ کے پاس افواج کی تنخواہ کے لیے رقم نہیں تھی۔ آپ نے برہان پور کے مغل صوبہ دار انور خاں کو طلب کیا اور اس سے خواہش کی کہ برہان پور کے کسی ساہوکار سے انھیں ایک لاکھ روپے بطور قرض فراہم کر دیں۔ انور خاں نے عرض کیا کہ وہ برہان پور کے ساہوکاروں پر پٹی ڈال کر صبح تک پچاس لاکھ روپے فراہم کرے گا۔ لیکن آصف جاہ کو یہ تجویز پسند نہ آئی۔ آخر برہان پور کے ساہوکار بوچڑ مل حاضر کیے گئے۔ جس نے ایک لاکھ روپے پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ روپے آپ پر سے تصدق ہیں۔ "آصف جاہ نے جواب دیا" مجھے اپنی فوج کی تنخواہ تقسیم کرنا ہے خیرات نہیں، اس لیے میں بطور قرض اس رقم کو حاصل کرتا ہوں۔ فتح حاصل ہونے کے بعد دیگر مراعات کے ساتھ یہ رقم واپس کر دی جائے گی، ورنہ وہ انھیں معاف کردیں اور روز حشر مواخذہ نہ لے۔ پھر خود اپنے ہاتھ سے تمسک لکھ کر اور اس پر مہر کر کے بوچڑ مل ساہوکار کے سپرد کر دیا۔

شاہ عنایت اللہ شاہ کی سات روٹیاں

برہان پور میں آصف جاہ، شاہ عنایت اللہ شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے واپسی کے وقت شاہ صاحب نے ایک زرد کپڑے میں سات روٹیاں بندھوا کر آپ کو بطور زادِ راہ پیش کیں۔ دکن میں اس واقعہ کی بنا پر یہ کہا جانے لگا کہ اس خاندان میں بادشاہت صرف سات پشتوں تک قائم رہے گی اور یہ پیشن گوئی ۱۹۴۸ء میں صد فی صد صحیح ثابت ہوئی۔

آصفی پرچم

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شاہ عنایت اللہ شاہ کے عطا کردہ کپڑے کی مناسبت سے آصفی پرچم کا رنگ زرد تھا اور درمیان میں روٹی کو بطور نشان نمایاں کیا گیا تھا۔ غالباً یہ شاہ عنایت اللہ رحمۃ اللہ کے عطیہ کا اظہار تھا۔ لیکن پروفیسر عبدالمجید صدیقی کے بیان کے بموجب آصفی پرچم پر کوئی روٹی کا نشان نہیں تھا۔ بلکہ پرچم کے درمیان میں "قمر" کو نمایاں رکھا گیا تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ بانی سلطنت

آصف جاہ اول قمرالدین خاں کے نام نامی کو واضح کیا جائے بط[1]

آصف جاہ اول کے ہم رکاب اصحاب

آصف جاہ اول جب دہلی سے دکن کے لیے روانہ ہوئے تو آپ کے ہم رکاب فوج، امیر، امرا، علما، ماہران فن، ساہوکار اور نجار کاری گر شامل تھے۔ یہاں تک کہ باورچی، حلوائی اور شاہی رکاب دار بھی ساتھ تھے۔ نظام الملک اول گجرات میں ایک عرصہ دراز تک صوبہ دار کی حیثیت سے مقیم تھے۔ اس لیے وہ گجرات کے بواہیر، میمن اور گوسایوں کو دکن لے آئے۔ تاکہ یہ معزز اور راست باز تاجر یہاں تجارت کر سکیں۔ حیدرآباد کے دارالسلطنت بننے کے بعد بواہیر کو حسینی علم کے قریب ایک قطب شاہی سرا قیام کے لیے دی گئی، جو اب بھی "سرائے بواہیر" کے نام سے موسوم ہے۔

بواہیر اور میمن

گوسایوں کے قیام کے لیے علاقہ بیگم بازار میں اراضی دی گئیں حیدرآباد میں گوسایوں کا ایک بڑا طبقہ آصف جاہ اول کے ہمراہ حیدرآباد آیا تھا۔ ان میں چند خاندان بڑے دولت مند گزرے ہیں۔

بڑے گوسایوں میں حال حال تک راجہ لعل گیرجی راجہ پرتاپ گیرجی اور راجہ دھن راج گیرجی کے نام لیے جاتے ہیں۔ راجہ پرتاپ گیرجی کی شاندار کوٹھی حیدرآباد کی معاشرتی تقاریب کا مرکز رہا کرتی تھی۔ راجہ صاحب کے قرض کی بنا پر اب یہ کوٹھی حکومت آندھرا پردیش کی قبضہ میں ہے جہاں ناک کان کا ہاسپٹل قائم کیا گیا ہے۔ راجہ دھن راج گیر کی کوٹھی راجہ صاحب کے ستھرے ذوق کی بنا پر آج بھی آباد ہے اور اسے قدیم حیدرآباد کے تمدن کا آخری گواہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کوٹھی آج کل فلموں کی شوٹینگ کے لیے استعمال کی جارہی ہے۔

ع[1] ملاحظہ ہو مملکت آصفیہ ادارہ محبان دکن کراچی

آصف جاہ اوّل کے مصاحبین

آصف جاہ اول کے مصاحبین خاص میں صمصام الدولہ، شاہ نواز خاں، خافی خاں میر محمد ہاشم، موسوی خاں اور منشی رام سنگھ جیسے عالم اصحاب شریک تھے۔ آپ کے مصاحبین میں تہور خاں بہادر خویشگی کو بڑا قرب حاصل تھا۔ آصف جاہ اول کو اطلاع ہوئی کہ تہور خاں حقّہ کے بڑے شائق ہیں۔ آپ نے ایک نجی مجلس میں فرمایا "مسلمان بلا شبہ بہشت میں جائیں گے۔ مگر ان میں سے جن لوگوں کو حقّہ کا شوق ہے وہ آگ کے محتاج ہوں گے اور بہشت میں آگ ہوتی نہیں اس لیے انھیں دوزخ جانا پڑے گا۔" تہور خان نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: "ان لوگوں کو چنداں اس کی فکر کرنی نہیں پڑے گی۔ کیوں کہ حضور کے قہوے کے لیے جو انگیٹھی لائی جائے گی اس سے ان لوگوں کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔" [1]

آپ نے ریاست کا اعلا ترین اعزاز ہفت ہزاری منصب عضد الدولہ (جو رشتہ میں آپ کے پھوپھا تھے)، نصیر الدولہ جو آپ کے چچا تھے، مرہٹہ سردار باجی راؤ، چندر سین جادو سلطان جی تمبالکر، راؤ انبھا تمبالکر اور رمان سنگھ ہاکیہ کو عنایت فرمائے تھے۔ مال والوں کا خاندان زلزلہ کی تباہ کاریوں کے نذر ہو چکا تھا اور صرف ایک کمسن راجہ ساگر مل زندہ بچ گئے تھے۔ آصف جاہ نے راجہ ساگر مل کو اپنے سایہ میں لیا اور مثل اپنی اولاد کے ان کی پرورش کی۔ بعد میں اس خاندان کو زرخیز جاگیریں عطا کی گئیں جو ایک عرصہ دراز تک ماتھر کایستھ برادری کو زمانہ کے سرد و گرم سے محفوظ رکھا۔

آصف جاہ اوّل کی حکمت عملی

آصف جاہ اول دہلوی کلچر میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کا معزز خاندان، ان کے دادا خواجہ عابد کے زمانہ سے مغل بادشاہوں کا متوسل تھا، اور جس کلچر کو وہ اپنے ساتھ دکن لائے

---

[1] مآثر نظامی

۔حیات آصف صفحہ ۴۴

تھے وہ دہلی کا کلچر تھا۔ دہلی کا یہ کلچر نہ خالص اسلامی کلچر تھا اور نہ مغل بلکہ اس پر چار پشتوں سے راجپوت اثرات برابر رنگ چڑھا رہے تھے۔ آصف جاہ اول نے جب دکن کی باگ ڈور سنبھالی تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ دکن میں مرہٹوں کو اپنے ساتھ لینا دہلی کے عین روایات کے مطابق ہے۔ انھوں نے بہت جلد یہ محسوس کیا کہ ہندو مسلمانوں میل جول ان کے دکنی کلچر کی روایات کا ایک جزو بنا ہوا ہے۔ انھوں نے دکن پہنچتے ہی کولہاپور کے حکمراں سنبھاجی سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور مرہٹہ سرداروں پر اتنا اثر ڈالا کہ جب شیوا جی راؤ ان کے خلاف صف آرا ہوا تو انھوں نے اپنی افواج کے ایک دستہ کی کمان راؤ رنبھا نمبالکر کے سپرد کر دی۔ اس طرح جب سنہ ۱۷۲۴ء میں مبارز خاں سے معرکہ ہوا تو آصف جاہی افواج کے کمانداروں میں سنبھاجی چندر گپت یادو اور راؤ رنبھا بھی تھے۔

لالہ منسارام اور لچھمی نارائن شفیق

نظام الملک آصف جاہ اوّل نے ہندو امراء کو کاروبار مملکت میں اپنا مشیر بنائے رکھا۔ لالہ منسارام پیشکار اور معتمد اعلا مقرر کیے گئے۔ آصف اول کے دور میں فرقہ داری جھگڑوں کا نام ونشان نہ تھا۔ ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی، نئی حکومت کو مستحکم بنانے میں برابر کے شریک تھے۔ لالہ منسارام کی تحریر کردہ تاریخ اس دور کی ایک اہم دستاویز ہے۔ لالہ منسارام کے فرزند لچھمی نارائن شفیق اردو اور فارسی کے بڑے پرگو شاعر تھے۔ ان کا تذکرہ موسومہ "چمنستان شعرا" آج بھی ایک اہم تاریخی ماخذ ہے۔

شاعری

آصف جاہ اول ایک پرگو شاعر تھے۔ اولاً شاکر۔ مگر بعد میں آصف تخلص اختیار کیا۔ [ع۱] مرزا عبدالقادر بیدل سے تلمذ حاصل تھا۔ فارسی میں ان کے دو دیوان موجود ہیں جو سنہ ۱۳۰۱ھ میں بمقام حیدرآباد طبع کیے گئے۔ آصف جاہ نے کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں۔

ع۱ دبستان آصفیہ جلد اول صفحہ ۴۶، حیات آصف صفحہ ۲۹۶

شمیم کاکل مشکیں سے جب میں اُونگ گیا
تو آئے کہنے لگے اس کو سانپ سونگ گیا[1]

....

میں تنہا نہ تن بلکہ جاں بیچتا ہوں
یہ ہستی کی ساری دکاں بیچتا ہوں[2]

....

اس گلبدن کے حق میں رونا ہے عین حکمت
کرتے ہیں ضعف دل پر آنکھیں گلاب پاشی[3]

....

دور سے سمجھا تھا میں سنجاف کی تحریر ہے
پاس جا دیکھا تو خوں عاشق کا دامن گیر ہے[4]

....

آصف جاہ اوّل کا فن تعمیر

آصف جاہ اول کو مغل امرا کی طرح فن تعمیر سے خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے تعمیر کے ایک خاص ڈیزائن سے دکن والوں کو روشناس کرایا۔ آصف جاہ اوّل کے دور میں جو عمارتیں قصر اور ایوان تعمیر ہوئے ان کی خصوصیت یہ تھی کہ عمارتوں اور پھاٹکوں کی بلندی کم رہا کرتی تھی۔ دالان کے ساتھ پیش دالان اور خلوت تقریباً ہر عمارت میں موجود تھے۔ مکہ مسجد کے متصل آپ نے جلوخانہ معہ بنگلہ و خواب گاہ، دیوان خانہ، خلوت

ع۱ حیات آصف ص۴۰۶

ع۲ " " ص۴۰۶

ع۳ بیاض قلمی منسلکہ تذکرہ "تحفۃ الشعرا" کتب خانہ آصفیہ (سینٹرل لائبریری) ص۱۳۲

ع۴ حیات آصف ص۴۰۶

زنانی وغیرہ عمارتیں تیار کرائیں [1] اورنگ آباد میں توکنڈہ کا محل آپ کے ستھرے ذوق تعمیر کا شاہد ہے۔

مغلوں کے حملہ کے بعد حیدرآباد ایک اجڑا ہوا شہر تھا۔ مبارز خاں نے دہلی دروازے سے رود موسی کے محاذی دبیرپورہ تک پتھر کی بلا کنگورہ فصیل تعمیر کی۔ آصفجاہ اوّل نے اپنی خود مختاری کے بعد اپنے فرزند نواب میر احمد خاں (صلابت جنگ) کو حکم دیا کہ شہر کی فصیل کو مکمل کریں۔ نواب صلابت جنگ نے پچھلی تعمیر شدہ فصیل کو ڈھا کر اس کی جگہ کنگورہ دار سنگ بستہ فصیل تعمیر کی۔ اس فصیل میں بارہ دروازے رکھے گئے تھے۔ جن میں اب صرف دو دروازے، دروازہ پرانا پل اور دروازہ دبیرپورہ غالباً محبوب الٰہی کے پرچم کی رعایت سے بچ گئے ہیں۔ تاریخی دہلی دروازہ جہاں سے مغل حملہ آور پہلی بار شہر میں داخل ہوئے تھے اپنی تاریخی اہمیت اور محکمہ آثار قدیمہ کے شدید احتجاج کے باوجود مجلس بلدہ کے حکم پر منہدم کر دیا گیا۔ یہ دروازے رات میں آٹھ بجے کی توپ کے سر ہونے کے بعد بند کر دیے جاتے اور دوسرے دن صبح چھ بجے کھول دیے جاتے تھے۔ رات میں اگر کوتوال شہر بھی حکم دیتے تو یہ دروازے نہیں کھولے جاتے تھے۔ البتہ میت اور ارتھی کو لے جانے کے لیے بارہ کھڑکیاں بنوائی گئی تھیں یہ کھڑکیاں دراصل ایمرجنسی اغراض کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ عام حیدرآبادی کھڑکیوں سے شہر میں داخل ہونے کو اپنی توہین خیال کرتے تھے۔

آصف جاہ اوّل کی وصیت اور انتقال

آصف جاہ اوّل نے ۴۔ جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ سنہ ۱۷۴۸ء بمقام موہن نالہ برہان پور اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا [2] آپ ۲۹ سال برسر اقتدار رہے۔ نعش برہان پور سے خلدآباد لائی گئی اور شاہ برہان الدین غریب کے پائیں دفن کیے گئے۔ انتقال سے دو گھنٹے پیشتر انھوں نے ولی عہد ناصر جنگ کو طلب کیا اور صدرالصدور احمد ضیاءالدین

---

[1] گلزار آصفیہ ص ۹۱ د مآثر الامرا جلد سوم ص ۸۸۲

[2] حیات آصف ص ۲۸۱ حدیقۃ العالم مقالہ دوم ص ۳۶۲

حسین خاں اور داروغہ منشی درگاہ قلی خاں خدا بخش خاں خواجہ سرا اور پیش کار لالہ منسارام کی موجودگی میں انھیں وصیت کی۔ لالہ منسارام کے بیان کے بموجب[1] صدر الصدور ضیا الدین حسین خاں اس وصیت کو ساتھ ساتھ پنسل سے نوٹ بھی کر رہے تھے۔ یہ وصیت نامہ سترہ فقرات پر مشتمل ہے اور چند قابل ذکر فقرات حسب ذیل ہیں۔

والی دکن کو لازم ہے کہ مرہٹوں سے جو زمیندار ہیں موافقت اور صلح و آشتی سے پیش آئیں۔ خدا کی مخلوق کے قتل و خون اور تباہی سے بچے۔ عمر کا بیشتر حصہ دورے میں گزارنا چاہیے۔ خیموں میں رہنے کی عادت ڈالنی چاہیے اور بر سر موقعہ انتظامی امور کا بندوبست کرنا چاہیے۔ سپاہیوں کو گھر جانے کے لیے رخصت دینی چاہیے تاکہ قطع نسل نہ ہونے پائے۔ خدا کا ہمیشہ شکر کیا جائے کہ اس نے والی ریاست کو حکومت سے نوازا۔ اپنے اوقات کار کو ایک نظام العمل کے تحت تقسیم کردو تاکہ کوئی وقت بے کار نہ جائے۔ کسی کی حق تلفی نہ کی جائے کیوں کہ حکمراں بہ حیثیت امین ہے۔ قدیم حکمرانوں کی عزت افزائی کی جائے اور ان کے افراد خاندان کو بلا ترجیح ملازمت میں لیا جائے۔ رعیت کے معاملات سے برابر واقفیت رکھیں۔ مغل بادشاہوں کا احترام کرنا چاہیے۔ سرکاری خدمات پر لوگوں کو نوبت بہ نوبت خواہ فرقہ اسلام سے ہوں یا غیر مسلم۔ سال بہ سال مامور کرنا مناسب ہے تاکہ دوسرے لوگ محروم نہ رہیں۔ اعلا عہدوں پر کم رتبہ لوگوں کو ادنا قسم کے کاموں پر اعلا لوگوں کو مقرر نہ کرو۔ کہ ان دونوں صورتوں میں مملکت کے کاموں میں خلل واقع ہوگا۔

جہاں تک ممکن ہو جھگڑوں اور فساد کو رفع دفع کرتے رہو۔ لیکن اگر اس مصلحت کو کمزوری سمجھا جائے تو پھر مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ حکومت کے خزانے کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور اس پر نگرانی رکھنی چاہیے۔ خزانہ کو اپنی نگرانی میں اور سفر کے دوران ساتھ رکھنا چاہیے سپاہیوں کی تنخواہ تین مہینوں سے زیادہ باقی نہ رکھی جائے، لیکن سپاہیوں کی خوشنودی کے لیے ضروری ہے کہ تنخواہ وقت پر ادا کی جائے۔ چھوٹے بھائیوں سے ایسا ہی سلوک روا رکھو جو اپنے بیٹوں کے ساتھ تم

---

[1] (مآثر نظامی مصنف) ۱۲۰۰ھ ؛ حیات آصف صفحہ ۳۸ ؛ لالہ منسارام ۔۔

کرتے ہو۔ غیبت کرنے والوں کی باتوں پر کان مت دھرو۔ اور ہما و شما کو اپنی قربت کا موقع نہ دو۔[1]

اس وصیت کے بعض نکات آج بھی قابل توجہ ہیں۔

قدیم سمستانوں کی بحالی

نواب آصف جاہ اول نے سمستانوں کے قدیم طریقہ کو قائم رکھا۔ والی سمستان کا طبقہ بڑا معزز خیال کیا جاتا تھا۔ والی سمستان سالانہ نذرانہ یا پیش کش بہ عنوان "مکاسا" یا "چوتھ" سرکاری خزانہ میں جمع کراتے تھے۔ والی سمستاں دراصل وہ راجہ تھے جو عہد قدیم سے ان علاقوں پر بطور سردار حکمراں تھے۔ بعض والی سمستاں ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کے اجداد نے بہمنی اور قطب شاہی حکمرانوں کو پیشکش ادا کیا تھا۔ بعض والی سمستاں مرہٹوں کے باجگذار تھے اور مرہٹہ سلطنت کے زوال کے بعد علاقے آصفی سلطنت میں شامل ہوگئے اور نظام دکن کو پیشکش ادا کرنے لگے۔ یہ سمستان تعداد میں بارہ تھے یعنی گدوال گرکنٹہ۔ ونپرتی۔ اناگنڈی، دوم کنڈہ۔ گوپال پیٹھ۔ سگر۔ جٹ پول۔ امرچینتہ۔ بانسواڑہ۔ چینچولی اور سرناپلی۔ گدوال اور گرکنڈ پرانے سمستان تصور کیے جاتے تھے۔ والی سمستان کو دیوانی اور فوجداری کے کامل اختیارات حاصل تھے اور وہ اپنی رعایا کے محافظ اور امین سمجھے جاتے تھے۔

نواب آصف جاہ اول کے چھ صاحب زادے اور چھ صاحب زادیاں تھیں معاثر نظامی اور رسالہ دربار آصف آصف جاہ اول کے دور کی مستند تواریخ ہیں:۔

---

[1] رسالہ معارف نمبر ۶ جلد ۳ بابند ۳۸ صہ ۴۵۴
حیات آصف صہ ۲۸۸

نواب قمرالدین خاں آصف جاہ اول

صاحبزادے [1]

- امیرالامرا غازی الدین خاں فیروز جنگ
- ناصر جنگ (میر احمد علی خاں)
- صلابت جنگ امیرالملک آصف الدولہ میر سید محمد خاں
- نظام علی خاں آصف جاہ دوم
- شجاع الملک بسالت جنگ (میر محمد شریف خاں)
- مقتدالدولہ ناصرالملک ہمایوں جاہ میر مغل علی خاں

صاحبزادیاں

- خیرالنساء محل ترسل خاں
- بادشاہ بیگم محل خواجہ بابا خاں امیرزادہ بخارا
- بانو بیگم ناکتخدا
- خجستہ بیگم ناکتخدا
- مکثر بادو بیگم عرف کالی بیگم محل میر ابراہیم خاں قیام الملک
- ماہ بانو بیگم محل اخلاص خاں امیر بادشاہی

---

[1] دبستان آصفیہ حصہ اول صہ۴۷ و صہ۴۸ ، حیات آصف صہ۳۸۴

" " " حصہ چہارم صہ۴

ناصر جنگ شہید

آصف جاہ اوّل کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے غازی الدین خاں ثانی، دہلی میں وزارت پر فائز تھے۔ اس لیے آصف جاہ اوّل کی وصیت کے مطابق ناصر جنگ نے تمام حکومت سنبھالی۔ ان کے سطورت نادری کا حال یہ تھا کہ دربار میں امراء بصورت تصویر کھڑے رہا کرتے تھے۔ وہ ایک اچھے سپاہی اور دکن کے ماحول سے خوب واقف تھے۔ مسند نشین ہوتے ہی ناصر جنگ نے مالی و ملکی نظم و نسق میں کئی تبدیلیاں کیں۔ باہر کے دشمن تو تھے ہی گھر کے اندر بھی ایسے دشمن تھے جن کی بیخ کنی ضروری تھی۔ آصف جاہ اوّل کے نواسے مظفر جنگ سلطنت کے دعوے دار تھے، انھوں نے چند اصاحب اور ڈوپلے سے اتحاد قائم کرلیا تھا۔ ناصر جنگ نے آصف جاہ اوّل کی وصیت کے خلاف کہ راجہ پورن چند کو مزید چند سال برسرِ خدمت رکھا جائے، انھوں نے راجہ کو معزول کر کے صمصام الدولہ شاہنواز خان صوبہ دار

صمصام الدولہ شاہنواز خاں : برار کو وزیر اور مختار کل بنایا۔ اور مورو پنڈت کو پیشکاری کی خدمت عطا کی ۱؎

مورو پنڈت پیشکار

اس طرح مملکت کے دو کلیدی عہدے ملکی اور غیر ملکی امراء میں تقسیم کیے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کرناٹک میں فرانسیس اور برطانوی طاقتیں زور آزما تھیں۔ براعظم یورپ میں جب ان قوموں کا ٹکراؤ ہوتا تو پھر یہ گھن گرج دکن کی ریاستوں اور ارکاٹ میں سنائی دیتی تھیں۔ کرناٹک کی صوبہ داری پر نواب ناصر جنگ کی جانب سے شہامت جنگ انورالدین خاں مامور تھے۔

شہامت جنگ صوبہ دار کرناٹک

سنہ ۱۱۶۱ھ میں ہدایت محی الدین خاں، مظفر جنگ، حسین دوست خاں اور

۱؎ دبستان آصفیہ جلد اول صفحہ

فرانسیسوں کی مدد سے کرناٹک پر حملہ آور ہوئے۔ مظفر جنگ کی افواج کے سالار مشہور فرانسیسی جنرل بوسی تھے۔ اس معرکہ میں ناصر جنگ کے صوبہ دار شہامت جنگ مارے گئے؎۱ شہامت جنگ کے فرزند محمد علی خاں والا جاہ نے انگریزوں سے مدد طلب کی اور ناصر جنگ بھی ان کی تائید کے لیے آمادہ ہوگئے۔ اس طرح ایک لشکر جرار، والا جاہ، ناصر جنگ اور انگریزوں کا ترتیب دیا گیا جس کے مقابلہ میں چندا صاحب مظفر جنگ اور فرانسیسی افواج صف آرا ہوئیں گو ہر دو افواج میں ملکی افسر اور سپہ سالار موجود تھے۔ لیکن یہ افواج دراصل دو غیر ملکی قوتوں کے زیر قیادت آگے بڑھ رہی تھیں۔ اس معرکہ میں ناصر جنگ فتح یاب ہوئے۔ مظفر جنگ قید ہوئے؎۲ اور ارکاٹ کی حکومت والا جاہ کے حق میں آئی۔ اس معرکہ کے بعد بھی ناصر جنگ اور فرانسیسی افواج کے درمیان کئی معرکے ہوئے۔ پھولچری (پانڈوچیری) کے میدان میں آٹھ ماہ تک طرفین کی افواج صف آرا رہی۔ ۱۷۔ محرم سنہ ۱۱۶۴ھ کو ناصر جنگ ہمت خاں بہادر کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ فرانسیسی افواج کے لیے ناصر جنگ کی موت ایک غیر متوقع کامیابی تھی۔ چنانچہ فرانسیسی گورنر ڈوپلے نے اس مقام پر جہاں نواب ناصر جنگ مارے گئے تھے ایک مینار تعمیر کرایا اور اس مقام کا نام "فتح آباد" رکھا۔

ناصر جنگ کی فارسی شاعری

ناصر جنگ فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر تھے ناصر تخلص تھا۔ ان کے تین فارسی دیوان شائع ہوچکے ہیں۔ آصف جاہ اوّل ناصر جنگ کی قدر افزائی کے لیے اکثر وبیشتر اپنے موزوں کردہ اشعار اور طرحی مصرعے آپ کے پاس روانہ کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے ایک شعر

مرنجان خاطر جاناں مزاجی نازکی دارم
تو گر از حسن مغروری من از عشق تو مغرورم

لکھ کر آصف جاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ آصف جاہ نے کہلا بھیجا کہ "بگو قباحت این بیت

؎۱ دبستان آصفیہ جلد اول ص ۵۰

؎۲ " " " ص ۵۰

روبرو مذکور خواہم کرد"۔ ناصر جنگ حاضر خدمت ہوئے اس وقت لالہ منسارام پیشکار بھی حاضر تھے۔ آصف جاہ اول نے ناصر جنگ سے فرمایا تمھارے مرسلہ شعر میں عاشق کی مغروری کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔"

ناصر جنگ جو مسند کے ایک کونے پر بیٹھے ہوئے تھے اٹھ کر آداب بجالائے اور عرض کیا کہ "آں قبلہ خوب جانتے ہیں کہ اس شعر میں جس ہستی پر مغرور ہونے کا میں نے دعوا کیا ہے وہ صرف آں قبلہ کی ذات والا صفات ہے" اور وہ چلے گئے۔ آصف جاہ اول بڑی دیر تک مسکراتے رہے اور ناصر جنگ کے منصب میں اضافہ کر دیا۔[1]

ایک مرتبہ آصف جاہ اوّل نے راجہ پورن چند کی زبانی بعض نصیحت آمیز کلمات ناصر جنگ کو کہلا بھیجے اور ایک مصرعہ بھی لکھ کر حوالہ کیا کہ ہم چند روز کے مہمان ہیں اور ہمارے بعد یہ ریاست تمھاری ہے۔ مصرعہ یہ تھا:۔

"اند کے بگزار تا سیر تحمل میکنم"

ناصر جنگ نے جواب میں یہ مصرعہ رائے پورن چند کے حوالے کیا:۔

"گر تو استغنا کنی من ہم تغافل میکنم"[2]

جب ملہر کی مہم ختم ہوئی اور آصف جاہ اوّل قندھار دکن میں مقیم ہوئے تو ناصر جنگ کو نظر بندی کے بعد پہلی مرتبہ آصف جاہ اول کے روبرو پیش کیا گیا۔ ان کے دونوں ہاتھ رومال سے بندھے ہوئے تھے۔ آصف جاہ اول اس حالت سے بے حد متاثر ہوئے اور حکم دیا کہ ہاتھ کھول دیے جائیں۔ ناصر جنگ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور زبان پر یہ بیت تھی۔

کاش کے مادر نزادے بدیدے
جائے شیرم زہر دادے بدیدے[3]

ناصر جنگ کو اس وقت خلعت عطا کی گئی لیکن وہ پھر قندھار کے قلعہ میں نظر بند

---

[1] رسالہ دربار آصف از لالہ منسارام صفحہ ۴۲ حیات آصف صفحہ ۲۰۷

[2] رسالہ دربار آصفیہ۔ حیات آصف صفحہ ۲۰۸

[3] تاریخ راحت افزا، حیات آصف صفحہ ۲۹۶

کر دیے گئے۔

ناصر جنگ کی اردو شاعری

ناصر جنگ اردو میں بھی شعر کہا کرتے تھے ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں:۔

نین تیرے شکار کرتے ہیں — دل ہمارا فگار کرتے ہیں
خوب رو جب سنگار کرتے ہیں — آرسی پر بہار کرتے ہیں
چشم بہ دور خوش نین سارے — اپنے ناصرؔ کو پیار کرتے ہیں

ناصر جنگ کے ہم عصر شعرا

ناصر جنگ کے ہم عصر شعرا میں مرزا داؤد اورنگ آبادی۔ شاہ سراج، درگاہ نورالدین علی رنگین۔ ملا باقر شہید۔ عاجز۔ عارف۔ عزلت۔ ایما اور شفیق قابل ذکر ہیں۔

تعلیم و تربیت

ناصر جنگ کی تعلیم پر آصف جاہ اول نے خاص توجہ کی۔ لالہ منسارام کو ہدایت کی گئی تھی روزانہ اسباق کے متعلق ہفتے میں یا دو ہفتوں میں ایک بار کتابوں کا انتخاب کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا کریں۔ اولاً آصف جاہ ان کتابوں کو ملاحظہ فرماتے اور اس کے بعد درس کی اجازت عطا فرماتے۔ آصف جاہ ناصر جنگ کو اپنا جانشیں تصوّر کرتے تھے اس لیے ان کی تعلیم و تربیت میں وہ خود دلچسپی لیا کرتے تھے اس توجہ خاص کی بنا پر ناصر جنگ مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کر سکے۔ لچھمی نارائن شفیق نے اپنی تصنیف "چمنستان شعرا" میں لکھا ہے کہ ناصر جنگ سنسکرت زبان پر بھی کافی عبور رکھتے تھے۔

ناصر جنگ کی شادی اور اولاد

ناصر جنگ جب اکیس برس کے سن کو پہنچے تو ان کی شادی سنہ ۱۱۴۸ھ میں وجیہہ النسا بیگم دختر روشن الدولہ طرہ باز خاں ظفر جنگ سے رچائی گئی۔

روشن الدولہ دربار دہلی کے ایک نامی امیر تھے۔ وجیہ النسا بیگم کے بطن سے ناصر جنگ کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ البتہ دیگر بیگمات سے دو لڑکیاں ہوئی تھیں۔ ایک فرحت بیگم جو ظہیر الدولہ عبدالہادی خاں قسورہ جنگ سے بیاہی گئیں۔ دوسری لڑکی سید النسا بیگم عرف حاجی بیگم، قطب الامرا امیر محمود خاں منصور جنگ کے ساتھ بیاہی گئی تھیں۔

ناصر جنگ سے آصف جاہ اول کی ناراضی کے اسباب

محمد شاہ بادشاہ دہلی کی طلبی پر جب آصف جاہ اول ۱۱۵۰ھ میں دہلی تشریف لے گئے تو ناصر جنگ نائب سلطنت مقرر کیے گئے۔ شروع شروع میں اس چھبیس سالہ شہزادے نے سلطنت کا اچھا بندوبست کیا۔ لیکن جلد ہی اپنی نرم دلی کے باعث فتنہ پرداز امراء کی چالوں میں آ گئے۔ مالی امور کی ذمہ داری انور اللہ خاں کے تفویض تھی۔ اس وقت ناصر جنگ کے دیوان عبدالرزاق صمصام الدولہ شاہ نواز خاں تھے اور اتالیق کے فرائض خواجہ عبداللہ خاں کے سپرد کیے گئے تھے۔ انور اللہ خاں نے جب دیکھا کہ شہزادہ آصف جاہ اول کے مخالف ہو گئے ہیں تو ان سے علاحدگی اختیار کی اور گولکنڈہ چلے گئے۔ تین سالہ دور نیابت میں ناصر جنگ کئی ایک ایسے کام کر گئے جو آصف جاہ اول کو سخت ناپسند تھے۔ نواب قسورہ کا خطاب بحال کیا۔ حالانکہ یہ خطاب آصف جاہ اول نے چھین لیا تھا۔ نواب قسورہ جنگ کو خزانہ شاہی سے دس لاکھ روپے فوج کی تنظیم جدید کے لیے دیے گئے[1]۔ چند ناپسند امراء کو دربار میں طلب کر کے اپنا مقرب خاص بنالیا۔ کئی امرا کو بغیر اجازت آصف جاہ اول نے اپنی جانب سے جدید جاگیریں عطا کیں[2]۔ اپنے ماموں زاد بھائی طالب محی الدین خاں کے ساتھ اچھا سلوک روا نہ رکھا اور حساب فہمی کے لیے انھیں ماخوذ رکھا[3]۔ طالب محی الدین نے اس ذلت سے نجات پانے کے لیے زہر کھا لیا[4]۔ ان

ع[1] حیات آصف ص۲۴۷

ع[2] حیات آصف ص۲۴۷

ع[3] حیات آصف ص۲۴۷

ع[4] حیات آصف ص۲۴۸

کی جگہ ناصر جنگ نے اپنے ماموں ہمت خاں کو معمور کر دیا[1] جب آصف جاہ اول نادر شاہی حملہ کی وجہ سے دہلی میں امن وانتظام کی بحالی کے لیے سرگرداں تھے تو ناصر جنگ، اورنگ آباد سے حیدرآباد چلے آئے اور اپنی صوبہ داری کا اعلان کر دیا۔ حیدرآباد میں ناصر جنگ کی ان کارروائیوں کا حال نصیر الدولہ صوبہ دار برہان پور معرفت آصف جاہ اول کے پاس دہلی روانہ کیا کرتے تھے[2] ناصر جنگ کی اس شورش سے مرہٹہ سرداروں نے خوب فائدہ اٹھایا اور دکن کا امن وامان درہم برہم ہو گیا[3]

ناصر جنگ کی بغاوت

ناصر جنگ کی افواج نے خلد آباد کے قریب آصف جاہ اول کا راستہ روکا ناصر جنگ کی افواج نے زبردست حملہ کیا اور خود ناصر جنگ مہاوت کی موت کے بعد اپنے ہاتھی کو آگے بڑھاتے ہوئے آصف جاہ اول کے مقابل آ گئے۔ لشکر خاں امیر نے بڑی ہوشیاری سے اپنے ہاتھی کو بڑھایا اور ناصر جنگ کے ہاتھی سے قریب آکر نہایت چستی اور جرأت کے ساتھ صاحب زادے کو اپنے ہاتھی پر لے لیا[4] لشکر خاں کے اس کارنامے سے صاحب زادے کی جان بچ گئی اور آصف جاہ اول کی افواج جو قریباً پسپا ہو رہی تھی اچانک فتح یاب ہو گئی۔ لشکر خاں نے دو نذریں آصف جاہ اول کو پیش کیں ایک فتح کی اور دوسری سلامتی صاحب زادے کی۔

ناصر جنگ کی شکست اور گرفتاری کے بعد پہلی شب انھیں ایک خیمہ میں سخت پہرہ میں رکھا گیا۔ ناصر جنگ شدید زخمی ہو گئے تھے اس لیے آصف جاہ اول نے اپنے کپڑے تبدیلی لباس کے لیے ناصر جنگ کے خیمہ میں روانہ کیے[5]

ع[1] حدیقۃ العالم مقالہ دوم ص ۱۴۹ حیات آصف ص ۲۴۸

ع[2] حیات آصف ص ۲۴۹

ع[3] " " "

ع[4] " " ص ۳۶۱

ع[5] " " ص ۳۶۲

آصف جاہ اول اس معرکے سے اس لیے مطمئن تھے کہ اولاً شہزادہ سلامتی کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے ناصر جنگ کی سپاہانہ قابلیت اور شجاعت وہ خود میدان جنگ میں دیکھ چکے تھے۔ آصف جاہ کو بہت تھوڑی فوج اور انتہائی بے سروسامانی کے باوجود یہ فتح نصیب ہوئی۔ دوسرے دن ناصر جنگ کو مقبول عالم کی حویلی میں نظر بند رکھنے کا حکم ہوا۔ واجد علی خاں ان کے نگراں مقرر کیے گئے۔ ناصر جنگ کے ساتھی بھاگ بھاگ کر اپنی جان بچاتے رہے۔ لیکن کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا گیا۔ البتہ ناصر جنگ کا خطاب واپس لے لیا گیا اور انھیں سلام اور مجرا سے محروم کر دیا گیا۔ ناصر جنگ کا قلمدان خاصہ جب آصف جاہ اول کے آگے پیش کیا گیا تو آپ نے اسے میر منشی موسوی خاں کے سپرد کیا۔ اس قلمدان میں کئی امرا کے عرائض تھے جنھوں نے ناصر جنگ کو اپنی مدد و عنایت کا یقین دلایا تھا میر منشی ان عرائض کو برسر دربار پڑھنے کی اجازت چاہی۔ آصف جاہ اول نے یہ کہتے ہوئے کہ "اب فتنہ ختم ہو گیا ہے اب کیوں کسی کا راز فاش کیا جائے" تمام عرائض دربار میں دھلوا دیں۔[1]

ناصر جنگ کی تدفین

ناصر جنگ کی نعش خلد آباد لائی گئی اور مرقد حضرت برہان الدین کے احاطہ میں مزار آصف جاہ اول کے قریب دفن کی گئی۔ تاریخ شہادت "آفتاب رفت" اور "حسن خاتمہ" سے نکلتی ہے۔ (۱۱۶۴ھ) انتقال کے وقت ناصر جنگ کی عمر ۴۴ سال تھی۔ وہ دو سال چھ ماہ برسر اقتدار رہے۔

امیر الامرا غازی الدین خاں فیروز جنگ کی وفات

جب نواب ناصر جنگ کے مقتول ہونے کی اطلاع دہلی پہنچی تو آصف جاہ کے فرزند اکبر امیر الامرا غازی الدین خاں فیروز جنگ دعویدار سلطنت ہوئے اور دہلی کی مفلوج شہنشاہیت سے صوبہ داری دکن کی سند حاصل کر کے اپنی افواج کے ساتھ حیدرآباد کا رخ کیا۔

ع۱ حیات آصف ص ۳۶۲ و ص ۳۶۳

راستے میں مرہٹہ سردار ہلکر کو اپنی مدد کے لیے ہمراہ لے لیا۔ ۷ ذی الحجہ ۱۱۶۱ھ[1] کو اورنگ آباد سے قریب ایک مقام پر قیام کیا اور وہیں ہیضہ کی بیماری سے انتقال کیا۔ بعض مورخین کے بیان کے بموجب انھیں کسی امیر نے زہر دے دیا۔ جنازہ دہلی لے جایا گیا اور وہیں تدفین کی گئی۔

مظفر جنگ کی بادشاہی

ناصر جنگ کے مارے جانے کے بعد مظفر جنگ کو قید سے رہائی ملی وہ آصف جاہ اول کے نواسے اور ناصر جنگ کے بھانجے تھے۔ وہ کچھ عرصہ تک بیجاپور کے صوبہ دار بھی رہ چکے تھے۔ ہمت بہادر خاں پٹھان، چندا صاحب اور فرانسیسوں کی مدد سے وہ بمقام پانڈیچری مسند نشیں ہوئے[2]

راجہ رگھوناتھ داس دیاناتھ دیوان سلطنت

راجہ رام داس پنڈت کو "رگھوناتھ داس دیاناتھ" خطاب دے کر مستقل دیوان بنا لیا[3] ایک ہزار فرانسیسی سپاہیوں اور بیس ہزار دیسی افواج کے ہمراہ وہ حیدرآباد کی جانب روانہ ہوئے۔ ناصر جنگ کا خزانہ جو اٹھارہ صندوق پر مشتمل تھا، فرانسیسی افسروں اور سپاہیوں میں بے دریغ تقسیم کیا گیا۔ مظفر جنگ نے دوپلے کو کرشنا کے جنوبی علاقے کا نائب مقرر کر کے

فرانسیسوں کا اثر واقتدار

خطاب ظفر جنگ بھی عطا کیا اس کے علاوہ ہفت ہزاری منصب اور شاہی مراتب بھی دیے گئے کچھ زمانہ بعد دوپلے کو دریا کرشنا سے راس کماری تک کے علاقہ کا نائب مقرر کیا گیا۔ دوپلے کی بیوی کو جہاں آرا بیگم کا خطاب بھی دے دیا۔ یہ بھی عجیب واقعہ ہے کہ دوپلے مظفر جنگ کے دیے ہوئے خلعت پہن کر مغل امرا کے انداز میں دربار میں حاضر ہوتا اور مظفر جنگ کو جھک

---

[1] دبستان آصفیہ ص۴۷

[2] دبستان آصفیہ جلد اول ص۵۰

[3] " " " "

جھک کر سلام اور مجرا بجا لاتا۔ دوپلے نے اس انداز میں مظفر جنگ سے کئی مراعات حاصل کر لیے جو انگریزوں کے لیے سخت خطرناک تھے اور جن کی وجہ سے فرانسیسی اثر و اقتدار دکن میں بہت زیادہ مستحکم ہو گیا۔ دوپلے کے اس اثر و اقتدار سے کڑپہ، کرنول اور شاہ نور کے نوابوں میں سخت

نوابان کڑپہ، کرنول کی مظفر جنگ سے برہمی اور مظفر جنگ کا قتل

برہمی پیدا ہو گئی یہی وہ نواب تھے جنھوں نے ناصر جنگ کو شہید کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ اپنی بے دریغ داد و دہش کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مظفر جنگ دکن کی جانب روانہ ہوئے تو اخراجات سفر کے لیے انھیں دوپلے سے ایک لاکھ روپے بطور قرض لینا پڑا۔ اور بطور رہن جواہرات کے کئی صندوق اس کے حوالہ کر دیے۔ مظفر جنگ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دوپلے نے موسیو بوس کو مظفر جنگ کا مشیر مقرر کر کے ان کے ہمراہ کر دیا، اور ساتھ تیرہ ۱۳ سو فرانسیسی سپاہی بھی موسیو بوس کی کمان میں دے دیے۔ جب مظفر جنگ کا یہ قلاش جلوس رائے چوٹی کے قریب پہنچا تو کڑپہ کرنول کے نوابوں سے ان کی بگاڑ ہو گئی۔ ۱۷۔ ربیع الاول ۱۱۶۴ھ[1] م ۱۷۵۱ء کو ہمت خاں اور مظفر جنگ میں تنازعہ ہوا مظفر جنگ، ہمت خاں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس وقت نظام علی خاں نے اپنے ہاتھی کو ہمت خاں کے ہاتھی پر چڑھا دیا۔ اور اس کا کام تمام کر دیا۔ دوسرے امیر میر محمد حسین اپنے ہاتھی کو بہادر خاں کے ہاتھی کے پہلو میں لے گئے اور خنجر سے ہمت خاں کا سر کاٹ کر نیزہ پر چڑھا لیا اور لشکر میں اس نیزہ کو پھرایا۔ لشکر جو فرار ہو رہا تھا رک گیا[2]۔ مظفر جنگ کی بیگم نے جو لشکر میں موجود تھیں اپنے لڑکے کو مظفر جنگ کا جانشین بنانے کا اعلان کیا۔ لیکن انگریز پسند امرا نواب نظام علی خاں فرزند سوم آصف جاہ اول کو مسند نشیں کرنا چاہتے تھے۔ دوسری جانب فرانسیسی نواز امرا، جن میں شیر جنگ، جاد منیر الملک اور رگھوناتھ داس قابل ذکر ہیں نواب صلابت جنگ کو "نظام" بنانے کے خواہش مند تھے آخر کار فرانسیسی اثر غالب رہا اور سنہ ۱۷۵۱ء میں بمقام اورنگ آباد صلابت جنگ مسند نشیں

صلابت جنگ کی مسند نشینی

ہوئے۔ صلابت جنگ نے بطور شکر گزاری شمالی سرکار

ع[1] دیدیہ نظام جلد اول باب الاولیٰ صفحہ ۳۶

ع[2] دبستان آصفیہ جلد اول ص۵۲

کے چار اضلاع فرانسیسیوں کے حوالے کر دیے۔

موسیو بوس اور فرانسیسی اثرات

نواب صلابت جنگ کے عہد میں فرانسیسی اثرات کافی بڑھ چکے تھے۔ موسیو بوس نہ صرف حیدرآبادی افواج کے سپہ سالار تھا بلکہ اسے غضنفر جنگ، سیف الدولہ عمدۃ الملک کے خطابات دیے گئے۔ موسیو بوس کا ارادہ تھا کہ صلابت جنگ کے نام و نہاد فوجی اقتدار کو کم کرکے اپنی فرانسیسی فوج کی طاقت بڑھائے۔ اور اس طرح ریاست کے سیاہ و سفید کا مالک بن جائے۔ جب رگھوجی نے شورش کی تو موسیو بوس نے صلابت جنگ کو مشورہ دیا کہ رفع حجت کے لیے برار اور بعض پرگنے رگھوجی کے حوالے کر دیے جائیں۔ یہ تجویز نہ صلابت جنگ کو پسند تھی اور نہ امرا دکن اس تجویز سے متفق تھے۔ اس طرح موسیو بوس کے خلاف عام ناراضگی پیدا ہو گئی۔ جنوری ۱۷۵۳ء میں عمدۃ الملک موسیو بوس بیمار ہو گیا اور تبدیل آب و ہوا کے لیے مچھلی پٹنم چلا گیا۔ رکن الدولہ وکیل مطلق نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر صلابت جنگ کو مشورہ دیا کہ فرانسیسی افواج کو کم کر دیں، لیکن صلابت جنگ یہ جرأت نہ کر سکے جنوری ۱۷۵۴ء تک فرانسیسی افسران کی چار ماہ کی تنخواہ اور سواروں کی آٹھ ماہ کی تنخواہ صلابت جنگ کے ذمہ باقی ادا طلب تھی۔ رکن الدولہ نے عمداً تنخواہ کی ادائی کو روکے رکھا اور فرانسیسیوں سے کہا گیا کہ کرناٹک کے محاصل کی رقم پچاس لاکھ روپے جو فرانسیسیوں کی جانب سے نظام دکن کو ادا شدنی تھے ان سے تنخواہ کا بقایا بے باق کر لیا جائے۔ لیکن فرانسیسوں کو یہ تجویز منظور نہ تھی۔ آخر کار صلابت جنگ کچھ فرانسیسی افسروں اور سواروں کے ساتھ حیدرآباد سے اورنگ آباد چلے آئے اور گولکنڈہ کے قلعہ دار کو خفیہ ہدایت دی کہ فرانسیسی افواج کو ہر ماہ بتدریج برخواست کر دیں۔ ادھر دیوان سلطنت رکن الدولہ مدراس کے انگریز گورنر سانڈرس سے خفیہ مراسلت شروع کر دی اور فرانسیسیوں کو بے دخل کرنے کے لیے ضروری امداد کی خواہش کی۔

جب ان کارروائیوں کی اطلاع ڈوپلے کو ہوئی تو اس نے موسیو بوس کے اختیارات میں اضافہ کیا اور باوجود علالت کے فوراً دکن جانے کی ہدایت کی صلابت جنگ اس عرصہ میں رگھوجی کی یورش سے پریشان تھے اس لیے انھوں نے موسیو بوس سے کسی

قسم کے جھگڑے کو مناسب نہ سمجھا موسیوبوس نے فرانسیسی افواج کی تنخواہ ساہو کاروں سے حاصل کرکے ادا کی۔ آئندہ ادائی تنخواہ کی طمانیت کے لیے بوس نے کنٹور، ایلور اور راجمندری کے علاقے اپنے نام لکھوالیے اس طرح ۴۰۰ میل کا ساحلی علاقہ فرانسیسیوں کے قبضہ و تصرف میں آگیا۔ رکن الدولہ پر بدانتظامی کا الزام لگایا گیا اور موسیوبوس کے اصرار پر انھیں خدمت دیوانی سے علاحدہ کیا گیا اور صمصام الدولہ شاہ نواز خان دیوان سلطنت مقرر کیے گئے۔ صمصام الدولہ کو اپنی سپاہ علاحدہ رکھنے کا اختیار بھی دے دیا گیا صمصام الدولہ

صمصام الدولہ شاہنواز خاں

نے چار سال تک مدارالمہام کے فرائض انجام دیے وہ صلابت جنگ کے نظم و نسق کو مستحکم بنا کر فرانسیسی اثر و رسوخ کو کم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن صلابت جنگ نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ سپہ سالار موسیوبوس کے مشیر خاص نواب حیدر جنگ نے بدامنی سے فائدہ اٹھاکر، ابراہیم خاں گاڑدی اور فوج کے دیگر افسران کے ساتھ سازش کی اور مدارالمہام صمصام الدولہ کو قید کرلیا۔ رہائی پانے کے بعد وہ دولت آباد میں مقیم ہو گئے سالگرہ کی ایک تقریب کے موقعہ پر تجدید دوستی کے لیے صمصام الدولہ نے موسیوبوس اور حیدر جنگ کو مدعو کیا لیکن ان چالباز مہمانوں نے موقعہ پاکر اپنے میزبان صمصام الدولہ اور ان کے تین بیٹوں کو گرفتار کرلیا۔ جلد ہی آصف جاہی سپاہیوں نے حیدر جنگ کو خود اس کے خیمہ میں پارہ پارہ کردیا۔ موسیوبوس نے انتقاماً صمصام الدولہ اور ان کے تین لڑکوں کو قید ہی میں قتل کرادیا۔ آصف جاہ کے فرزند اکبر امیر الامرا غازی الدین خاں فیروز جنگ کے اچانک فوت ہونے کے بعد بالاجی راؤ نے صلابت خاں سے مطالبہ کیا کہ وہ امیر الامرا سے اس کے کیے ہوئے معاہدہ کی تکمیل کریں۔ اس جھگڑے کی یکسوئی کے لیے رکن الدولہ پونا روانہ کیے گئے۔

صلح نامہ پونا

آخرکار ''صلح نامہ پونا'' طے پایا جس کے تحت طے پایا کہ خاندیس کی سند ہولکر کے حوالہ کی جائے۔ صلابت جنگ پچیس ہزار مرہٹہ سوار اپنے پاس ملازم رکھیں اور رکن الدولہ پھر وکیل مطلق (مدارالمہام) مقرر کیے جائیں۔

صلابت جنگ کو اولاد نرینہ نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی نظام علی خاں کو نظام الملک آصف جاہ ثانی کا خطاب دے کر نیابت عطا کی۔ دوسرے بھائی بسالت جنگ کو برہان الملک کا خطاب اور وکیل مطلق مقرر کیا۔ درگاہ قلی خاں کو سالار جنگ کا خطاب دے کر اورنگ آباد کا ناظم مقرر کیا گیا۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی معرکہ آرائی اور نواب صلابت جنگ کی انگریز نوازی

اس عرصہ میں لارڈ کلایو کی سرکردگی میں کرنل فورڈ نے فرانسیسی علاقوں پر حملے شروع کر دیے اور مچھلی بندر پر قبضہ کر لیا۔ فرانسیسیوں کے خلاف عام ناراضگی پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات میں صلابت جنگ نے نئی ابھرتی ہوئی طاقت یعنی انگریزوں سے تعلقات کو استوار کرنا چاہا۔ ۱۷۵۹ء میں کرنل فورڈ سے ایک معاہدہ کیا گیا۔ جس کی رو سے انگریزوں کو مچھلی بندر اور شمالی سرکار کا علاقہ سپرد کر دیا گیا۔ جو اسّی میل طویل اور بیس میل عریض تھا۔ صلابت جنگ نے اقرار کیا کہ فرانسیسی افواج کو دو ماہ کے اندر نکال دیا جائے گا۔ فرانسیسیوں کے مخالف نظام علی خاں کی رقابت بھی اس موقعہ پر انگریزوں کے لیے ضروری تھی۔ اس لیے صلابت جنگ بتاریخ ۱۸۔ جون ۱۷۵۹ء حیدرآباد پہنچے اور اپنے بھائی نظام علی خاں سے ملاقات کی۔ صلابت جنگ کے دور میں انگریز، مرہٹہ اور فرانسیسی جھگڑوں کی وجہ سے آصف جاہ اوّل کی چھوڑی ہوئی سلطنت کا ایک تہائی سے زیادہ حصّہ آصفی اقتدار سے نکل گیا۔ صلابت جنگ کی دشواریوں میں یوں بھی اضافہ ہوا کہ نظام الملک آصف جاہ اول کے چھوٹے فرزند میر مغل علی خاں ہمایوں جاہ باغی ہو گئے۔ اور رام چندر نارائن کی مدد سے پونا فوج میں پہنچ گئے۔ دربار دہلی میں انگریزوں کا اثر و رسوخ دن بہ دن بڑھ رہا تھا۔ دکن میں برتری حاصل کرنے کے لیے انگریز صلابت جنگ کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔

نواب صلابت جنگ کی معزولی، گرفتاری اور انتقال

اس لیے شاہ عالم بادشاہ غازی سے نظام علی خاں کی صوبہ داری دکن کا فرمان جاری کرایا گیا۔ نظام علی خاں نے اپنے بھائی صلابت علی خاں صلابت جنگ کو ذیقعدہ

۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷۶۱ء میں بمقام بیدر قید کر لیا اور اپنی مسند نشینی کا اعلان کر کے امراء سے نذریں قبول کیں۔ کوئی ایک سال چار ماہ بعد ۲۰۔ ربیع الاول سنہ ۱۱۷۶ھ م ۱۷۶۲ء صلابت جنگ نے قید ہی میں انتقال کیا اور شیخ المشائخ شیخ ملتانی کے مزار کے قریب دفن کیے گئے۔

صلابت جنگ کو نظر بند کر کے ۱۱۷۵ھ ۱۷۶۱ء میں نظام علی خاں بمقام بیدر مسند نشین ہوئے۔ میر نظام علی خاں آصف جاہ اول کے چوتھے فرزند تھے۔ ۲۸ سال کی عمر میں مسند نشین ہوئے۔ ۴۲ سال حکومت کی اور ۱۷۔ ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ م ۷۔ اگست ۱۸۰۳ء میں انتقال کیا آپ کا دور حکومت انتہائی ہنگامہ خیز رہا۔ نظام علی خاں کا یہ ایک کارنامہ ہے کہ صلابت جنگ کے بعد انھوں نے آصفی خاندان کو زوال سے بچائے رکھا۔ مرہٹہ طاقت کمزور پڑ گئی تھی اس لیے انھوں نے اپنے چھٹے ہوئے علاقے مرہٹوں سے بڑی حد تک واپس کر لیے۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ انگریزوں سے ربط اتحاد قائم رکھا جائے اور فرانسیسی اثر و اقتدار کا جلد سے جلد خاتمہ کیا جائے۔

راجہ پرتاپ ونت بہادر دیوان

مسند نشین ہونے کے بعد نظام علی خاں نے راجہ پرتاپ ونت بہادر کو اپنا دیوان (مدارالمہام) مقرر کیا۔ ادھر حیدرآباد پر رگھوناتھ راؤ نے حملہ کر دیا۔ لیکن آصف جاہ ثانی کی واپسی سے پہلے یہ مرہٹہ حملہ ختم ہو گیا۔ آصف جاہ ثانی نے اوسہ پر چڑھائی کرنی چاہی لیکن یہ مہم کامیاب نہ ہو سکی۔ رگھوناتھ راؤ کے ایک زبردست حملہ میں کئی آصف جاہی افسر اور مدارالمہام راجہ پرتاپ ونت بہادر مارے گئے۔ آصف جاہ ثانی اورنگ آباد کی جانب روانہ ہوئے لیکن رگھوناتھ راؤ نے تعاقب جاری رکھا، اس لیے فریقین میں صلح ہو گئی اور رگھوناتھ راؤ کرناٹک کی جانب متوجہ ہو گئے۔

رکن الدولہ کی وزارت

راجہ پرتاپ ونت کے بعد خدمت وزارت رکن الدولہ، میر موسیٰ خاں احتشام جنگ کے حوالہ کی گئی۔ شیخ الملک بسالت جنگ قلعہ دار کرنول اپنی خدمت پر فائز ہوئے۔

آصف جاہ ثانی پہلے تو انگریزوں کے دوست رہے، لیکن معرکہ سرینگا پٹنم میں جب انگریز افواج اچانک میدان سے غائب ہوگئیں تو آصف جاہ ثانی میسور کے حکمراں کے حامی بن گئے اور طے پایا کہ نظام دکن، حیدر علی اور پیشوا متفقہ طور پر انگریزوں کا مقابلہ کریں گے۔ لیکن جب انگریزوں سے مقابلہ کا وقت آیا اور سات ہزار انگریز فوج کے مقابل ستر ہزار دیسی افواج صف آرا تھیں تو مدار المہام رکن الدولہ نے انگریز کمپنی سے صلح کرلی اور میدان کارزار کرناٹک، پیشوا اور انگریز کمپنی کے لیے چھوڑ دیا۔ اس معرکہ کے بعد آصف جاہ ثانی کبھی کرناٹک کے مقابل کبھی پیشوا کے خلاف کبھی انگریز کمپنی سے نبرد آزما رہے۔ ۱۷۷۵ء میں میر نظام علی خاں کی افواج ایلچپور کی طرف کوچ کررہی تھیں۔ رکن الدولہ دیوان کو فیضو نامی ایک سپاہی نے قتل کرڈالا۔

صمصام الملک دیوان

ان حالات میں صمصام الملک عبدالحی خاں دیوان ریاست مقرر ہوئے۔ ۱۷۸۰ء میں مسٹر ہالینڈ انگریزوں کی جانب سے رزیڈنٹ بن کر حیدرآباد آئے لیکن دو سال بعد مسٹر ڈگرانٹ، مسٹر ہالینڈ کی جگہ رزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۷۸۱ء میں دیوان صمصام الملک نے انتقال کیا اور ۱۷۸۳ء اعظم الامرا ارسطو جاہ مشیر الملک کو مدار المہام مقرر کیا گیا۔

انگریزوں کی پہلی سفارت

۱۱۹۶ھ میں انگریزوں کی جانب سے ایک سفارت حیدرآباد آئی مسٹر جانسن اور ان کے مددگار قمرالدین منت انگریزوں کے سفیر بن کر آئے پہلے انھوں نے جان اللہ شاہ کے تکیہ کے قریب جو موجودہ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) سے قریب تھا قیام کیا چونکہ اس سفارت کو حضور نظام سے شہر میں داخلہ کی اجازت نہیں ملی تھی اس لیے وہ شہر میں داخل نہ ہوسکے۔ آصف جاہ ثانی نے مدار المہام ارسطو جاہ کے معروضہ پر انگریز سفیر کو شاہی مہمان بنانے کی اجازت مرحمت کی اس سفارت کو انور الدین خاں صوبہ دار ارکاٹ کے ایوان " مبارک محل " میں جو اب دارالشفا میں میونسپل کارپوریشن حیدرآباد کا آفس ہے، مقیم کیا گیا۔ اس سفارت سے بات چیت کے بعد ایک معاہدہ طے پایا

جس کے ذریعہ انگریز افواج معہ توپ خانہ نظام کی مدد کے لیے حیدرآباد میں متعین کی گئی۔ انگریز افواج کے اخراجات کے لیے کئی جاگیریں عطا کی گئیں۔

کلکتہ میں آصف جاہ کی وکالت کے لیے میر عالم کا تقرر

۱۷۸۷ء م ۱۲۰۱ھ میں آصف جاہ ثانی نے پہلی مرتبہ نواب میر عالم بہادر کو وکیل مقرر کرکے انگریز کمپنی سے معاہدات و تہ نامہ جات کے لیے کلکتہ روانہ کیا۔ میر عبدالعزیز خاں اور مرزا ابوتراب خاں سات زنجیر فیل معہ ہودہ وغیرہ روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں لارڈ کارنوالس گورنر جنرل کی حیثیت سے مامور تھے۔

میر عالم کی سفارت ایسے زمانہ میں کلکتہ روانہ کی گئی تھی۔ جب کہ نظام اپنے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے شمالی اور مغربی سرحدوں پر مرہٹوں کا اور جنوبی سرحد پر ٹیپو سلطان کا زور بڑھ رہا تھا۔ فرانسیسی ٹیپو سلطان کے حلیف تھے اس لیے نظام کے لیے صرف انگریز کمپنی کی دوستی اور امداد مفید ہو سکتی تھی یوں بھی ہندوستان میں فرانسیسی قوت دم توڑ رہی تھی۔

حضور نظام سے سمدھاوے کے لیے ٹیپو سلطان کی کوشش

ٹیپو سلطان نے اس خیال سے کہ حیدرآباد، دکن میں ایک بڑی ریاست ہے اور اگر اس ریاست سے دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں تو انگریزوں کا مشترکہ مقابلہ کیا جا سکے گا۔ ایک وکیل محمد غوث کو حیدرآباد روانہ کیا، تاکہ حضور نظام (آصف جاہ ثانی) سے مل کر ٹیپو سلطان کے ساتھ سمدھاوے کا رشتہ اتحاد قائم کرے لیکن محمد غوث اپنی وکالت میں ناکام رہے۔ انھیں جواب دیا گیا کہ "نظام ایک ادنا نایک کے ساتھ قرابت نہیں قائم کر سکتے۔"

اس جواب کے بعد ٹیپو سلطان نے حیدرآباد کی جنوبی سرحد پر حملہ کر دیا ان حالات میں حیدرآباد کے لیے انگریزوں سے مفاہمت ناگزیر تھی۔ چنانچہ میر عالم اور جان کناری کے ذریعہ ایک عہد نامہ سنہ ۱۷۹۰ء میں مرتب کیا گیا جو عہد نامہ پانگل کے نام سے موسوم ہے۔

عہد نامہ پانگل سے انگریز کمپنی، نظام اور مرہٹوں کے حقوق میں کیے گئے۔ دراصل انگریز کمپنی نے اس قسم کا معاہدہ دیگر دیسی ریاستوں سے کیا تھا جو معاہدہ "امدادی انتظام"

کے نام سے موسوم ہے۔ اس معاہدہ کے ذریعہ طے پایا کہ ہر دیسی ریاست انگریز کمپنی کا اقتدار تسلیم کرتی ہے۔ اقتدار اعلا کو یوں تسلیم کرنے کے صلے میں انگریز کمپنی ان دیسی ریاستوں کی حفاظت اور سلامتی کا ذمہ لیتی تھی۔ یہ دیسی ریاستیں اس بات کی پابند تھیں کہ انگریز کمپنی کی منظوری کے بغیر نہ کسی سے جنگ کریں اور نہ صلح۔ ہر دیسی ریاست میں ایک انگریز ریذیڈنٹ اور انگریز فوج کا قیام ضروری تھا۔ جس کے اخراجات کی پابجائی دیسی ریاستوں پر لازم تھی اس معاہدہ کے بعد ٹیپو سلطان فرانسیسی افواج کے ساتھ تنہا رہ گئے۔

معرکہ سری رنگا پٹنم

ان تمام اقدامات کے بعد سنہ ۱۷۹۱ء میں میر عالم کی سرکردگی میں ایک فوج انگریزوں کی امداد کے لیے سری رنگا پٹنم روانہ کی گئی۔ ۱۳۔ فروری ۱۷۹۲ء میں ٹیپو سلطان کی جانب سے صلح کی پیش کش کی گئی اور ان شرائط پر صلح ہوئی کہ ٹیپو سلطان متحدہ کو تین کروڑ روپے نقد ادا کرے۔ اپنی ریاست کا نصف حصہ بھی متحدین کو دے دیں۔ اس کے علاوہ اپنے دو کمسن لڑکے عبدالخالق اور معزالدین کو بطور یرغمال متحدین کے حوالہ کر دیں۔ ٹیپو سلطان کے یہ دونوں کمسن بچے ۳۔ رجب ۱۲۰۶ھ کو لارڈ کارنوالس سے اور ۵۔ رجب کو سکندر جاہ (ولی عہد) کے خیمے میں آکر ملے۔ رفعت الملک نے ان دونوں صاحبزادوں کے دستار پر سرپیچ باندھا۔ اس معاہدہ صلح سے سترہ لاکھ سولہ ہزار کوڈ محاصل کا علاقہ نظام کو حاصل ہوا۔ اس علاقہ کے انتظام کے لیے راجہ چندو لعل، کامگار جنگ اور مستقیم الدولہ مقرر کیے گئے۔

صلح نامہ سری رنگا پٹنم اور ٹیپو سلطان کے بچے انگریزوں کے پاس یرغمال رکھے گئے

ارسطو جاہ کے خلل دماغ کی بنا پر مرہٹہ سفارت کی توہین

اس واقعہ کے چند ماہ بعد مدار المہام ارسطو جاہ کے فرزند سخت علیل ہو کر انتقال کر گئے۔ اور اس صدمہ کی بنا پر ارسطو جاہ خلل دماغ میں مبتلا ہو گئے۔ غالباً دوران علالت میں ایک بار جب کہ مرہٹوں کے وکیل آصف جاہ ثانی کے دربار میں تصفیہ مطالبات چوتھ کے لیے

حاضر ہوئے تھے۔ ارسطو جاہ نے ان وکلا کی بر سرِ دربار توہین کی۔ اس واقعہ کی وجہ سے دربار پونا اعظم الامرا ارسطو جاہ کا سخت مخالف ہوگیا اور چوتھ کے مطالبہ میں شدت پیدا کر دی۔ ان حالات میں آصف جاہ ثانی کے لیے ارسطو جاہ کی امداد اور رہنمائی ضروری تھی اس لیے انھوں نے اپنے چھوٹے فرزند میر جہانگیر علی خاں ظفر جنگ سلطان الدولہ سلیمان جاہ کو، جن کی عمر اس وقت چھ ماہ تھی ارسطو جاہ اور ان کی زوجہ سلطان بخشی بیگم کے آغوش میں دے دی۔ اس "سرفرازی" سے ارسطو جاہ کے حواس ٹھیک ہوئے۔ میر عالم مرہٹہ سرداروں سے گفتگو کے لیے سفارت پر پونا روانہ ہوئے۔ اس سفارت کا منشا یہ تھا کہ سردیس مکھی اور چوتھ کے بابت مرہٹوں اور نظام میں جو اختلاف تھا اُسے رفع کیا جائے۔ اس سفارت میں راجہ شام راج اور راجہ رگھوتم راؤ، میر عالم کے شریک سفارت اور مشیر تھے۔ میر عالم کی اس سفارت سے وہ غلط فہمی جو فریقین کے درمیان پیدا ہوگئی تھی وہ دور نہ ہو سکی اور مرہٹہ افواج "ممالک محروسہ سرکار عالی" کی جانب چڑھ آئیں۔ حیدرآباد کی افواج بھی مقابلہ کے لیے روانہ ہوئیں اور

جنگ کھرڑلہ اور ارسطو جاہ کی اسیری

بیدر سے آگے کھرڑلہ کے مقام پر ۲۱۔ مارچ ۱۷۹۵ء کو افواج کا مقابلہ ہوا۔ نظام کے بعض امرا جو اعظم الامرا ارسطو جاہ کے سخت خلاف ہو گئے تھے عمداً جنگ میں اس طریقہ پر حصہ نہیں لیا جس کی اُن سے توقع کی جاتی تھی آخر اس جنگ میں نظام حیدرآباد کی افواج کو شدید پسپائی ہوئی۔ معتبر تاریخی شہادت سے یہ ظاہر ہے کہ جس وقت گھمسان کا رن پڑا تھا اور حیدرآبادی افواج کا پلہ بھاری ہو چلا تھا، نظام کے مسلسل اصرار پر فوجیوں کو پیچھے ہٹانا پڑا اور یہ اقدام حیدرآباد کی فوجوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آصف جاہ خود اس بدبختانہ حکم کے پوری طرح ذمہ دار نہیں تھے انھیں اپنے حرم کے دباؤ کے تحت ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس زمانہ میں حرم اور بیگمات بادشاہ کے ساتھ بوقت معرکہ قلعہ یا خیمے میں رہا کرتی تھیں غالباً معرکہ کھرڑلہ کے موقع پر نظام کی چہیتی خاتون نے لڑائی کے منظر سے ہراساں ہو کر یہ دھمکی دی کہ اگر قریب کے قلعہ میں فوراً پناہ نہ لی گئی تو وہ پردہ سے باہر آ جائیں گے۔ یہ دھمکی بہت مہنگی پڑی۔ آخر دربار پونا سے ان شرائط پر صلح ہوئی کہ نظام تین کروڑ پینتیس (۳۵) لاکھ روپے بابتہ ادائی بقایا چوتھ مرہٹوں کو ادا کریں اور ادائی چوتھ تک مدار المہام

اعظم الامرا ارسطو جاہ کو بطور یرغمال مرہٹوں کے حوالہ کر دیں۔ اس نام و نہاد صلح کے بعد میر عالم بتاریخ ۵۔ اپریل ۱۷۹۵ء پونا سے بیدر پہنچے اور باریابی کی عزت حاصل کی۔ نظام اس بات پر ناراض تھے کہ معاہدہ کے بموجب انگریز کمپنی نے جنگ کھرڈا میں ان کی کوئی مدد نہیں کی اور نہ صلح و صفائی کی کوشش کی گئی۔

ارسطو جاہ کے غیاب میں خدمت دیوانی راجہ شام راج کے سپرد کی گئی۔

ارسطو جاہ کی اسیری کی بنا پر راجہ شام راج کے سپرد خدمت دیوانی کی گئی۔ نئے مدارالمہام نے معروضہ پیش کیا کہ انگریزی افواج کی وجہ سے خزانہ پر بڑا بار پڑ رہا ہے چنانچہ نظام نے انگریزی افواج کی برطرفی اور فرانسیسی افواج کی بھرتی کا حکم جاری کیا۔ فرانسیسی افواج کی پابجائی کے لیے میدک کا علاقہ موسیو ریمون کو تعہد میں دیا گیا۔

ریمون نے پہلا کام یہ کیا کہ دیسی بے قاعدہ افواج کو یورپی طرز پر جنگی تربیت دی۔ ۱۷۹۰ء میں ٹیپو سلطان کے خلاف لڑائی شروع ہوئی تو اس نے صرف سات سو سپاہیوں کے ساتھ اس جنگ میں شرکت کی اور اپنی دلیری کے جوہر دکھائے حضور نظام نے اس دلیرانہ کارگزاری کی بنا پر اس فوج کی تعداد پانچ ہزار تک بڑھانے کا حکم دیا اور اس کی ماہوار تنخواہ پانچ ہزار روپے کر دی گئی ۱۷۹۵ء تک اس کے زیر کمان افواج کی تعداد پندرہ ہزار تھی جن میں ۱۲۴ یورپین افسر بھی شامل تھے۔ اس کے زیر کمان ایک زبردست توپ خانہ تھا جس کے حمل و نقل کے لیے پانچ ہزار بیل استعمال کیے جاتے تھے۔ اس نے دکن میں توپ سازی کی صنعت کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ بمقام توپ کا سانچہ (گن فونڈری) اس نے توپ سازی کا کارخانہ قائم کیا۔ جہاں قابل یورپین متعین تھے۔

ریمون کی آخری لڑائی جنگ کھرڈا تھی جس میں اس کا حریف میدان پیروں بھی اس کا ہم وطن تھا۔ جو مرہٹہ فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔

جنگ کھرڈا میں حیدرآبادی افواج کو جن حالات میں مکمل شکست ہوئی اس کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ اس شکست کا ریمون ذمہ دار نہیں تھا موسیو ریمون ایک غیر ملکی سپاہی ہونے کے باوجود وہ حیدرآباد میں کافی ہر دلعزیز تھا لوگ اسے اپنا فوجی گرو سمجھتے اور موسیٰ رحیم

کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

انگریز افواج کی برطرفی اور فرانسیسی افواج کی بھرتی کا جب آصف جاہ ثانی نے حکم جاری کیا تو رزیڈنٹ شوکت جنگ ولیم پیاٹرک نے اس حکم کے خلاف شدید احتجاج کیا لیکن فرانسیسی دستے نظام کی جانب سے کڑپہ وکھم میں متعین کیے گئے جو انگریز کمپنی کی سرحد سے قریب ترین علاقے تھے۔ اس مرتبہ گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے خود احتجاج کیا اور رزیڈنٹ کو لکھا کہ "یہ کارروائی مجرمانہ تو نہیں البتہ شبہ پیدا کرتی ہے۔ موسیو ریمون کی افواج کو وہاں سے واپس طلب کرنے کے لیے نظام کو راضی کیا جائے۔" میر عالم نے بھی معروضہ پیش کیا۔ اور درخواست پیش کی کہ انگریزی افواج کو سبکدوش نہ کیا جائے۔ لیکن یہ معروضہ منظور نہ ہو سکا۔ جب برطرف شدہ انگریزی افواج کتل واڑی پہنچی تو صاحبزادہ عالی جاہ نے بغاوت کی اور بیدر کی جانب روانہ ہوئے۔ اس بغاوت کو رفع کرنے کے لیے نظام نے برطرف شدہ انگریز افواج کو واپس طلب کیا۔ یہ انگریز افواج بمقام گنٹور جمع ہوئیں۔ ادھر موسیو ریمون سپہ سالار کی سرکردگی میں حیدرآبادی افواج اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بیدر روانہ ہوئیں۔

صاحب زادہ عالی جاہ کی بغاوت اور خودکشی

عالی جاہ بیدر سے اورنگ آباد روانہ ہوئے جہاں ان کو گرفتار کیا گیا حیدرآباد آتے آتے راستے میں انھوں نے زہر کھا کر خودکشی کر لی[1]۔ میر عالم اور موسیو ریمون نے عالی جاہ کی نعش کو (حسب الحکم آصف جاہ ثانی)، برہنہ شاہ صاحب کی درگاہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔

ارسطو جاہ کی مرہٹہ قید سے رہائی

ارسطو جاہ مرہٹوں کے پاس جس وقت سے مقید تھے وہ اس بات کی کوشش میں تھے کہ مرہٹہ سرداروں میں کسی طرح اختلاف پیدا ہو جائے۔ اتفاقاً بہت جلد کچھ ایسے حالات

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد مولفہ جناب حافظ مظہر صاحب صفحہ ۴۹

پیدا ہو گئے کہ پیشوا سیوائے مادھوراؤ نے چھت سے گر کر انتقال کیا۔ مرہٹہ سرداروں میں اختلاف بڑھ گیا اور نانا فرنویس کے اقتدار کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ ارسطو جاہ نے مہاراجہ سندھیا کو اپنا حامی بنا لیا تھا اور ان کی مدد سے وہ دو سال کی مرہٹہ قید سے آزاد ہوئے۔

ارسطو جاہ نے پونا سے چھ کوس کے فاصلہ پر اپنی افواج ترتیب دیں اور مرہٹہ سرداروں سے واپسی مواضعات مع تین کروڑ روپے کا مطالبہ کیا مرہٹہ حکومت چوں کہ داخلی خلفشار کا شکار تھی اس لیے ارسطو جاہ اپنے مطالبہ کو منوا سکے۔

۱۷۹۷ء میں دکن آنے کے بعد ارسطو جاہ نے آصف جاہ ثانی کو مشورہ دیا کہ وہ انگریز کمپنی سے اپنے تعلقات بڑھائیں۔ فرانسیسی بڑی تعداد میں گرفتار کیے گئے اور انگریزوں کے حوالے کیے گئے۔ اب انگریز کمپنی "عدم مداخلت" کے نظریہ سے دست بردار ہو چکی تھی اور اس حقیقت سے آگاہ ہو چکی تھی کہ نظام اور مرہٹہ حکومت کی آپسی لڑائی سے ٹیپو سلطان کو طاقت حاصل ہو رہی ہے۔ انگریز کمپنی نے معاہدہ کے ذریعہ نظام اور مرہٹہ حکومت کو اپنی قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ ادھر ٹیپو سلطان نے ماریشس کی حکومت سے خفیہ مراسلت شروع کر دی اور پورے دکن پر قابض ہونے کے منصوبے بنائے۔ عہد

عہد نامہ ۱۷۹۸ء ٹیپو سلطان کی شہادت

عہد نامہ ۱۷۹۸ء بڑی سرعت کے ساتھ نظام اور کمپنی کے درمیان طے پایا جس کے ذریعہ نظام کی فرانسیسی افواج توڑ دی گئیں۔ آصف جاہ نے انگریز رزیڈنٹ کرک پیاٹرک کو بیش بہا تحائف عطا کیے۔ معاہدہ ۱۷۹۸ء کے تمام شرائط انگریز کمپنی کے موافق تھے اور یہ معاہدہ محض ارسطو جاہ کی کوشش سے مرتب ہوا تھا۔ اعظم الامرا ارسطو جاہ اپنی پوتی کی شادی نواب سکندر جاہ بہادر سے رچانے کے خواہش مند تھے اس لیے انھوں نے اس معاہدہ میں تین شرائط اپنے اصرار سے قائم کرانے کی کوشش کی۔ پہلے یہ کہ انگریز حکومت سکندر جاہ کی تخت نشینی کی تائید کرے گی۔ دوسرے یہ کہ ریاست نظام کو اندرونی انتظامات کے لیے انگریز افواج متعینہ ریاست سے مدد لی جائے اور تیسرے یہ کہ حیدر آباد اور پونا کے درمیان جو نزاعات ہوں اس کا تصفیہ کمپنی کر دے۔ یہ تین شرائط حیدر آباد کے مفاد کے خلاف تھے اور بعد کے زمانہ میں انگریز حکومت کو اپنی گرفت

مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ خوش قسمتی سے ارسطو جاہ کی ان تجاویز کو نظر انداز کر کے معاہدہ کی تکمیل کی گئی عہد نامہ کی تکمیل کے بعد میسور پر حملہ کیا گیا اور حیدرآبادی افواج کی سپہ سالاری کے لیے میر عالم نامزد کیے گئے۔ دیگر امرا ریاست میں ہادی الدولہ بہرام جنگ حیدر نواز جنگ اور نواب ابو تراب خاں کو میر عالم کے ہمراہ جنگ میں شریک رہنے کا حکم ہوا۔ آٹھ ہزار حیدرآبادی افواج میر عالم کی کمان میں دی گئی۔

انگریزوں نے کمال ہوشیاری سے میسور کی جنگ کے اختتام تک میر عالم کے اکلوتے فرزند، خان دوراں کو اپنے پاس مدراس میں رکھا تاکہ میر عالم انگریز مفادات کے خلاف ٹیپو سلطان اور فرانسیسی افواج سے نہ مل سکیں۔

۱۷۹۹ء میں یہ فوجیں سری رنگا پٹنم میں داخل ہوئیں۔ اور اس مقام پر زبردست لڑائی ہوئی۔ جس میں ٹیپو سلطان بہادری سے لڑتے ہوئے بتاریخ ۴ر مئی ۱۷۹۹ء کام میں آئے تاریخ وفات ٹیپو بو جہاد دین محمد شہر شد سے ۱۲۱۳ھ نکلتی ہے۔

فتح میسور کے بعد میر عالم حضور میں باریاب ہوئے اور حیدرآباد میں چند دن کے قیام کے بعد انھیں حکم دیا گیا کہ" ملک نو تسخیر" کے انتظام اور بندوبست کے لیے وہ روانہ ہو جائیں۔ میر عالم نے غالباً ایک سال کے عرصہ تک راجہ چندو لعل کے تعاون سے " ملک نو تسخیر" کا انتظام کیا۔ اس عرصہ میں کرک پیاٹرک رزیڈنٹ بن کر حیدرآباد آئے۔ ان کا یہ طریقہ تھا کہ جب دربار میں شرکت کے لیے آتے تو قدیم دستور کے برخلاف خلوت مبارک کے دروازے کی غلام گردش تک اپنی عماری سے نیچے نہ اترتے تھے۔ ایک بار میر عالم رزیڈنٹ کے ساتھ دربار میں حاضری کے لیے خلوت مبارک پہنچے اور رواج کے مطابق دیوان خانے کے داخلی دروازے پر اپنے مبانہ سے اتر گئے۔ اس دروازے پر تمام اعلا امرا اور عہدہ دار سرکاری سواری سے اتر جایا کرتے تھے۔ کرک پیاٹرک نے میر عالم کو ٹوکا کہ وہ خلوت کے دروازے پر اتریں۔" میر عالم نے جواب دیا کہ یہ میرے مالک کی ڈیوڑھی ہے اور میں اپنی مقدور سے آگے بڑھ نہیں سکتا اور آپ سے بھی متمنی ہوں کہ آپ بھی ایسا ہی کریں گے۔" کرک پیاٹرک اس مقام سے ہاتھی سے اتر گئے اور پھر کبھی غلام گردش تک عماری میں جانے کا خیال نہ کیا۔

کرک پیاٹرک رزیڈنٹ اور خیر النسا کا عقد

کرک پیاٹرک اکثر و بیشتر رزیڈنسی ۔ ملحقہ ایک مکان میں زیادہ رہا کرتے تھے. جہاں ان کی ایک مدخولہ رہا کرتی تھی۔ اس مکان میں عاقل الدولہ کی نواسی خیر النسا جو مہدی یار خاں اور شرف النسا بیگم کی دختر تھیں اور میر عالم کے قریبی رشتہ داروں میں تھیں، وہاں اکثر آیا کرتی تھیں۔ اتفاق سے کرک پیاٹرک اور خیر النسا میں جان پہچان کچھ اس قدر بڑھ گئی کہ نوجوان رزیڈنٹ نے خیر النسا بیگم کو رزیڈنسی کے "رنگ محل" میں عقد کر کے رکھ لیا۔[1]

میر عالم سے رزیڈنٹ کی ناراضگی

جب اس واقعہ کی اطلاع نواب ارسطوجاہ کو ہوئی تو انھوں نے میر عالم کو لکھ بھیجا کہ وہ گورنر جنرل سے رزیڈنٹ کرک پیاٹرک کے خلاف خیر النسا کے اغوا کی شکایت کریں۔ مدارالمہام سلطنت کے حسب الحکم میر عالم نے گورنر جنرل سے شکایت کر دی۔ گورنر جنرل نے کپتان جان ملکم کو تحقیقات کے لیے حیدرآباد روانہ کیا۔ لیکن ابھی وہ بندرگاہ مچھلی پٹنم تک پہنچے تھے کہ رزیڈنٹ نے اپنے ایک قاصد کو خیر النسا بیگم کی والدہ شرف النسا بیگم کے ایک خط کے ساتھ مچھلی پٹنم روانہ کیا۔ اس خط میں بیگم صاحبہ نے لکھا تھا کہ وہ اپنی خوشی سے خیر النسا بیگم کا عقد کرک پیاٹرک سے کیا ہے۔ خود رزیڈنٹ نے ایک خط کپتان جان ملکم کو لکھا کہ ان کے حیدرآباد آکر اس واقعہ کی تحقیقات سے رزیڈنٹ کے سیاسی اثر اور دبدبہ پر مضر اثر ہو گا۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ وہ واپس چلے جائیں۔ چنانچہ جان ملکم بندرگاہ مچھلی پٹنم سے واپس ہو گئے۔ بعض مورخین میر عالم اور کرک پیاٹرک کے اختلافات کی وجہ خیر النسا کے عقد کو قرار دیتے ہیں لیکن راجہ مکھن لعل اپنی تاریخ میں اس اختلافات کی وجہ مستقیم الدولہ کو قرار دیتے ہیں جنھوں نے اپنے طیش کی بنا پر ہر دو حکومتوں میں تعلقات کو کشیدہ بنا دیا تھا۔ انگریز کمپنی اور رزیڈنٹ نے مدارالمہام ارسطوجاہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ

---

[1] میر عالم مرتبہ سراج الدین طالب

میر عالم خدمت سفارت سے علاحدہ کردیے جائیں اور یہ خدمت دیوانی میں ضم کردی جائے۔

میر عالم کی خدمت دیوانی سے علاحدگی

میر عالم اپنی خدمت سے علاحدہ کردیے گئے اور ان پر الزام یہ لگایا گیا کہ وہ نظام کے مفاد کے خلاف انگریزوں کے ہم نوا اور زیر اثر آ گئے ہیں۔ ادھر رزیڈنٹ کرک پیاٹرک نے ارسطو جاہ کو یہ باور کرایا کہ کئی قیمتی جواہرات جو نظام کے حصہ میں جنگ میسور کے بعد دیے گئے تھے وہ میر عالم نے نظام کو نہیں پہنچائے میر عالم کے فرزند خان دوراں سے ارسطو جاہ نے ان جواہرات کا مطالبہ کیا اور دیوڑھی پر چوبدار متعین کرائے۔ اس بے عزتی کا اثر یہ ہوا کہ خان دوراں چند ہی دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔ جب مستقیم الدولہ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ وہ جواہرات میر عالم کے خانساماں غلام نبی کے قبضہ میں ہیں۔ ارسطو جاہ نے اس اتہام پر غلام نبی خاں کے مکان کو تباہ و برباد کردیا خود میر عالم اس الزام کی بنا پر گولکنڈہ سے قریب اپنی جاگیر میں نظربند رکھے گئے۔

میر عالم کی نظر بندی اور رہائی کی کوشش

میر عالم نے خرابی صحت کی بنا پر ارسطو جاہ مدارالمہام کے توسط سے کئی معروضے نظام کی خدمت میں پیش کیے کہ انھیں حیدرآباد شہر سے قریب رہنے کی اجازت دی جائے۔ آخر بڑی کوشش سعی و سفارش کے بعد آصف جاہ ثانی نے میر عالم کو گولکنڈہ میں واقع ان کی جاگیر ناگل پلی میں رہنے کی اجازت دی۔ میر عالم کی حفاظت اور نگرانی کے لیے دو سو سوار مقرر کیے گئے۔ ناگل پلی کے دوران قیام میں میر عالم کی قیام گاہ کو آگ لگ گئی اور سارا اثاثہ جل گیا۔ بس جانیں بچ گئیں مستقیم الدولہ نے آخر کار رزیڈنٹ حشمت جنگ کرک پیاٹرک کو اپنا ہم نوا بنالیا اور ان کی کوشش سے نظام نے حکم دیا کہ "میر عالم شہر میں اپنی دیوڑھی میں مقیم رہیں اور مریں تو دائرہ میر مومن میں دفن کیے جائیں" دوران قیام میں کسی سے ملاقات نہ کریں۔

حیدرآباد رزیڈنسی کی تعمیر

معاہدہ معاونت (سب سی ڈری سسٹم) کے نفاذ کے بعد حیدرآباد سے ایک معاہدہ سنہ ۱۸۰۰ء میں ہوا جس کی بنا پر انگریزی افواج کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور اخراجات فوج کے لیے نظام کو ریاست میسور کے جو علاقے دیے گئے تھے واپس لے لیے گئے۔ اس معاہدہ سے ایک سال قبل سنہ ۱۷۹۹ء میں کوتوال شہر محمد وقار خاں شمشیر جنگ اعتقاد الدولہ شمشیر الملک کے باغ میں رزیڈنسی کی عمارت مدراس کے انجینئر رسل[1] کی نگرانی اور راجہ کندہ سوامی کے والد کی عیانت میں ۱۸۰۰ء تا ۱۸۰۷ء میں تعمیر کی گئی۔ ۲۰ لاکھ روپے خزانہ ریاست سے خرچ ہوئے بعد میں جب انگریزی افواج کی تعداد میں اضافہ ہوا تو بلارم سکندرآباد اور الوال میں چھاؤنیاں قائم ہوئیں۔ بلارم میں جدید رزیڈنس تعمیر کی گئی۔ انگریزوں کی واپسی کے بعد سنہ ۱۹۴۸ء کے معاہدہ جاریہ کے بعد ہندوستانی ایجنٹ جنرل شری کے۔ ایم منشی بلارم رزیڈنسی میں ٹھہراتے گئے۔ بعد میں یہ عمارت "راشٹرپتی نلیم" کے نام سے موسوم کی گئی اور جنوبی ہند میں صدر جمہوریہ ہند کی سرکاری قیام گاہ قرار دی گئی۔ شہر حیدرآباد میں واقع رزیڈنسی عمارت میں ویمنس کالج جامعہ عثمانیہ منتقل کیا گیا۔ اس عمارت میں ویمنس کالج کی منتقلی نواب علی یاور جنگ کی مرہون منت ہے جو اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔

آصف جاہ ثانی کا محل چو محلہ[2]

۱۲۔ جون ۱۷۶۲ء کو نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے اپنی مسند نشینی کے بعد اورنگ آباد کی بجائے حیدرآباد کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ جو مرہٹہ سرحد سے دور ہونے کے علاوہ پایہ

---

[1] کارنامہ سروری نوٹ حاشیہ صہ ۹

[2] "چو محلہ" مضمون جناب نصیر الدین ہاشمی جو ادارہ سیاست کی جانب سے شائع شدہ کتاب شہر حیدرآباد کے صہ ۴۲ پر شائع کیا گیا ہے۔

٭ فرخندہ بنیاد حیدرآباد از ڈاکٹر زور صفحہ ۴۸

تخت کے لیے ہمیشہ موزوں مقام رہا ہے۔ آصف جاہ ثانی اپنے قیام کے لیے ایک قطب شاہی محل "جلال محل" کو پسند فرمایا اور "چو محلہ" نام رکھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے ایک عزیز مرزا احمد کے اس جلال محل میں نظام دوم نے کئی جدید عمارتیں تعمیر کرائیں۔ دیوان عام، خلوت، خواب گاہ وغیرہ چند جدید عمارتیں تھیں۔ اس محل میں چار علاحدہ علاحدہ عمارتیں ہیں اس لیے یہ محل چو محلہ کے نام سے موسوم ہوا۔ بعد میں جلو خانہ اور نقار خانہ تعمیر ہوئے۔ چمن بندی کی گئی اور حوض بنائے گئے جس میں جل پلی کے تالاب سے پانی آتا تھا۔ خس خانہ اور خواص پورہ کے نام سے دو علاحدہ عمارتیں بنائی گئیں۔ جو احاطہ دیوار سے قریب واقع تھیں۔ چو محلہ ایک وسیع محل تھا جو مکہ مسجد سے گھوڑوں کی چوک اور قاضی پورہ تک پھیلا ہوا تھا۔

چو محلہ پیالس کی دیگر عمارتیں

مولف بستان آصفی کے بیان کے بموجب یہ محل دو لاکھ نو ہزار مربع گز پر پھیلا ہوا تھا۔ نواب نظام علی خاں کے جانشین آصف جاہ سوم تا ہشتم کے دور حکومت میں چو محلہ پیالس میں کئی عمارتوں کا اضافہ کیا گیا۔ ان عمارتوں میں جلو خانہ، خلوت مبارک، رنگ محل، روشن بنگلہ، افضل محل، آفتاب محل، مہتاب محل، تہنیت محل، چاندنی بیگم کی حویلی، بخشی بیگم کی حویلی، موتی بنگلہ، شادی خانہ، توشہ خانہ محل کل پیران۔ راگ مالا چند قابل ذکر عمارتیں ہیں۔

فخر النسا بیگم عرف منجلی بیگم

منجلی بیگم کی حویلی خود منجلی بیگم صاحبہ کی قیام گاہ تھی۔ آصف جاہ ثانی کی سولہ صاحبزادیاں تھیں اور ان میں منجلی بیگم صاحبہ اپنے چار ناموں یعنی فخر النسا بیگم عرف منجلی بیگم قمر النسا بیگم عرف منجلی بیگم سے مشہور تھیں۔ منجلی بیگم کی والدہ سنگارسن المخاطب زہرہ خانم تھیں منجلی بیگم باب اللہ خاں کی بیوی تھیں اور بیوہ ہونے کے بعد اسی حویلی میں مقیم رہیں۔ سکندر جاہ آصف جاہ سوم نے اپنے پیش کار راجہ چندو لعل کو اپنی پھوپھی منجلی بیگم سے باریاب کیا تو منجلی بیگم صاحبہ نے راجہ چندو لعل کو اپنا مختار عام مقرر کیا۔ سکندر جاہ اپنی پھوپھی منجلی بیگم کا بڑا احترام کرتے اور ان کے پاس جانے کی جسارت نہیں کرتے تھے۔ جب منجلی بیگم

سخت بیمار ہوگئیں اور آخر وقت آگیا تو راجہ چندو لعل نے سکندر جاہ کو اپنے ساتھ لے جاکر باریاب کیا۔ بعد ازاں منجلی بیگم کا انتقال ہوگیا اور درگاہ برہنہ شاہ کے احاطہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ایک روایت کے بموجب تحریک آزادی کے اولین رہنما مبارزالدولہ بھی منجلی بیگم کی حویلی میں پیدا ہوئے جو سکندر جاہ کے صاحب زادے تھے۔ اس حویلی میں حضرت اسماعیل شہید کی دو قبریں ہیں۔ جن کے بارے میں روایت ہے کہ انھیں شہید کرنے کے بعد جسم کے چار ٹکڑے کیے گئے اور منجلی بیگم کی حویلی میں دو مقامات پر اور قرب و جوار دو مقامات پر دفن کیا گیا۔

قصر چو محلہ میں سرکاری اور مذہبی تقاریب

نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے بعد سکندر جاہ اور افضل الدولہ اس محل میں قیام فرماتے تھے نواب میر محبوب علی خاں بوقت عید یا محرم کئی کئی دن اس محل میں قیام کرتے تھے۔ تمام سرکاری تقاریب، مغلی اور انگریزی دربار اسی محل میں ہوا کرتے تھے۔ ابتداً اس محل کی آرائش مشرقی طرز پر کی گئی تھی لیکن نواب میر محبوب علی خاں کے عہد میں جب انگریز رزیڈنٹ کے اصرار بلکہ مطالبہ پر انگریزی دربار کی ابتدا ہوئی تو مغربی طرزِ آرائش کے ساتھ فرنیچر وغیرہ بھی یہاں رکھے گئے شاہی ڈنر کے لیے " کل پیراں" نام کی حویلی استعمال کی جاتی تھی۔ ابتداً اس عمارت میں بزرگان دین کی نیازیں ہوا کرتی تھیں اور غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ نواب میر محبوب علی خاں کے دور میں چو محلہ کی کئی عمارتیں از سرِ نو تعمیر کی گئیں اور انھیں زیادہ خوشنما اور شاندار بنایا گیا۔ آج جس عمارت میں خزانہ عامرہ موجود ہے وہ کبھی نواب سلیمان جاہ کی حویلی تھی نواب میر محبوب علی خاں نے اسی حویلی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ نواب میر عثمان علی خاں کے آخری دور میں پولیس ایکشن کے بعد سلیمان جاہ کی یہ دیوڑھی فروخت کردی گئی اور شاہی گھڑی ساز نے اس عمارت کو خرید لیا۔

شاہی خزانہ رکاب گنج [1]

نواب آصف جاہ اول اور آصف جاہ ثانی اکثر ریاست کے دورکن پر رہا کرتے تھے۔ اس لیے شاہی خزانہ (رکاب خزانہ) ساتھ رہا کرتا تھا۔ جب حیدرآباد آتے تو خزانہ اس عمارت میں رکھا جاتا جو اب انگریزوں کے الاوہ کے نام سے موسوم ہے اور ہائیکورٹ کے جانب جنوب واقع ہے۔ اسی خزانہ کی بنا پر یہ محلہ رکاب گنج مشہور ہوگیا۔

خوشحالی کا دور

آصف جاہ دوم نواب میر نظام علی خان کے عہد میں ہر روز عید اور ہر شب شب برات ہوا کرتی تھی۔ مزاج میں خوش خوری کا زیادہ غلبہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی تقاریب میں بھی عیش و عشرت کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان تقاریب میں امرا دولت، مناصب اور خطابات سے سرفراز کیے جاتے تھے قوال اور طائفہ انعام واکرام سے مالا مال کر دیے جاتے تھے۔ علما کی قدر دانی میں کمی نہ ہوتی تھی۔ غربا اور مساکین میں بہت کچھ مال وزر تقسیم ہوتا اور وہ ایک عرصہ تک فکر فردا سے نجات پاتے۔ نواب نظام علی خاں کا باورچی خانہ نواب انوار جنگ سے متعلق تھا۔ باورچی خانہ خلوت مبارک کے پہلو میں واقع تھا۔ ہر روز ایک سو بیس خوان خاصے کے تیار ہوتے تھے جو محل شاہی میں ارسال کیے جاتے تھے۔ جو خاصہ تقسیم ہوتا اس کو سالم خاصہ نصف خاصہ۔ پاؤ خاصہ کہا جاتا تھا جو بلحاظ مرتبہ واعزاز تقسیم ہوا کرتا تھا روزانہ کے معمول کے علاوہ رجب۔ رمضان وغیرہ کے مہینوں میں نواب فیض مآب دولہ کی نگرانی میں مخصوص کھانوں کی تیاری ہوا کرتی تھی۔ رجب کے مہینوں میں شام سے صبح تک اور صبح سے شام تک غربا اور فقرا کو کھانا کھلایا جاتا کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ مسجدوں میں بھی افطاری روانہ کی جاتی تھی۔ ربیع الثانی میں بڑے تکلف کے ساتھ نیازیں ہوتیں اور محرم میں بلا گوشت کا کھانا عاشور خانوں کو بھیجا جاتا تھا۔

نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی دختر کا عقد ذوالفقار الدولہ سے ۲۸ جولائی ۱۷۷۱ء

---

[1] "مملکت آصفیہ" شائع کردہ "ادارہ محبان دکن" — کراچی

میں ہوا تو مہر ایک لاکھ روپے ایک سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے مقرر ہوا۔ اس زمانہ میں زر مہر عموماً چند ہزار روپے اور چند دینار سرخ مقرر ہوا کرتا تھا۔

شہزادہ سکندر جاہ کی شادی، نواب نظام علی خاں نے بڑی دھوم دھام سے رچائی اور ایسے اعلا طریقہ پر رسومات ادا ہوئے جس کی مثال نہیں ملتی[1] جا بجا محفل ہائے عیش و سرور منعقد ہوئے۔ ماہ رواں پری چہرہ کا رقص و سرور اور دلکش موسیقی سے امرا کے گھر گونج رہے تھے۔ گھر گھر شادی تھی اور خانہ بخانہ جشن ہو رہا تھا۔ دسترخوان ایسا وسیع کہ گھر گھر پہنچایا گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اپنے گھروں میں کھانے کا انبار جمع کر لیا۔ تمام ملازمین سرکار منصبدار۔ جاگیردار اور سررشتہ داروں کو ترقی تنخواہ و مناسب عطا ہوئے۔ اس موقع پر نواب ارسطو جاہ بہادر کو خاص طور پر عزت دی گئی۔ اسی طرح ہر سال جشن سالگرہ بھی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اور ہر عام و خاص شاہی جود و کرم سے بہرہ مند ہوتا تھا۔ نواب نظام علی خاں نے نواب ناصر جنگ اور نواب صلابت جنگ کے تباہ حال حیدرآباد کی پھر سے آرائش و زیبائش کی ورنہ مرہٹہ اور میسور کی حکومتوں سے ریاست کو ہر آن خطرہ تھا۔ اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت مشکل تھی۔ انگریز کمپنی سے معاہدوں کی بنا پر بیرونی یورشوں اور حملوں کا کچھ بچاؤ ممکن ہو سکا۔ لیکن اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان معاہدوں کی بنا پر اور امیر الامرا نواب ارسطو جاہ نواب میر عالم اور راجہ چندو لعل کی انگریز دوستی نے انگریز کمپنی کے قدم جما دیے اور نواب نظام علی خاں کے جانشینوں کو اپنا اور ریاست کا وقار بچانے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

صرف خاص کا قیام

آصفی دور میں جاگیرداری کا سلسلہ صرف خاص کے قیام سے شروع ہوا سب سے زرخیز علاقے صرف خاص میں شامل تھے۔ آصف جاہی سلاطین سب سے پہلے جاگیردار تھے۔ شاہانہ وقت اور ان کے وسیع خاندان کے درباری اور خانگی مصارف

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد کے حالات زندگی مولفہ حافظ محمد مظہر صاحب ص۲۸

کی پا بجائی کے لیے ایک بڑا علاقہ مختص کر دیا گیا تھا۔ جو "صرف خاص مبارک" کہلاتا تھا۔ اس اسٹیٹ کی آمدنی سے تمام شاہی مصارف اور شاہی خاندان کی کفالت ہوتی تھی۔ ناصر جنگ اور صلابت جنگ کے دور میں شاہی مصارف کے لیے کوئی علاحدہ جاگیر اور اراضی مختص نہیں تھی بلکہ حسب ضرورت خزانہ دیوانہ و خزانہ عامرہ سے نقد رقم ادا کی جاتی تھی۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دور میں صرف خاص کے نام سے ایک اسٹیٹ پہلی بار قائم ہوا۔ سرکاری خزانہ کی حالت ان دنوں ٹھیک نہیں تھی اور فرمارواکے مصارف کے لیے وقت پر رقم فراہم نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے بہتر سمجھا گیا کہ چند علاقوں کی مالگزاری شاہی اخراجات کے لیے مختص کر دی جائے جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا شاہی مصارف کے لحاظ سے صرف خاص کی آمدنی کے لیے آراضیات میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ بعد میں ایسی جاگیری مقطعہ جات اور پرگنے بھی صرف خاص کا جز بن گئے جن کے مالک لاولد فوت ہو گئے تھے۔ ابتدا میں نظام علی خاں آصف جاہ ثانی۔ آصف جاہ سوم اور آصف جاہ چہارم کے زمانہ میں صرف خاص کی آمدنی تقریباً ایک کروڑ روپے سالانہ تھی۔ لیکن انیسویں اور بیسویں صدی میں یہ آمدنی دو کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ صرف خاص کا نظم و نسق علاقہ دیوانی سے بالکل علاحدہ تھا۔ سر سالار جنگ کے زمانہ میں صرف خاص کے نظم و نسق میں کئی تبدیلیاں کی گئیں اور اس علاقہ کو دیوانی نظم و نسق کے مطابق بنایا گیا۔ صرف خاص کا علاحدہ وزیر (صدرالمہام) ہوا کرتا تھا جو باب حکومت سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ صرف خاص کا کاغذ ممہور (اسٹامپ) بھی علاحدہ ہوا کرتا تھا۔ اس علاقہ کی علاحدہ عدالتیں تھیں اور ابتداً اس عدالت میں وکلا اور ججس زرد رنگ کے گون پہنا کرتے تھے۔ صرف خاص کی علاحدہ فوج اور پولیس ہوا کرتی تھی صرف خاص کے پہلے ناظم اکرام جنگ بدرالدولہ تھے۔ نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کی مسند نشینی کے بعد علاحدہ معتمد صرف خاص مقرر ہوا اور یہ خدمت موتمن جنگ سید حسن بلگرامی (عمادالملک) کے سپرد کی گئی۔

پائیگاہ

صرف خاص کے بعد سب سے بڑے جاگیردار، امرا پائیگاہ تھے۔ نواب ابوالخیر خاں سے پائیگاہی امارت کا سلسلہ شروع ہوا۔ نواب موصوف نواب نظام الملک آصف جاہ

اول کے دست راست تھے اور وہ آصف جاہ اول کے ساتھ دکن آئے تھے۔ابوالخیر خاں کا تعلق ابتداً شکوہ آباد سے تھا اور وہیں پیدا ہوئے آصفی سلطنت کے قائم ہونے کے بعد وہ برہان پور کے علمدار مقرر ہوئے اور اسی مقام پر انتقال کیا۔برہان پور میں ان کی بارہ دری "خیر خانی بارہ دری" کے نام سے اب بھی موجود ہے۔ نواب ابوالخیر خاں کو نواب آصف جاہ اول نے دو ہزار منصب، پانچ ہزار سوار تیس ہزار پیدل کی جاگیر عطا فرمائی۔ناصر جنگ نے انھیں شمشیر جنگ کا خطاب دیا۔ صلابت جنگ نے خطاب امام جنگ پالکی جھالردار سے سرفراز کیا۔ ان کے انتقال کے بعد نواب موصوف کے فرزند تیغ جنگ ابوالفتح خاں اس اعزاز اور امارت کے جانشیں ہوئے۔ وہ سب سے پہلے شمس الامراء بنائے گئے اور انتیس لاکھ سالانہ آمدنی کی جاگیرات عطا کی گئیں۔اس آمدنی سے وہ ایک اچھی فوج ہمیشہ تیار رکھتے تھے۔یہ فوج بارہ ہزار سواروں پر مشتمل تھی۔صلابت جنگ کے دور میں جب ان کو دیوان سلطنت بنانے کی تجویز ہوئی تو خود تیغ جنگ شمس الامرا نے اس خدمت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۲۰۵ھ م ۱۷۹۰ء میں انھوں نے انتقال کیا۔

ابوالفتح خاں کے بعد ان کے فرزند فخرالدین خاں شمس الامرا ثانی کے خطاب سے نوازے گئے اور جلد ہی امیر کبیر کے خطاب کے ساتھ پائیگاہ کے امیر بنائے گئے۔فخرالدین خاں بڑے بااثر امیر تھے اور اپنی علمی لیاقت اور خوش اخلاقی کی بنا پر انھوں نے پائیگاہ کے علاقہ کو خوب ترقی دی وہ خود ایک بڑے عالم تھے اس لیے علم و فضل کی خوب سرپرستی کی۔ ۱۲۶۵ھ م ۱۸۴۸ء میں وہ مدارالمہام ریاست مقرر ہوئے۔ان کے دور میں پائیگاہی علاقہ میں گنجوٹی۔ لوہارا۔ نارائن کھیڑ۔ حسن آباد جیسے زرخیز علاقوں کا اضافہ ہوا۔فخرالدین خاں نے ۱۲۷۸ھ م ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔نواب امیر کبیر اول فخرالدین خاں کے چار فرزند تھے۔رفیع الدین خاں عمدۃ الملک شمس الامرا ثالث اور رشید الدین خاں شمس الامرا رابع قابل ذکر ہیں۔ نواب رشید الدین خاں کے فرزنداں میں سر خورشید جاہ اور اقبال الدولہ بڑے بااثر امیر تھے۔ سلطان الدین خاں کے فرزند آسمان جاہ نے بہ حیثیت دیوان (مدارالمہام) اس ریاست کی ترقی میں بڑا حصہ ادا کیا۔پائیگاہی جاگیریں اکثر و بیشتر علاقہ مرہٹوارہ اور کرناٹک میں واقع تھیں۔یہ جاگیریں تقریباً ۲۲۷۳ مربع میل کے علاقہ میں پھیلی ہوئی تھیں اور کوئی ایک ہزار دیہات اس میں شامل تھے۔یہ جاگیرات

تنظیم و ترتیب افواج کے لیے عطا کی گئیں تھیں اور بعض جاگیرات صرف امیر پائیگاہ کے ذاتی مصارف کے لیے عطا کی گئیں تھیں۔ جنھیں ذات جاگیر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا نواب سکندر جاہ کے عہد میں فوجی جاگیرات کی آمدنی ۲۹۵۷۳۰۱ روپے اور ذات جاگیر کی آمدنی ۴۴۴۴۴ روپے سالانہ تھی۔ نواب افضل الدولہ کے زمانہ میں پائیگاہی علاقوں میں کافی اضافہ ہوگیا۔ نواب خورشید جاہ۔ وقار الامرا اور آسماں جاہ کو افضل الدولہ نے اپنی صاحب زادیاں بیاہی تھیں اور شادی میں جدید جاگیرات عطا کی گئی۔

نواب فخر الدین خاں شمس الامرا دوم کے زمانہ تک تمام پائیگاہوں کا ایک ہی انتظام تھا اور ایک امیر پائیگاہ کے تحت تمام نظم و نسق چلا کرتا تھا۔ لیکن ۱۲۷۸ھ م ۱۸۶۱ء میں نواب فخر الدین خاں کے انتقال کے بعد ان کے فرزندوں میں جاگیرات تقسیم کردی گئیں۔ ان کے چار فرزند تھے سلطان الدین خاں سیف جنگ، رفیع الدین خاں عمدۃ الملک رشید الدین خاں شمس الملک اور بدر الدین خاں معظم الملک پائیگاہ کی تمام جاگیریں ان چاروں فرزندوں کو علاحدہ علاحدہ عطا کی گئیں۔ رفیع الدین خاں اور بدر الدین خاں لاولد فوت ہوئے اس لیے پھر یہ جاگیریں سلطان الدین خاں اور خورشید الدین خاں کے فرزندوں یعنی آسماں جاہ، خورشید جاہ اور وقار الامرا میں تقسیم ہوگئیں۔ اس طرح پائیگاہ آسماں جاہی، خورشید جاہی اور پائیگاہ وقار الامرا کی ابتدا ہوئی۔

جاگیردار

ہندوستان میں نظام جاگیرداری قرون وسطی کی دین ہے یہ ایک نیم فوجی اور نیم محاصلی طریقہ تھا۔ جاگیردار کا فرض تھا کہ وہ نہ صرف اپنی جاگیر میں امن وامان قائم رکھے بلکہ پابندی کے ساتھ محاصل جمع کرکے شاہی خزانہ میں داخل کرتا رہے۔ ابتدا فوجی اغراض کے لیے عطا جاگیر کا طریقہ رائج ہوا۔ اور جاگیردار پر لازم تھا کہ بیرونی حملہ یا فوجی کارروائی کے موقع پر مناسب اور مقررہ افواج کے ساتھ فرماں رواں کے چھتر سایہ میں حاضر ہو اور میدان کارزار میں اس کے حکم کی تعمیل کرتا رہے۔ اس زمانہ میں سلطنت کی راست نگرانی میں کوئی منظم جمعیت نہیں رکھی جاتی تھیں اس قسم کی جاگیریں ایشیا اور یورپ کے کئی علاقوں میں قائم تھیں۔ مشرقی ایشیا میں تیمور لنگ کے دور سے اس

طریقہ تنظیم کی ابتدا ہوئی۔ ترکوں کے ساتھ یہ نظام ہندوستان پہنچا اور مغلوں نے اپنے سیاسی اقتدار کے لیے جاگیرداروں کو کافی اثر ورسوخ دے دیا۔ آصفی دورِ حکومت میں مغلوں کا یہ ورثہ دکن پہنچا اور سلطنت آصفیہ کا تقریباً ایک تہائی علاقہ ہندو۔ مسلم جاگیرداروں کی عملداری میں دے دیا گیا۔

جاگیرات کے اقسام

جاگیرات عموماً پانچ طریقوں پر عطا کی جاتی تھیں۔

پہلا طبقہ ال تمغہ جاگیرداروں کا تھا۔ یہ جاگیردار بڑی زرخیز اراضیات پر قابض تھے۔ اور جاگیر دائمی اور موروثی بھی ہوا کرتی تھی۔ یہ اپنی جاگیرات فروخت، رہن، بیع، ہبہ وغیرہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ جاگیریں خزانہ شاہی میں محصول نذرانہ یا پیش کش کی ادائی سے مستثنیٰ تھیں۔ ان جاگیرداروں کو راست فرماں روا کی جانب سے ان کے فرمان کے بموجب جاگیر عطا کی جاتی تھی۔ فرمان پر سرخی میں مہر شاہی ثبت کی جاتی تھی۔ اس مناسبت سے جاگیرداروں کا طبقہ ال تمغہ کہلانے لگا۔

دوسرا طبقہ مدد معاش جاگیرداروں کا تھا یہ جاگیریں صاحب جاگیر کے معاشی کفالت اور خوشحالی کے لیے عطا کی جاتی تھیں۔ ان جاگیرداروں پر کوئی زائد فرائض عائد نہ کیے جاتے تھے۔ اس طبقہ میں وہ علما اور دانشور بھی شامل تھے جنھیں جاگیرات خانقاہ یا درس گاہوں کے انتظام کے لیے دی گئی تھیں۔

تیسرے جاگیرداروں کا طبقہ، جاگیردار نگہداشت جمعیت کہلاتا تھا۔ ان جاگیرداروں پر لازم تھا کہ وہ محاصل جاگیر سے سلطنت کی حفاظت کریں ایک منظم فوج ہمیشہ تیار رکھیں اس طبقہ میں وہ جاگیردار بھی شامل تھے جنھیں انعامی جاگیر (برائے تحفظ خانقاہ یا مساجد، یا اگبھار ا برائے تحفظ منادر) عطا کی جاتی تھیں۔

جاگیرداروں کا چوتھا طبقہ تنخواہی محالات کا تھا۔ ان اشخاص کو تنخواہ کے معاوضہ میں جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ جب بادشاہ کسی عہدہ دار کو تنخواہ نہ دے سکتے تھے تو کوئی چھوٹی جاگیر بمعاوضہ تنخواہ اس عہدے دار کو عطا کر دیتے تھے۔ سر سالار جنگ کی مدار المہامی سے قبل اس قسم کی جاگیرات کا مجموعی محاصل ۴۲۹۳۹۸ روپے تھا سر سالار جنگ نے قرضوں

کی ادائی کے بعد یہ تمام جاگیریں واپس لے لیں۔

حیدرآباد میں کئی خطاب یافتہ درباری تھے۔ خطاب یافتہ درباری اور ان کے اہل خاندان کو ریاست میں بڑی عزت دی جاتی تھی۔ خطاب یافتہ شخص اور اس کے متعلقین کو ایسی روش اختیار کرنی پڑتی تھی کہ ان کی زندگی ان کے اعزاز کے مطابق ہو۔ اگر خطاب یافتہ سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی یا وہ کسی اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہو جاتا تو اسے دربار میں حاضری سے محروم کردیا جاتا۔ سنگین سزا کے طور پر خطاب سلب کرلیے جاتے تھے۔ یہ سزا پھانسی کے تختہ پر لٹکانے سے زیادہ سنگین خیال کی جاتی تھی اور خطاب یافتہ اور اس کی کئی پشتیں، اس سزا کو ایک بدنما داغ سمجھتے تھے۔[1]

آصف جاہ ثانی کا انتقال

۱۷۔ ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ م ۷۔ اگست سنہ ۱۸۰۳ء کو جب کہ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی اپنے مرشدزادے کیواں جاہ کی رسم تسمیہ خوانی میں شریک تھے اچانک علیل ہو گئے اور ۷۰ سال کی عمر میں ۴۲ سال حکومت کرکے انتقال کیا۔ چوملہ پیالس اور مکہ مسجد کے درمیانی دیوار کو منہدم کرکے جنازہ صحن مکہ مسجد میں لایا گیا اور ان کی والدہ عمدہ بیگم صاحبہ کے مزار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

---

[1] انتظام جاگیرات کے لیے دیکھیے V.P. Menon, On Integration of States page-385

دوسرا دور

۱۲۰۰ھ تا ۱۲۲۵ھ
یعنی ۱۸۰۰ء تا ۱۸۲۵ء

نواب سکندر جاہ آصف جاہ سوم

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے انتقال کے بعد، چوں کہ ان کے بڑے فرزند عالی جاہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس لیے دوسرے فرزند میر اکبر علی خاں سکندر جاہ ۱۸۰۳ء م ۱۲۱۸ھ میں مسند نشیں ہوئے۔ ان کے دور میں کئی داخلی اصلاحات کی گئیں اور حکمراں کو جنگ و جدال سے بڑی حد تک نجات ملی اور انصاف رسانی کے لیے حیدرآباد میں ابتدائی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا۔[1]

مسند نشینی کے بعد نواب سکندر جاہ نے خدمت مدارالمہامی پر نواب ارسطو جاہ کو برقرار رکھا قریباً ایک ہی سال بعد بتاریخ ۵۔ مئی ۱۸۰۴ء کو نواب ارسطو جاہ نے انتقال کیا۔ جدید مدارالمہام کے تقرر کا مسئلہ دو ماہ تک زیر غور رہا۔

راجہ رگھوتم راؤ پیشکار کا تقرر بحیثیت منصرم مدارالمہام

راجہ راجندر گھوتم راؤ پیشکار کو دیوانی کی منصرمانہ خدمت انجام دینے کے لیے احکام جاری

---

[1] تاریخ عدالت آصفی از میر باسط علی خاں ص۶

ہوتے۔ راجہ راجندر رگھوتم راؤ ابتدا پونا کی وکالت کے لیے دربار دکن سے مقرر کیے گئے تھے۔ ارسطوجاہ کی اسیری کے زمانہ میں راجہ رگھوتم راؤ نے محروس مدارالمہام کی رہائی کے لیے بڑی کوشش کی تھی۔ جب ارسطوجاہ رہا ہو کر حیدرآباد آئے تو انھوں نے راجہ راجندر رگھوتم راؤ کو خدمت پیشکاری اور کھپرہ کی جاگیر دلوائی۔ انگریز کمپنی کی جانب سے انھیں دو ہزار روپے ماہوار بھی ملا کرتے تھے۔ ارسطوجاہ کے انتقال کے بعد ان کا ستارہ اقبال بھی غروب ہوگیا۔

نواب میر عالم کی مدارالمہامی

نواب ارسطوجاہ کے انتقال کے دو ماہ بعد انتہائی غور و خوص کے بعد سکندر جاہ آصف جاہ سوم نے میر عالم کو قید سے رہا کر کے خدمت دیوانی سے سرفراز کیا۔ سکندر جاہ؟ دراصل راجہ مہیپت رام کو اپنا مدارالمہام بنانا چاہتے تھے لیکن انگریز کمپنی کے شدید اصرار اور سفارش پر میر عالم مدارالمہام بنائے گئے۔ لیکن جلد ہی میر عالم کے تعلقات انگریز رزیڈنٹ سے بگڑ گئے۔ اس لیے انگریز کمپنی نے بہ کمال دوراندیشی اپنے رزیڈنٹ کا تبادلہ کر دیا اور نئے رزیڈنٹ مسٹر تھامس سر فہام مقرر کیے گئے لیکن راجہ مہیپت رام کی وجہ سے دشواری پیدا ہوئی۔ راجہ مہیپت رام نے میر عالم کے خلاف آصف جاہ سوم کے کان بھر دیے اور ممکن تھا کہ میر عالم پھر اپنی خدمت سے علاحدہ کر دیے جاتے لیکن رزیڈنٹ نے بادشاہ اور وزیر میں صلح صفائی کرادی اور حالات زیادہ بگڑنے نہ پائے۔

راجہ مہیپت رام [1]

راجہ مہیپت رام ایک سرفروش محب وطن تھے، جن کی ساری زندگی انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں گزر گئی۔ دربار حیدرآباد میں ان کی موجودگی رزیڈنٹ کے مفادات کے لیے خصوصاً اور انگریز کمپنی کے لیے مستقلاً خطرہ بن گئی تھی وہ نواب سکندر جاہ کے مشیر خاص اور انگریز مخالف سرگرمیوں کا مرکز تھے۔

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو مضمون راجہ مہیپت رام از جناب حسینی شاہد صورت گران دکن ص۱۵۹

راجہ مہپت رام اور نواب میر عالم کی درباری رقابتیں

راجہ مہپت رام ایک گجراتی برہم کھتری تھے۔ نواب ارسطو جاہ کے حضور میں موسیو ریمون کے وکیل کی حیثیت سے مامور تھے۔ جس وقت ارسطو جاہ رہائی پا کر پونا سے واپس آئے تو مہپت رام فوج کی سررشتہ داری پر فائز تھے اور نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے مزاج میں کافی دخل پا گئے تھے۔ بعدازاں وہ صوبہ برار کی تعلق داری کی خدمت انجام دی۔ نواب ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد راجہ مہپت رام خدمت پیشکاری اور دیوانی کے خواہش مند ہوئے اور اس مقصد کے تحت انھوں نے سکندر جاہ کے مزاج میں کافی دخل پا لیا۔ خیرخواہی کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ انگریز اقتدار سے بیزارگی کا اظہار کیا جائے۔ مہپت رام نے بلا اجازت سرکار کئی تعلقہ جات کو قبضہ میں کر لیا۔ رزیڈنٹ حیدرآباد مہپت رام سے اس لیے بدظن تھے کہ وہ موسیو ریمون کے وکیل اور فوج کے سررشتہ دار تھے۔ اس لیے برار سے تعلق دار کی حیثیت سے ان کا تقرر رزیڈنٹ کو پسند نہ تھا۔ رزیڈنٹ اس موقعہ کی تلاش میں تھے کہ راجہ مہپت رام نظام کی نظروں سے گر جائیں۔ اور کسی طرح حیدرآباد سے شہر بدر کر دیے جائیں۔ لیکن حضور نظام اپنے چہیتے امیر کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لیے رضامند نہیں تھے۔ سکندر جاہ خود در پردہ انگریزوں کے مخالف تھے۔ اب جو مہپت رام جیسا مشیر ملا تو ان کی مخالفت کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔ سکندر جاہ راجہ مہپت رام اور راجہ رگھوتم راؤ کے ان منصوبوں میں گہری دلچسپی لینے لگے جو انگریزوں کی بے دخلی اور ریاست کے وقار میں اضافہ کے لیے بنا رہے تھے۔ رزیڈنٹ حیدرآباد کو ان منصوبوں کی خبر میر عالم مدارالمہام کے ذریعہ ملتی رہی۔ آخرکار حیدرآباد رزیڈنٹ کے ذریعہ نواب سکندر جاہ کو گورنر جنرل ہند کا ایک مراسلہ وصول ہوا جس میں راجہ مہپت رام اور اسمٰعیل یار جنگ کی فوری برطرفی کی" ہدایت تھی"۔ سکندر جاہ جانتے تھے کہ گورنر جنرل کی ہدایت کی خلاف ورزی کے بعد کیا صورت حال پیش آئے گی۔ چنانچہ حیدرآباد میں دفاعی کارروائی شروع کی گئی۔ مہپت رام منظفرالدولہ نورالامرا کے پاس احکام روانہ کیے گئے اور شمس الامرا اسد علی خاں راجہ راؤ رنبھا اور دیگر امرا جاگیرداروں کے نام ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ فوراً فوجیں روانہ کریں۔

ادھر ریذیڈنسی بھی فیصلہ کن کاروائی کے لیے تیار ہوگئی اور سکندرآباد کی فوجوں کو تیاری کا حکم دے دیا گیا۔ ان حالات سے بعض امرا میں شدید تشویش پیدا ہوگئی اور نواب امجدالملک نے نواب سکندر جاہ آصف جاہ سوم کو سنگین عواقب سے آگاہ کرتے ہوئے معروضہ پیش کیا کہ "فی الحال" گورنر جنرل ہند کے احکام کی تعمیل ہی مناسب ہے آخر کار راجہ مہیپت رام خدمت پیشکاری اور سررشتہ داری افواج سے معزول کر دیے گئے اور یہ خدمت راجہ چندو لعل کے بھائی راجہ گوبند بخش کو عطا کی گئی۔ اسی طرح راجہ مہیپت رام کے مددگار نواب اسمٰعیل یار جنگ بھی اپنی خدمت سے علاحدہ کر دیے گئے۔ راجہ مہیپت رام کو حکم دیا گیا کہ وہ سکر شاہ پور جو ترپتی سے قریب واقع تھا چلے جائیں راجہ صاحب ایک بڑی فوج کے ساتھ سکر شاہ پورہ روانہ ہوئے۔ ان کی فوج کی تعداد سے ظاہر تھا کہ کوئی انتشار پیدا ہوگا۔ اس اندیشہ کے تحت انگریزی افواج ان کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کی گئیں۔ ایک مقام پر زبردست لڑائی ہوئی اور ایک انگریز سردار کام آیا۔ راجہ مہیپت رام لڑتے ہوئے ہولکر کے حدود سلطنت میں داخل ہوگئے اور پناہ لی لیکن ان کا وہاں بھی تعاقب کیا گیا تو وہ بنارس کی جانب روانہ ہوئے جہاں انھوں نے انتقال کیا۔

لکڑ کوٹ بارہ دری میں جشن اور ضیافت

راجہ مہیپت رام کے اس طرح خارج البلد کیے جانے کے بعد میر عالم نے اپنی بارہ دری لب موسیٰ (جو موجودہ سالار جنگ میوزیم سے قریب واقع تھی اور جسے عرصہ تک "لکڑ کوٹ" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا) سکندر جاہ کی پرتکلف ضیافت کی جس کا خرچ (اس وقت کے موازنہ کے لحاظ سے) سات لاکھ روپے ہوا۔ سکندر جاہ نے اس ضیافت میں راجہ چندو لعل کے بھائی راجہ گوبند بخش کو وزیر افواج مقرر کیا۔ میر عالم نے گراں بہا جواہرات جو فتح میسور کے بعد انھیں ملے تھے نذر کیے۔ ان جواہرات میں ایک ہار شامل تھا جس کے سوا نے یاقوت کے تھے اور ایک ایک یاقوت جنگلی بیر کے برابر اور رنگ اصل رمانی تھا جوہریوں نے اس ہار کو لاقیمت قرار دیا۔ ایک طلائی مرصع پاندان تھا جس میں الماس، یاقوت اور زمرد جڑے ہوئے تھے

اس پاندان کے ساتھ پان کے پورے پتے ایک ایک زمرد کے تراشے ہوئے تھے۔ اس خوشی میں سکندر جاہ نے میر عالم کے بعض اقارب کو خطابات عطا کیے۔ میر عالم راجہ چندو لعل کو خدمت پیشکاری سپرد کرنا چاہتے تھے لیکن راجہ سورج پرتاپ ونت جو دفتر مال کے مختار اور میر عالم کے خصوصی مددگار تھے اس تجویز کے حامی نہ تھے اس لیے راجہ چندو لعل کو میر عالم اور حضور نظام کے درمیان وکیل مقرر کیا گیا۔ جب راجہ سورج پرتاپ ونت ۱۲۲۱ھ میں انتقال کیا تو راجہ چندو لعل کو خدمت پیشکاری دی گئی۔

نواب میر عالم کی وزارت چار سال چھ ماہ چار دن رہی۔ فتح سری رنگا پٹنم میں میر عالم کو جو انعام ملا تھا اسی انعام کے روپیوں سے حیدرآباد کے مغربی جانب پانچ میل کے فاصلہ پر ۱۸۰۲ء میں ایک تالاب بنوایا گیا۔ جو ان کے نام سے مشہور ہے اس تالاب کی تعمیر کے لیے ایک مہتمم تعمیرات ہنوی رسل انجنیر مقرر ہوا۔ نواب عماد الملک بلگرامی اور سی ولمٹ کے خیال کے بموجب اس تالاب کی تعمیر فرانسیسی انجنیروں کے زیر نگرانی ہوئی تھی۔

تالاب میر ساگر یا میر عالم

اس تالاب کی تعمیر سے حیدرآباد میں پانی کی قلت دور ہوئی۔ ورنہ حیدرآباد کے امیر امرا کو ہم رکن الدولہ کا پانی سربراہ کیا جاتا تھا غریب اور متوسط درجہ کے عوام خانگی باولیوں سے مستفید ہوا کرتے تھے۔ نواب میر عالم کے انتقال کے بعد لوگوں میں یہ مقولہ عام ہو گیا تھا کہ "میر عالم مر گئے گھر گھر پانی کر گئے"۔ میر عالم نے ۱۲۲۳ھ میں انتقال کیا۔ نواب میر عالم بہادر کے انتقال کی خبر نواب سکندر جاہ اور رزیڈنٹ کپتان سدنہام کو دی گئی۔ رزیڈنٹ دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مدار المہام کے انتقال کی اطلاع گورنر جنرل کو دی جا چکی ہے کچھ دن بعد خریطۂ تعزیت گورنر جنرل کی جانب سے وصول ہوا۔

میر عالم کی تصانیف

نواب میر عالم نے اپنی سرگرم زندگی میں کچھ وقت تصنیف و تالیف کے لیے بھی دیا اس کی تصانیف میں مصباح العارفین، زیارت عاشورہ، مثنوی میر عالم جس میں ماہ لقابائی

چندا کا سراپا بیان کیا گیا ہے) اور رقعات میر عالم قابل ذکر ہیں۔ میر عالم منڈی جس مقام پر ہے یہ دراصل میر عالم کا جلوخانہ تھا۔ جلوخانہ اس مقام کو کہتے تھے جہاں فوج متعین رہتی تھی اور جہاں سے امیر کی سواری نکلتی تھی۔

میر عالم نے اپنی زندگی میں عوام کی بہبودی کے لیے اپنے جلوخانہ میں منڈی قائم کردی اور بادشاہ وقت کے نام سے اسے سکندر گنج موسوم کیا۔ لیکن یہ نام مقبول نہ ہو سکا۔ یہ منڈی ۱۲۲۰ھ م ۱۸۰۵ء میں بسائی گئی۔ منڈی کے ساتھ ایک مسجد بھی بنائی گئی جو اب بھی موجود ہے۔ سر سالار جنگ نے اس منڈی میں دوبارہ اصلاح کی نواب سالار جنگ ثالث نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد حکومت کی جانب سے جو کمیٹی قائم کی گئی تھی اور جس کے صدر نشیں مرحوم مہدی نواز جنگ تھے، اس نے تقریباً تین لاکھ روپے کے خرچہ سے اس منڈی کو بہتر بنایا۔

حیدرآباد کے اس عظیم سیاس کا انتقال ۲۱۔ شوال ۱۲۲۳ھ شب جمعہ کو بہ مرض جذام ہوا اور دائرہ میر مومن میں مزار حضرت مومن کے قریب دفن کیے گئے مزار پر نہ کوئی گنبد ہے اور نہ کتبہ بس چراغ رکھنے کے لیے ایک چھوٹی سی دیوار بنا دی گئی ہے۔

نواب منیر الملک کی مدار المہامی

۱۲۲۳ھ میں میر عالم کے انتقال کے بعد ان کے داماد نواب منیر الملک خدمت دیوانی پر مامور ہوئے[1]۔ وزارت دیوانی کے دو امیدوار تھے ایک شمس الامرا ثانی اور دوسرے نواب منیر الملک۔ انگریز کمپنی نواب میر عالم سے اپنی قدیم ہمدردی کی بنا پر نواب منیر الملک کی حامی تھی۔ انگریز رزیڈنٹ نے نواب منیر الملک کو پابند کیا کہ وہ اپنے تمام اختیارات مہاراجہ چندو لعل کے سپرد کردیں اور ان کے مشورہ سے خدمت دیوانی انجام دیں۔ اس لیے منیر الملک کی حیثیت محض انگشت ششم کی ہوگئی تھی۔ راجہ چندو لعل اس طرح مسلسل ۳۲ سال تک ریاست کے سیاہ وسفید کے مالک بنے رہے۔

نواب منیر الملک کی مدارالمہامی کے زمانہ میں پنڈاریوں نے نظام کی ریاست میں اپنی

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد کے حالات زندگی مولفہ حافظ محمد مظہر ص۵۳

سرگرمیاں شروع کردیں اور کئی قصبات بے چراغ ہوگئے۔ پنڈاری نظام کی "انگریز دوستی" سے ناراض تھے ہی اس پر باجی راؤ پیشوا اور اپا راؤ والی ناگپور انھیں اس تباہی کے لیے مسلسل شہ دے رہے تھے۔ نظام کی افواج اور انگریزی افواج مسٹر مالکم کی سرکردگی میں پنڈاریوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئیں۔ جس نے پنڈاریوں کا زور توڑ دیا۔ انگریزوں نے مصلحت کی بنا پر گوالیار اور ٹونک میں انھیں اقتدار دے دیا۔ اس طرح دو مزید ریاستوں کا اضافہ ہوا۔ اس زمانہ میں نواب مبارز الدولہ جو انگریز اقتدار کے سخت مخالف تھے اپنی سرگرمیاں تیز کردیں۔

نواب مبارز الدولہ خاندان آصفی کا باغی شہزادہ [1]

نواب مبارز الدولہ، نواب سکندر جاہ آصف جاہ سوم کے صاحب زادے اور نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم کے بھائی تھے۔ انگریز دشمنی کا جذبہ انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ جس نے کم عمری ہی میں جارحانہ صورت اختیار کرلی۔ نواب مبارز الدولہ کی سیاسی سرگرمیاں صرف ریاست حیدرآباد تک محدود نہیں تھیں بلکہ ان کی کارروائیوں کا علاقہ مدراس۔ بمبئی۔ کرنول سے لے کر لاہور اور سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔ انھوں نے ایک طرف "وہابی تحریک" کے ذریعہ حیدرآباد اور ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم و متحد کیا تو دوسری طرف مختلف ہندو مسلم رئیسوں اور والیان ریاست سے ربط قائم کرکے انگریز کمپنی کے خلاف ملک گیر بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ مبارز الدولہ کی انگریز دشمنی ایک معمولی واقعہ سے شروع ہوئی ۱۸۱۵ء م ۱۲۳۰ھ میں مبارز الدولہ کے کسی ملازم کا ایک درزی سے جھگڑا ہوگیا جو رزیڈنسی بازار میں رہتا تھا۔ مبارز الدولہ کے حکم سے درزی گرفتار کیا گیا جب اس واقعہ کی اطلاع رزیڈنٹ کو ہوئی تو انھوں نے مبارز الدولہ سے مطالبہ کیا کہ وہ درزی کو رہا کردیں۔ مبارز الدولہ نے اس مطالبہ کو نظر انداز کردیا۔ رزیڈنٹ نے ایک ہزار سپاہیوں کو جن کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا مبارز الدولہ کے محل کو محصور کرنے کا حکم دیا۔ مبارز الدولہ کے سرفروشوں اور انگریز

---

[1] دیگر حالات کے لیے ملاحظہ ہو مضمون "مبارز الدولہ" از جناب حسینی شاہد۔ صورت گراں دکن ص۱۳۱

افواج میں سخت مقابلہ ہوا اور انگریز توپ خانہ کو الٹ دیا گیا۔ رزیڈنٹ کی افواج کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ بعد میں مبارز الدولہ آصف جاہ کے حکم پر گرفتار کر لیے گئے اور گولکنڈہ کے ایک محل میں قید کر دیے گئے۔ پانچ سال بعد ۱۸۲۳ء میں شہر آکر اپنی دیوڑھی واقع کوٹلہ عالی جاہ میں قیام کرنے کی اجازت دی گئی۔

گولکنڈہ سے شہر آنے کے بعد مبارز الدولہ نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔ اور عربوں افغانوں کی ایک بھاری تعداد کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ اپنے محل کی مدافعت کو اور زیادہ مستحکم بنا لیا۔ ان تیاریوں کے بعد انھوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ انگریزی فوجوں نے ان کی دیوڑھی پر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ کرنل اسٹوارڈ نے خود افواج کی نگرانی کی مبارز الدولہ گرفتار کر لیے گئے اور دوبارہ گولکنڈہ میں قید کر دیے گئے گولکنڈہ میں ستّر لاکھ روپیوں سے زیادہ کا خزانہ تھا نواب ناصر الدولہ اس خزانہ کو منتقل کرنا چاہتے تھے مبارز الدولہ نے اس خیال سے کہ یہ خزانہ انگریزوں کے مفاد کے لیے استعمال کیا جائے گا منتقلی خزانہ کی کارروائی میں مقاومت کی۔ ناصر الدولہ نے کوئی کارروائی نہیں کی البتہ بلارم سے فوجیں آئیں اور صف آرا ہو گئیں۔ بڑی مصلحت سے انگریز افسروں نے صورتِ حال پر قابو پایا۔

وہابی تحریک

سنہ ۱۸۳۸ء میں جنرل فریزر رزیڈنٹ بن کر حیدرآباد آئے۔ ان کی آمد کے چند ہی ماہ بعد وہ واقعہ پیش آیا جو وہابی سازش کے نام سے مشہور ہے۔ وہابی تحریک ہندوستانی مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی اولین تحریک تھی۔ اس تحریک کے بانی سید احمد بریلوی تھے، جو پٹنہ سے اس تحریک کو چلا رہے تھے۔ ۱۸۲۰ء تک یہ تحریک بنگال سے شمال مغربی سرحد اور صوبہ اتر پردیش (یوپی) سے مدراس تک پھیل چکی تھی سید احمد بریلوی نے مبارز الدولہ کو انگریزوں کے خلاف اس تحریک میں حصہ لینے کے لیے خطوط لکھے انھوں نے خواہش کی کہ اگر مبارز الدولہ کسی مجبوری کی وجہ سے اس تحریک میں عملی حصہ نہ لے سکیں تو کم از کم مناسب مالی امداد ضرور دیں۔ ۱۸۳۱ء میں سید احمد بریلوی مار ڈالے گئے لیکن وہابی تحریک ختم نہیں ہوئی۔ اس تحریک کے دو قائدین مولوی ولایت علی اور مولوی سلیم ۱۸۳۸ء میں حیدرآباد آئے اور مبارز الدولہ کے مہمان رہے ان قائدین

نے حیدرآباد کے عام شہریوں کے علاوہ بلارم اور رزیڈنسی کی دیسی انگریز فوجوں میں اپنی تحریک کا پرچار کیا۔ اس زمانہ میں مبارزالدولہ نے اپنے کئی مخبر اور قاصد مدراس ۔ بنگلور ۔ کرنول ۔ جودھپور ۔ لاہور ۔ سندھ اور دیگر شہروں اور ریاستوں کو روانہ کیے۔ یہ مخبر فقیروں اور سادھوؤں کے لباس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پیامات لے جاتے تھے اور تحریک کا پرچار کیا کرتے تھے۔ مبارزالدولہ کے اس اہم رول کی بنا پر انھیں "رئیس السلیس" کہا جانے لگا۔ اس زمانہ میں افواہیں گرم ہوئیں کہ روسی وسط ایشیا سے ہندوستان کی طرف بڑھنے والے ہیں کئی شہروں اور دیسی ریاستوں میں یہ منصوبہ بنایا گیا کہ جوں ہی روسی ہندوستان کے قریب پہنچیں ہر شہر اور ریاست میں انگریزوں کے خلاف کارروائی کی جائے۔ کسی نہ کسی طرح رزیڈنٹ حیدرآباد کو مبارزالدولہ اور نواب کرنول کی مراسلت کا پتہ چل گیا۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے کرنول پر حملہ کر دیا۔ اور ادھر مبارزالدولہ اور ان کے کئی ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ آخر نواب کرنول نے ہتھیار ڈال دیے اور گرفتار ہو گئے۔

اس سازش کی تحقیقات کے لیے رزیڈنٹ کی طرف سے ایک کمیشن مقرر ہوا جس کے تین اراکین انگریز تھے اور تین نظام سرکار کے نامزد اراکین تھے۔ ۲۸۔ جون ۱۸۳۹ء سے مارچ ۱۸۴۰ء تک یہ کمیشن کام کرتا رہا۔ جس کے بعد کمیشن کی پوری کارروائی حکومت ہند کے پاس اس سفارش کے ساتھ روانہ کی گئی کہ نواب مبارزالدولہ اور وہابی تحریک کے دیگر قائدین کو مناسب سزائیں دی جائیں۔

اس کمیشن سے متعلق یہ اعتراض کیا گیا کہ دو انگریز اراکین کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا۔ اور کمیشن نے انھیں کے بیانات کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ سرکار نظام کے نامزد اراکین کے متعلق کہا گیا کہ وہ انگریزوں کے زیر اثر تھے اس لیے ان سے انصاف کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔ مقدمات عدالتوں میں عرصہ دراز تک چلتے رہے لیکن کسی عدالت سے کسی رکن تحریک کو سزا نہیں ہوئی۔ ۱۸۵۴ء میں اس تحریک کے کئی قائدین رہا کر دیے گئے لیکن شہزادہ مبارزالدولہ ان چند قیدیوں میں تھے جنھیں موت سے پہلے قید فرنگ سے نجات نہ مل سکی۔

شہزادہ مبارزالدولہ یقیناً وہ پہلے حیدرآبادی تھے جنھوں نے انگریز قوت کے خلاف ملک گیر تحریک میں نمایاں حصّہ لیا اور حیدرآباد میں ایک سیاسی تحریک کی بنیاد ڈالی۔

سکندرآباد

سنہ ۱۷۹۸ء میں آصف جاہ ثانی نے انگریز حکومت کے ساتھ SUBSIDIARY ALLIANCE کا معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کا فوری اثر یہ ہوا کہ برطانوی افواج مستقل طور پر نظام کی ریاست میں مقیم ہو گئیں۔ برطانوی افواج شہر کے شمال میں حسین ساگر کے قرب و جوار میں چھ میل طویل علاقہ جس کو حسین شاہ پور کہا جاتا تھا مقیم ہو گئیں۔ یہ جدید فوجی شہر (لشکر) بعد میں نواب سکندر جاہ کے نام کی مناسبت سے "سکندرآباد" کہلایا۔

سکندرجاہ کا سیر و شکار

نواب سکندر جاہ سیر و شکار کے بہت شائق تھے اور اکثر سرونگر میں قیام کرتے تھے شکار میں عموماً نواب میر عالم، منیر الملک۔ شہریار الملک۔ اعتصام الملک، حسام الملک۔ امجد الملک اور بہرام الملک ہم رکاب رہا کرتے تھے۔ شکار ان مصاحبین میں تقسیم کیا جاتا تھا اور یہ ایک اعزاز تھا[1] نواب سکندر جاہ عربی کے بڑے شائق تھے اور اکثر نواب میر عالم سے عربی زبان میں مخاطب ہوا کرتے تھے۔

رزیڈنٹ کپتان سدنہام نے نواب سکندر جاہ کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ "حضور رزیڈنسی میں تشریف لائیں اور عزت بڑھائیں" معروضہ قبول ہوا۔ سواری مبارک سے رزیڈنٹ کی قیام گاہ کو رونق بخشی گئی۔ کپتان سدنہام نے آتشبازی چھڑائی اور نذر میں ایک ہاتھی اور جواہرات گراں بہا پیش کیے۔

حیدرآباد میں پہلا دارالضرب

ریاست حیدرآباد میں پہلی مرتبہ دارالضرب ۱۸۰۳ء م ۱۲۱۸ھ سکندر جاہ کے زمانہ میں قائم ہوا۔ اس دارالضرب کی ابتدا ایک قدیم شاہی محل واقع سلطان شاہی میں کی گئی۔ اس دارالضرب میں ہتوڑے سے سکے بنائے گئے جاتے تھے۔ سکے حسب ضرورت

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد مولفہ حافظ محمد مظہر ص۵۳

ٹھوک پیٹ کر ایک سائز کے بنائے جاتے تھے۔ لیکن یہ سکے مساوی دائرے اور یکساں نوعیت کے نہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ سرکاری دارالضرب کے علاوہ امرا، جاگیردار اور ساہوکار اپنے اپنے خانگی دارالضرب چلاتے تھے۔ دارالضرب کے اجازت نامے سرکار میں گراں قدر رقم داخل کرکے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ ان خانگی دارالضرب چلانے والوں میں بمبئی کے ساہوکار پستن جی مہر جی قابل ذکر ہیں۔ یہ ساہوکار اورنگ آباد میں اپنا دارالضرب چلایا کرتا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے سکے "پستن شاہی" کہلاتے تھے خانگی دارالضرب کے سکے قسم اور وزن اور ساخت میں مختلف ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے تجارت اور رقمی لین دین میں دشواری ہونے لگی۔ ناصرالدولہ کے دورِ حکومت میں دیوان سالار جنگ کے حکم سے سنہ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۲ھ میں یہ خانگی دارالضرب بند کر دیے گئے اور صرف مملکتی دارالضرب کام کرتا رہا۔ لیکن عوام کو اجازت تھی کہ وہ اپنا سونا چاندی دارالضرب میں داخل کر کے مقررہ معیاری سکے تیار کروالیں۔ سونے کے سکوں کے لیے فی سکہ دو روپے اجرت لی جاتی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں عوام کے لیے عام سکہ سازی کا کام بند کر دیا گیا۔

سکندر جاہ کے عہد میں نوید محل معہ باغ۔ فرحت محل۔ موتی محل (گولکنڈہ) چو محلہ۔ محل سرا۔ راحت محل (متصل حویلی قدیم) عید گاہ جدید، باغ لنگم پلی۔ وغیرہ تعمیر ہوئے۔

سکندر جاہ بہادر کو اچھے دیوان (مدارالمہام) نہیں ملے۔ نواب نظام علی خاں کے انتقال کے ایک سال بعد نواب ارسطو جاہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد ایک مدت تک حیدرآباد کو کوئی موزوں مدارالمہام نہ ملا۔ یوں تو سکندر جاہ کے تمام مدارالمہام انتہائی کمزور تھے۔ لیکن منیرالملک کے عہد وزارت میں حالات زیادہ ابتر بن گئے۔ ان ابتر حالات کا انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ انگریزی چھاؤنیاں وسعت پاتی گئیں۔ چھاؤنیوں کا بار ریاستی خزانہ پر بڑھ رہا تھا۔ ریاست کا خرچ بڑھ رہا تھا لیکن آمدنی کے کوئی ذرائع نہیں تھے۔ نہ بجٹ تیار ہوتا نہ خرچ پر نگرانی رکھی جاتی تھی۔ انگریزوں کا قرض بھی بڑھتا گیا جب مطالبہ شدید ہوگیا تو برار کا زرخیز علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔

سکندر جاہ کی صاحب زادی فیروز النسا بیگم نے ۲۹۔ محرم ۱۲۴۳ھ م ۱۸۲۸ء انتقال کیا۔ اس صدمہ سے سکندر جاہ کو تپ دق ہوگیا۔ حکیم شفائی خاں کلاں۔ حکیم مسیح الزماں خاں۔ حکیم رضا علی خاں۔ حکیم تاج الدین چینا پٹنی۔ رام جٹا وینکٹ راؤ طب مصری عیدگاہی نے مل کر علاج کیا لیکن ۱۷۔ ذیعقدہ سنہ ۱۲۴۴ھ م ۱۸۲۹ء ۲۶ سال کی حکمرانی کے بعد ۴۲ سال کی عمر میں سکندر جاہ نے انتقال کیا۔ حسب رواج محل سرا کی دیوار جو مکہ مسجد کی درمیان تھی توڑی گئی اور اس جانب سے جنازہ مسجد میں لایا گیا۔ اور صحتیں مکہ مسجد میں تدفین عمل میں آئی۔

ماہ لقا بائی چندا[1] ایک ممتاز مغنیہ اور صاحب دیوان شاعرہ

ماہ لقا بائی چندا کی پہلو دار شخصیت نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی اور ان کے بعد نواب سکندر جاہ آصف جاہ سوم کے دور میں بڑی چھائی رہی۔ شاہانِ وقت کے علاوہ مدارالمہامین سلطنت نواب ارسطو جاہ۔ نواب میر عالم اور راجہ چندو لعل شاداں نے اس مغنیہ، شاعرہ اور طوائف کی خوب سرپرستی کی اور اس نے انتہائی ٹھاٹ باٹ سے اپنی زندگی گزاری۔

رکن اللہ محل احتشام جنگ

چندا بی بی کی تعلیم و تربیت مہتاب کنور بائی (صاحب جی صاحبہ) کے زیر نگراں ہوئی۔ موسیقی کی تعلیم کے لیے استاد خوش حال خاں کلاونت مقرر کیے گئے جو استاد تان سین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ صاحب جی صاحبہ کی توجہ کی بنا پر چندا بی بی کو ہر فن میں کمال حاصل ہوگیا۔ وہ جہاں موسیقی میں یکتا تھی وہیں اپنے سلیقہ اور آن بان میں اپنا کوئی ثانی نہ رکھتی تھی۔ نواب میر عالم خاں آصف جاہ ثانی کے الطاف و عنایات

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔

"حیات ماہ لقا" مرتبہ مولوی غلام حمدانی خاں گوہر مولف تزک محبوبیہ و دربار آصف

سنہ اشاعت ۱۹۰۶ء م ۱۳۲۴ھ نظام المطابع

اس پر بے حد رہا کرتے تھے۔ اکثر سیر و شکار یہاں تک کہ میدان جنگ میں وہ آصف جاہ ثانی کے ساتھ رہا کرتی تھی ۱۱۹۳ھ میں سفر کولاس، ۱۱۹۷ھ میں تسخیر نرمل، ۱۲۱۱ھ میں مہم پانگل کے موقعہ پر یہ "پیکر نازو ادا" ہاتھی پر سوار آصف جاہ ثانی کے ہم رکاب رہی تھی۔

مہم پانگل میں چندا کے ساتھ رہنے کی وجہ سے آصف جاہ دوم اس کے اور بھی زیادہ قدرداں ہوگئے۔ سنہ ۱۲۱۱ھ میں ایک جشن منعقد ہوا، تمام امرا، منصب دار خطابات، علم و نقارہ سے سرفراز کیے گئے۔ چندا بی بی کو "ماہ لقابائی" کا خطاب۔ نوبت علم و نقارہ سرفراز کیے گئے۔ حضوری میں جب اس کا مجرا ہوا تو سرکار سے مجرا کا ایک ہزار روپے انعام پاتی۔ آصف جاہ دوم کے انتقال کے بعد آصف جاہ سوم نواب سکندر جاہ کے عنایت اس کو حاصل رہے اور اکثر چوبدار شاہی خیریت و مزاج پرسی کے لیے آتا رہتا تھا۔ ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد ماہ لقابائی کے تعلقات مدارالمہام وقت نواب میر عالم سے قائم ہوگئے۔ وہ خود شاعر تھے۔ اس لیے ماہ لقابائی کی صحبت لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی سے محظوظ ہوتے تھے۔ اپنی والہانہ محبت سے متاثر ہوکر میر عالم نے ماہ لقابائی چندا کا سراپا اور کچھ داستان حسن و عشق ایک مثنوی میں بیان کر گئے ہیں۔ میر عالم کی یہ مثنوی اس زمانہ میں کافی مشہور ہوئی۔ اس مثنوی کی زبان بڑی سلیس، شستہ اور کلام میں آمد و بے ساختگی بھی خوب ہے۔ اس کے علاوہ یہ مثنوی موافق مزاج زمانہ بھی تھی۔ خود چندا نے اس مثنوی کو یہاں وہاں شہر میں مشہور کرنے کی کوشش کی تاکہ درباری امراء اور عوام میں اس کا مرتبہ بلند ہو سکے۔ اس میں شک نہیں کہ چندا کو مقبول بنانے میں نواب میر عالم کی اس مثنوی نے بڑا کام کیا۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:-

اے ماہ سپہر روشنائی
سر تا پائے تو دلربائی

اے مردم دیدہ محبت
سر تا قدمت طلسم الفت

شکل تو بہ کلک دل مصور
جسم تو بہ آب خان مخمور

تصویر تو از فرنگ حسن است
نقش تو شریک رنگ حسن است

اے حسن تو دلربائی عشق
آئینہ خود نمائی عشق

تا حسن تو ناخنم بدل زد
عشقت رہ عیش متصل زد

از شوق تو شد چناں جہاں شور
از رگ رگ من عیاں چو طنبور

شور تو عیاں نہ بر زبانم
سوز تو نہاں بہ مغز جانم

از شعلہ حسنت اے دل آرا
در عشق بہ سوختم سراپا

اے جلوہ فرش و جاں خریدار
اے غمزہ متاع و عشوہ بازار

اے باد صبا توی وفا سنج
آگاہ خبر ز راحت و رنج

بیماری تو شفائے جانہا
غم خوری تو دوائے جانہا

از راہ وفا وے گر آری
بر منزل ماہ من گزاری

یک رہ ز کرم تو اے وفاکش
شرح ہجراں کہ کردہ گوش

رازے کہ بہ گوش دل شنیدی
رازے کہ عیاں بہ چشم دیدی

پنہاں پنہاں بہ گوش آں ماہ
القصہ بگو وقعہ کوتاہ

(از "میر عالم" مولفہ سراج الدین طالب)

چندا کی شاعری ایک منھ چڑھی عورت کا کلام

ماہ لقا بائی چندؔا اردو کی پہلی شاعرہ ہے جس نے ایک مکمل دیوان اپنی یادگار چھوڑا[1] وہ تفریحاً شعر کہا کرتی تھی اس لیے اس کی شاعری میں نہ تو کوئی خاص پیام نظر آتا تھا اور نہ خاص فنی خوبی۔ اردو اس کی زبان تھی موسیقی کی تعلیم باضابطہ پائی تھی اور خوب کمال پیدا کیا تھا۔ زندگی تمام نعمتیں تمام راحت اور آسائش اسے حاصل تھیں اس کا کلام ایک ایسی منھ چڑھی عورت کا کلام معلوم ہوتا ہے جو حسن و شباب کے نشہ میں چور اور اپنی فاتحانہ قوتوں پر حد درجہ مغرور و نازاں ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا دل واقعی اور دائمی محبت کے لیے بے چین ہے۔ شوخی۔ شرارت اور عریانی کے مضامین اس نے اپنے کلام میں بڑے احتیاط سے موزوں کیے ہیں۔ اس نے ۱۲۲۶ھ میں اپنا دیوان مرتب کیا۔ جس میں ایک سو پچیس غزلیں ہیں اور ہر غزل پانچ اشعار کی ہے۔ جو پنجتن کی رعایت سے کہے گئے ہیں۔

ماہ لقا بائی چندا کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ سینٹرل لائبریری حیدرآباد (کتب خانہ آصفیہ) میں موجود ہے۔ اس کے دیوان کا ایک نسخہ مولوی عبدالحق صاحب کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ غالباً اس کے دیوان کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی موجود ہے۔ وہ نسخہ خود چندا نے ایک ناچ کے موقعہ پر کپتان ملکم کو سنہ ۱۷۹۹ء میں بطور نذر پیش کیا تھا۔

---

[1] تفصیلی کلام کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو
"گلزار ماہ لقا" مرتبہ مولوی غلام صمدانی خاں گوہر
نظام المطابع پریس۔ سنہ اشاعت ۱۳۲۴ھ

چنداؔ حضرت ایماں سے اصلاح سخن لیا کرتی تھی۔ لیکن اس کی شاعری میں ایماں کا رنگ حاوی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چنداؔ کی شاعرانہ عظمت نے اس عہد کے بعض شعرا اور امرا پر خاص اثر ڈالا ہے۔ چنداؔ کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کلام میں "نسوانیہ" جھلک موجود ہے۔ ضمائر تانیث کا استعمال کیا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:۔

سو جان سے ہوگئی وہ تصدق میرے مولا
چنداؔ کی جو کونین میں امداد کرے گا

.....

مثل بلبل جو اسے دیکھے غزل خواں کیوں نہ ہو
یا علی چنداؔ تیرے گلشن سے پاتی ہے بہار

......

ثابت قدم ہے جو کوئی چنداؔ کے عشق میں
صف میں وہ عشق بازوں کی سالار ہی رہا

......

خوب سجتی ہے تیرے بر میں یہ پوشاک سفید
دے کے حور نکلے ہے جوں نور سحر میں غوطہ

......

دل میں رہتا ہے میرے گرچہ وہ طفل بدخو
اشک کی طرح نہ ٹھیرا نہ کوئی دم آنکھوں میں

......

شاہ و گدا تو دنگ ہوئے تیرے رقص پر
عاشق ہے نیم جاں نئی لیے ہے تان بھر

......

گرچہ عالی قدر ہے وہ بے مثال اس دھر میں
پر خدا آغوش میں لا دے ہماری ایک بار

......

اپنے حسن و شباب کی برقراری کے لیے یوں دعا کرتی ہے:۔

گرمی وہ ہوئے حسن میں چندا کے یا علی
جلوے کو اس کے دیکھ کے بس لوٹ جائے برق

......

چندا کو بخش یا علی اپنی جناب سے
رتبہ جو دو جہاں میں ہو افتخار کا

......

یا علی کیجیے فردوس میں چندا کو عطا
لعل کا قصر کہ ہوئے جیسے باب یاقوت

شاعرانہ تعلی ملاحظہ فرمائیں:۔

چندا کے دیکھنے ہی کی خواہش کرے جو کوئی
رکھتا ہو وصف اپنے میں عزت و جاہ کا

......

معاملہ بندی دیکھیے:۔

ہم جو شب کو ناگہاں اس شوخ کے پالے پڑے
دل تو جاتا ہی رہا اب جان کے لالے پڑے

......

خود صید ہو گئے ہیں اب دام میں کسی کے
کرتے تھے آپ باہم تازہ شکار ہر شب

......

غمزہ و ناز ادا شیوہ ہے خوبروں کا مگر
ہر سخن میں روٹھ جانا کون سا دستور ہے

......

ماہ لقا بائی کے قدرداں راجہ چندو لعل شاداں خود ایک پرگو شاعر اور شعرا کے بڑے سرپرست تھے۔ ان کی بارہ دری میں تقریباً ہر شب مشاعرہ یا موسیقی کی محفلیں

منعقد ہوا کرتی تھیں ۔ایک شب آپ کی دیوڑھی میں چندا کا مجرا تھا۔چندا کی ایک "ادا خاص" یہ تھی کہ وہ کسی بھی شعر کے جواب میں اپنا فی البدیہ شعر پڑھ دیا کرتی تھی۔راجہ چندو لعل نے اس محفل میں یہ مطلع پڑھا:۔

"بے چین کہاں جب سے میری آنکھ لگی ہے
ملنے کی نجومی تو بتا کون گھڑی ہے"

ماہ لقا چندا نے جواباً اپنا شعر کہا:۔

پہلے ہی سے چالاک میرے دل کو ستامت
اے مرغ سحر چپ ہو، ابھی رات پڑی ہے

حاضرین محفل نے "مرغ سحر" کی چوٹ کا خوب لطف لیا۔

ماہ لقا بائی چندا کا کتب خانہ

ماہ لقا ہمیشہ مکلف لباس سے آراستہ و پیراستہ رہتی تھی۔ بر وقت طلبی بارگاہ خسروی میں حاضر ہوتی تھی۔ باقی اوقات کتب کے مطالعہ میں گزار دیتی تھی۔اس کا کتب خانہ ہر علم و فن کی کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔چوں کہ اس زمانہ مطبع نہ تھا۔ اس لیے اکثر کتابیں نقل کر لی جاتی تھیں۔ ماہ لقا کے پاس کئی کاتب اسی کام کے لیے ملازم تھے۔محرم کے مہینے میں وہ لذیذ غذا کو ترک کرتی تھی اور ہر عاشور خانہ کو نذر گزرانتی تھی۔ ماہ لقا چندا کا محل ایلچی بیگ کی کمان میں واقع تھا جس کے تمام طاق و داق شقف و لنگر مہذب و مطلا تھے۔محل کے محاذی ایک عاشور خانہ تعمیر کیا گیا تھا اور عاشور خانہ کے مقابل نقار خانہ قائم کیا گیا تھا۔ عاشور خانہ میں سیاہ مخمل کا فرش بچھا رہتا تھا۔ ماہ لقا چندا کو عمارتوں کی تعمیر کا بے حد شوق تھا۔کوہ مولا پر اس نے اپنا مقبرہ تقریباً ایک لاکھ روپے کے صرفہ سے تعمیر کیا تھا۔ حسینی علم۔ پرانا پل روڈ پر درگاہ حضرت موسیٰ قادری سے متصل اس نے ایک مختصر لیکن خوب صورت مسجد تعمیر کرائی۔ اس مسجد کے دروازے پر ایک کتبہ ہے جس پر مسجد کا مادہ تاریخ "ثانی بیت الحرام" کندہ ہے جس کے بموجب اس مسجد کا سنہ تعمیر ۱۲۰۳ھ ہے۔[1]

---

[1] فرخندہ بنیاد حیدرآباد مولفہ رائے ست گرو پرشاد صاحب ص۱۲۴

غلام حسین خاں جوہر (منصبدار) نے ماہ لقا کے کتب خانہ سے استفادہ کر کے ۱۲۲۸ھ میں ایک ضخیم فارسی تاریخ مرتب کی اور چندا کے نام پر اس کو "ماہ نامہ" سے موسوم کیا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ سینٹرل لائبریری حیدرآباد (سابق کتب خانہ آصفیہ) میں موجود ہے۔[1] یہ تاریخ خود ماہ لقا کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اس تاریخ میں چندا کے خاندانی حالات اور اس کی زندگی کے اہم واقعات درج ہیں۔ اس تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ماہ لقا چندا کا جداعلا چغتائی برلاس سے تھا۔

ماہ لقا بائی چندا باکمال ادیبوں اور شعرا کی مدد اور سرپرستی کیا کرتی تھی۔ حافظ محمد تاج الدین مشتاق دہلوی جو خواجہ میر درد کے تلامذہ میں سے تھے جب حیدرآباد آئے تو چندا نے ان کی مہمانداری کی اور پھر چندا ہی کے توسط سے مشتاق راجہ چندو لعل شاداں کے دربار میں باریاب ہو کر رسوخ پا سکے۔ مشتاق کو راجہ صاحب کی جانب سے دو سو روپیہ ماہوار ملا کرتے تھے۔ حافظ تاج الدین مشتاق وہی باکمال شاعر تھے جن سے حضرت شمس الدین فیض اصلاح سخن لیا کرتے تھے۔

ماہ لقا بائی کا انتقال ۵۷ سال کی عمر میں ہوا۔ صاحب گلزار آصفیہ نے ماہ لقا کا سنہ وفات ۱۲۳۷ھ ظاہر کیا ہے اور کئی تذکروں میں اس بیان کا حوالہ ملتا ہے لیکن ماہ لقا کے مقبرہ میں مزار پر جو کتبہ تاریخ ہے اس سے سنہ وفات ۱۲۴۰ھ نکلتا ہے۔

ہاتف غیبی ندا داد تاریخ او

راہی جنت شدہ ماہ لقا دکن (۱۲۴۰ھ)

ماہ لقا کے تمول کا یہ حال تھا کہ جب اس کے انتقال کے بعد اس کی دولت کا جائزہ لیا گیا تو عمارات، باغات کے علاوہ نقد و جنس سے ایک کروڑ روپے کا شمار ہوا۔ مواضعات سید پلی۔ چندا پیٹ علی باغ۔ اڈیکمیٹ۔ حیدر گوڑہ اس کی جاگیر میں شامل تھے۔

چندا کی تمام عمر بڑے طمطراق سے گزری، پیدا ہونے کے بعد سے وزیروں اور امیروں کی گود میں کھیلتی رہی اور امرا دکن ہی نے اسے قبر میں اتارا یہ اعزاز چندا سے پہلے یا بعد اور کسی شاعرہ یا مغنیہ کو نہ مل سکا۔[2]

---

[1] مضمون جناب تمکین کاظمی، صورت گراں دکن ص۲۴

[2] " " " " " " "

تیسرا دور

۱۲۲۵ھ تا ۱۳۰۰ھ
یعنی ۱۸۲۵ء تا ۱۸۸۴ء

۱۹- ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ م ۲۱- مئی ۱۸۲۹ء کو جب سکندر جاہ آصف جاہ سوم نے جب انتقال کیا اس وقت نواب ناصر الدولہ پرانی حویلی میں مقیم تھے۔ راجہ چند ولعل نے طالب الدولہ کو کوتوال بلدہ کے مشورہ سے آپ کے نام کی منادی کرادی۔ فاتحہ سوم کے بعد ناصر الدولہ حویلی قدیم سے بہ سواری جلوس روانہ ہو کر نعمت خانہ خلوت مبارک میں زیر شامیانہ طلائی مسند نشیں ہوئے۔ اراکین دولت و سفیر سرکار عظمت مدار مسٹر مارٹن نے شمس امرا بہادر، نواب منیر الملک۔ راجہ چند ولعل کے ساتھ نذریں پیش کیں اور اس کے بعد جدید عہد نامہ حسب عہد نامہ سابقہ سرکار انگریز کمپنی سے کیا گیا۔

گذشتہ دور کی طرح نواب ناصر الدولہ کی مسند نشینی کے بعد بھی نواب منیر الملک برائے نام مدار المہام رہے۔ لیکن تمام اختیارات راجہ چند ولعل پیشکار کو حاصل تھے۔

شہر میں بد نظمی اور شورشیں

نواب ناصر الدولہ کے زمانہ میں عرب، حبشی اور روہیلے کافی طاقتور ہو گئے تھے۔ ان کی آپسی چشمک اور امرا کی تائید میں ان کے جھگڑوں کی بنا پر شہر میں فساد ہوا کرتے تھے ناصر الدولہ عرب، پٹھان اور حبشیوں کے ان جھگڑوں سے تنگ آ چکے تھے انھوں نے

راجہ رنجیت سنگھ والی پنجاب سے خواہش کی کہ وہ وفادار سکھوں کی ایک فوج کو ان کی مدد کے لیے حیدرآباد روانہ کریں[1] نظام کی خواہش کے بموجب راجہ رنجیت سنگھ نے سکھوں کی ایک جماعت کو حیدرآباد روانہ کیا۔ حیدرآباد میں شہر پناہ سے باہر الوگوڑہ اور عطاپور میں سکھوں کے قیام کے لیے اراضی دی گئی۔ سکھوں نے یہاں اپنے سرداروں کے نام پر مختلف چھاؤنیاں قائم کیں۔ جن میں قابل ذکر حسب ذیل چھاؤنیاں ہیں ۔

۱۔ چھاؤنی دھابہ دیال سنگھ۔
۲۔ چھاؤنی مہتاب سنگھ ۔
۳۔ چھاؤنی اکال بنگا پنج پیارے ۔
۴۔ چھاؤنی سواران۔
۵۔ چھاؤنی سنگت برہم بالا۔ چھاؤنی آسانگہہ۔ چھاؤنی سین سنگھ۔ وغیرہ ۔

الوگوڑہ اور عطاپور میں دی ہوئی اراضی آج بھی سکھوں کے قبضہ میں ہیں ہر سال ہولی اور دسہرہ کے موقعہ پر سکھوں کے بڑے بڑے جلوس گولی گوڑہ اور گرودوارہ چار محل سے نکل کر سکھ چھاؤنی عطاپور پر ختم ہوتے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں سکھ افواج کی تخفیف کی گئی۔

عرب، پٹھان اور سکھوں کی زیادتی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنے فرض کی ادائی اور طمانیت میں جاگیر اور تعلقہ جات کو رہن رکھ کر قرض دیتے تھے۔ پھر مالگزاری کی وصولی وحشیانہ طریقہ پر کی جاتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ایک جوان وقت واحد میں چار چار امیروں کے پاس ملازم ہوتا اور ہر امیر سے اپنی پوری پوری تنخواہ طلب کرتا تھا کبھی کرانہ کی دوکان پر عرب، پٹھان اور سکھ کرانہ کی خریداری کے لیے پہنچ جاتے اور کرانہ کی خریداری میں اپنی اولیت کا حق جتاتے تھے ۔ اگر فریق مخالف اس اولیت سے انکار کرتا تو پھر بازار میں فساد، ہنگامہ اور لوٹ شروع ہو جاتی تھی۔

بتاریخ ۷۔ شعبان ۱۲۴۸ھ کو نواب منیر الملک نے انتقال کیا۔ انتقال کے وقت

---

[1] تاریخ ریاست حیدرآباد دکن ص۱۵۸ مولفہ جناب نجم الغنی صاحب

نواب منیر الملک نے ۲۵ لاکھ روپے کا قرضہ چھوڑا تھا۔ نواب ناصر الدولہ نے بہ ذات خود قرضہ کی ادائی کی اور ان کی کل جائداد مع تالاب میر عالم بطور کفالت لے لی۔ لیکن ۱۲۶۳ھ میں مکفولہ جائداد ان کے فرزند نواب سراج الملک کو عطا کر دیا۔

نواب منیر الملک کی پہلی زوجہ نفیسہ بیگم دختر نواب میر عالم تھیں ان کے بطن سے ایک فرزند عبداللہ تولد ہوئے۔ نفیسہ بیگم کے انتقال کے بعد نواب میر عالم کی دوسری صاحبزادی صاحب بیگم کا عقد نواب منیر الملک سے کیا گیا۔ جن سے دو لڑکے شجاع الدولہ اور میر عالم علی خاں سراج الملک تھے۔ شجاع الدولہ کا انتقال کمسنی میں ہو گیا۔ اس لیے سراج الملک اپنے والد نواب منیر الملک کے وارث ہوئے۔ سراج الملک عربی فارسی اور علوم مشرقیہ میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ کتب خانہ سالار جنگ کی کئی نایاب کتابوں میں سراج الملک کی مہریں ثبت ہیں۔ نواب منیر الملک کے انتقال کے بعد عہدہ وزارت پر سراج الملک کا فوری تقرر نہ ہو سکا۔ کیوں کہ دربار آصفی اور رزیڈنسی میں راجہ چندو لعل اپنا اثر جمائے ہوئے تھے۔ نواب منیر الملک کے انتقال کے بارہ سال بعد ان کا تقرر بہ حیثیت منصرم مدار المہام کیا گیا۔ گورنر جنرل کی خاص سفارش پر ۱۸۵۱ء میں انھیں مستقل مدار المہام بنایا گیا۔ اس طرح سراج الملک اس خاندان میں دوسرے مدار المہام تھے۔ شجاع الملک کی شادی فخر الملک کی دختر زینت النسا بیگم سے ہوئی تھی جن سے ایک فرزند نواب میر تراب علی خان تولد ہوئے۔ میر تراب علی خاں کی عمر جس وقت دو ڈھائی سال کی تھی کہ آپ کے والد شجاع الملک نے انتقال کیا۔ اور جب چار سال کے ہوئے تو دادا نواب منیر الملک انتقال کر گئے اس طرح میر تراب علی خاں کی پرورش اور تعلیم ان کے چچا نواب سراج الملک کی سرپرستی میں انجام پائی۔

نواب منیر الملک خدمت مدار المہامی پر تقرر سے قبل اس دیوڑھی میں قیام کرتے تھے۔ جو پتھر گھٹی کے قریب دیوڑھی مکرم الدولہ کے نام سے موسوم ہے سراج الملک مدار المہام ہوئے تو انھوں نے موجودہ دیوان دیوڑھی میں قیام کیا اور حصہ آئینہ خانہ (جو ابھی کچھ سال پہلے تک موجود تھا) تعمیر کیا۔ اس طرح دیوڑھی کی عمارتیں ۱۸۸۴ء کے بعد تعمیر ہوئیں۔

نواب سر سالار جنگ مختار الملک نے دیوان دیوڑھی کو کافی وسعت دی اور

نئی سرکاری دفاتر دیوان دیوڑھی کے علاقہ میں منتقل کر دیے گئے تاکہ مدار المہام کی راست نگرانی میں رہ سکیں۔

مہاراجہ راجہ چندو لعل شاداں

۱۲۴۸ھ میں نواب منیر الملک نے انتقال کیا تو راجہ چندو لعل مدار المہام سلطنت مقرر کیے گئے۔ راجہ چندو لعل خاندان پیشکاری سے تعلق رکھتے تھے جو دربار آصفیہ میں اپنا خاص مرتبہ رکھتا تھا۔ اس خاندان کا سلسلہ راجہ ٹوڈر مل سے ملتا ہے[1] جو ابراہیم شاہ لودھی شیر شاہ لودھی اور اس کے بعد شہنشاہ اکبر کے وزیر مال تھے اور اپنی فہم و فراست اور اصلاحات سے شاہی خزانہ کو مستحکم بنا دیا تھا۔ اسی راجہ ٹوڈر مل کی پانچویں پشت میں رائے مولچند تھے۔ جب نواب آصف جاہ اول دکن میں اپنی ریاست قائم کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو چند واقف کار حضرات نے آصف جاہ کو مشورہ دیا کہ نئی ریاست کے مالی انتظام کے لیے رائے مولچند کو ساتھ لینا چاہیے۔ اس مشورہ کو آصف جاہ اول نے پسند فرمایا اور رائے مولچند آصف جاہ اول کے ہم رکاب دکن چلے آئے[2]۔ راجہ مولچند کے سپرد خدمت کروڑگیری کی گئی جس پر وہ تاحیات کارگزار رہے۔ رائے مولچند کے انتقال کے بعد یہ خدمت ان کے فرزند راجہ لچھمی رام کو عطا کی گئی[3] نواب ناصر جنگ نواب صلابت کے دور میں وہ اسی خدمت پر کارگزار رہے۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دور میں دیوان وقت راجہ پرتاپ ونت وٹھل داس سے راجہ لچھمی رام کے تعلقات بہتر نہ تھے۔ اور وہ گوشہ نشین ہو گئے۔ راجہ پرتاپ ونت کے بعد جب نواب رکن الدولہ دیوان ریاست مقرر ہوئے تو شمشیر جنگ کی تجویز پر راجہ لچھمی رام دوبارہ اپنی خدمت پر مقرر کیے گئے۔ راجہ لچھمی رام کے پانچ فرزند رائے نانک رام۔ رائے نارائن داس رائے رگنا تھ داس رائے بھوانی داس اور

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد مولفہ حافظ محمد مظہر صاحب ص۲۸

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 ص۲۹

[3] 〃 〃 〃 〃 〃 〃

رائے موہن لعل تھے۔ رائے نانک رام چونکہ ان سب میں بڑے تھے اس لیے خدمت کروڑگیری پر مامور کیے گئے اور تقریباً سترہ سال تک وہ اس خدمت پر کام کرتے رہے[1] رائے نانک رام بڑے مذہبی امیر تھے اور بعد میں راجہ چندو لعل نے اس سے بہت کچھ فیض حاصل کیا۔ راجہ چندو لعل رائے نارائن داس کے بڑے فرزند تھے[1] چندو لعل کی عمر دس سال کی تھی کہ ان کے والد رائے نارائن داس نے انتقال کیا۔ راجہ صاحب کی تعلیم و تربیت رائے نانک رام کی خاص نگرانی میں ہوئی اور وہ ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد انھوں نے ملازمت کے لیے کوشش شروع کی۔ نواب شمشیر جنگ نے انھیں اپنی پیشی میں رکھا اور اپنے علاقے کا کاروبار سپرد کیا۔ رائے نانک رام کے انتقال کے بعد ان کے خاندانی حالات ابتر ہو گئے اس لیے چندو لعل نے نواب شمشیر جنگ کی ملازمت کو بہت غنیمت سمجھا۔ نور محمد کے زمانہ میں راجہ چندو لعل کو سبزی منڈی کی محرری پر مقرر کیا گیا اور انھوں نے اس معمولی خدمت کو بڑی خوشی سے انجام دیا۔ وہ خود صبح سے شام تک منڈی میں رہتے۔ ان کے ساتھ ایک منشی بغل میں حسابی کھاتے لیے رہتا تھا۔ منڈی کے اندراجات کے بعد جب وہ اپنے مکان واپس ہوتے تو اپنی تنخواہ لوگوں میں بطور خیرات دے دیا کرتے تھے اور گھر پہنچنے تک ایک حبہ سیاہ بھی ان کے جیب میں نہ رہتا تھا۔ راجہ چندو لعل کے کام اور مستعدی کا حال جب نواب بخشی بیگم محل غفران مآب کو ہوا تو راجہ کو "بلہ" کی خدمت پر مقرر کیا۔ اس کے بعد راجہ چندو لعل درجہ بہ درجہ ترقی کے منازل طے کیے نواب ارسطو جاہ بھی آپ کی صلاحیتوں کے قابل ہو گئے اور بہت جلد حضور نظام کی منظوری سے علاقہ مکتھل۔ کویل کنڈہ۔ مغل گڈھ اور امرآباد کے انتظامات کی کامل ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں راجہ چندو لعل کو عہدی خطاب راجگی کے ساتھ چار ہزار سوار اور چار ہزار پیادے ماتحتی میں دیے گئے۔ ان اعزازات کے ساتھ آپ کو گنجی کوٹہ اور کڑپہ کے انتظامات کے لیے روانہ کیا گیا۔ انھوں نے راجہ جٹپول کو اپنا ہم خیال بنایا۔ اور ان کی مدد سے کئی سرکش سرداروں کو مطیع بنایا۔ درباری سازشوں کی بنا پر آپ سے

---

[1] "مہاراجہ کشن پرشاد" مولفہ حافظ محمد مظہر صاحب ص۱۳۹

حساب فہمی کی گئی ۔ لیکن آپ بے لوث ثابت ہوئے ۔ اس حساب فہمی کے بعد بطور خوشنودی نواب شمس الامرا کی جمعیت کی پیشکاری آپ کو عطا کی گئی جب راجہ لکھپت رام ولد نانک رام نے انتقال کیا تو خدمت کروڑ گیری بھی آپ کے سپرد کی گئی ۔ نواب سکندر جاہ نے راجہ صاحب کے انتظام سے متاثر ہو کر انھیں افواج آصفیہ کا پیشکار مقرر کیا ۔ نواب میر عالم راجہ چندو لعل پر بہت مہربان تھے ۔ نواب میر عالم کے دور وزارت میں خدمت پیشکاری راجہ رگھوتم راؤ سے لے کر آپ کو عطا کی گئی ۔ اس خدمت پر فائز ہونے کے بعد آپ نے اپنے چچازاد بھائی راجہ بالکشن کو نوشمس الامرا کی خدمت میں پیش کیا اور انھیں نیابتاً اپنی خدمت کروڑ گیری پر مامور کرایا ۔ نواب منیر الملک کے دور وزارت میں مالی و ملکی امور آپ ہی کے مشورہ سے انجام پاتے تھے ۔ نواب منیر الملک نے راجہ کو اپنا مددگار خاص بنالیا اور مالی و عدالتی امور ان کی رائے پر چھوڑ دیے اور بغیر مشورہ راجہ صاحب کوئی کام انجام نہ دیتے تھے ۔ ۱۲۳۵ھ میں نواب سکندر جاہ نے راجہ چندو لعل کو خطاب مہاراجہ ۔ پالکی جھالردار اور نوبت سے سرفراز کیا ۔ ان نوازشات کے علاوہ ایک کروڑ روپے بطور قرض عنایت کیا ۔ نواب سکندر جاہ کے انتقال کے بعد جب ناصرالدولہ مسند نشیں ہوئے تو انھوں نے اس قرضہ کو کاملاً معاف کر دیا ۔ ۱۲۴۵ھ میں نواب ناصرالدولہ نے خطاب راجہ راجایان سے سرفراز کیا ۔ نواب ناصرالدولہ کئی مواقع پر راجہ چندو لعل کی ڈیوڑھی پر تشریف لائے ۔ راجہ چندو لعل کی داد و دہش کا نہ تو کوئی حساب تھا اور نہ ٹھکانہ ۔ ریاست کا خرچ آمدنی سے کہیں زیادہ تھا جمعیت فوج اور صاحب زادوں کی تنخواہیں کئی سال سے چڑھ گئیں تھیں جس کے لیے اکثر و بیشتر عرب ۔ پٹھان ۔ حبشی اور سکھ فساد کیا کرتے تھے اس معاشی بحران کی وجہ سے کیا امیر اور کیا غریب سب ہی یکساں پریشان تھے ۔ آخر جنرل فریزر رزیڈینٹ بن کر حیدرآباد آئے ۔ انھوں نے کنٹیجنٹ کے کثیر مصارف اور چندو لعل کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست گورنر جنرل کے پاس پیش کی سنہ ۱۸۴۳ء میں جنرل فریزر کے اصرار کی بنا پر راجہ چندو لعل خدمت سے معزول کر دیے گئے ۔ راجہ چندو لعل کے لیے تیس ہزار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا ۔ راجہ صاحب کے خرچ اور فیاضی کے لیے یہ رقم انتہائی ناکافی تھی ۔ اس لیے پیشگی ادایات کے بعد وظیفہ کی

رقم صرف دس ہزار روپے رہ گئی۔ جب اخراجات کافی بڑھ گئے تو آپ کا تمام سامان اور کارخانہ جات بغرض ضبط کر لیے گئے۔ آخر ۸۔ ربیع الاول ۱۲۶۱ھ م ۵۔ اپریل ۱۸۴۵ء کو ۸۶ سال کی عمر میں راجہ چندو لعل نے انتقال کیا۔

راجہ چندو لعل کی سیاسی حکمت عملی

حیدرآباد کے دربار میں راجہ چندو لعل کوئی پینتیس سال چھائے رہے۔ وہ مدار المہام تھے لیکن خود کو پیشکار ہی کہلواتے تھے۔ ہندوستانی سیاست میں یہ بڑا نازک زمانہ تھا۔ مرہٹوں کی متحدہ قوت ٹوٹ چکی تھی۔ پیشوا کا اثر و اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہلکر مجبور ہو چکے تھے۔ علاقہ برار راجہ راگھوجی بھونسلے کے قبضہ میں تھا۔ راگھوجی بھونسلے سے چھین کر یہ ریاست حیدرآباد کا علاقہ بنا دیا گیا۔ پنڈاریوں کا زور ٹوٹ چکا تھا اور ان کے سردار کو ٹونک کے علاقہ پر قناعت کرنا پڑا۔ بھرت پور کے مستحکم قلعہ پر انگریز کمپنی کا پرچم اڑ رہا تھا۔ نیپال اور برما میں انگریزوں کی بالادستی مان لی گئی تھی۔ مغل حکمراں صرف دلی تا پالم کے حکمراں رہ گئے تھے۔ راجہ چندو لعل نے ان حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور محسوس کیا کہ ریاست کی بقا اور والی ریاست کا مفاد اس بات میں ہے کہ وہ انگریز سیلاب کے بہاؤ کا ساتھ دیں۔ اس حکمتِ عملی کے تحت وہ ہمیشہ نظام اور انگریز رزیڈنٹ کے درمیان خوشگوار تعلقات کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

چندو لعل شاداں کی علم دوستی اور شاعری

مہاراجہ کو شعر و شاعری سے فطری دلچسپی تھی۔ وہ اردو اور فارسی میں اعلا درجہ کے اشعار موزوں کرتے تھے۔ ان کا تخلص شاداں تھا۔ ان کی علم دوستی اور ادب نوازی کے چرچے سن سن کر شمالی ہند کے کئی بلند مرتبہ شاعر حیدرآباد چلے آئے اور بہت سے یہاں رہ گئے۔ ان میں شاہ نصیر اور شاہ حفیظ قابل ذکر ہیں۔ راجہ چندو لعل نے استاد ذوق اور ناسخ کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی لیکن ذوق نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ؎

گرچہ ہے ملک دکن میں آج کل قدر سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ہر شب ان کی دیوڑھی میں طرحی اور غیر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مہاراجہ کے اطراف کوئی تین سو سے زائد علما، شعرا جمع ہو گئے تھے۔ ان میں بیشتر شعرا تنخواہ یاب تھے تنخواہ کم سے کم سو روپے اور زیادہ سے زیادہ ہزار روپے ماہانہ دی جاتی تھی۔ ان مشاعروں میں عموماً شاہ نصیر۔ شاہ حفیظ، غلام ضامن اکرام۔ ملا محمد علی ساغر۔ میر حسن علی خاں ایما۔ تاج الدین مشتاق میر باقر وغیرہ بڑی پابندی سے حاضر ہوا کرتے تھے۔

چندو لعل شاداں اپنے وقت کے ایک بسیار گو، ادب نواز شاعر تھے۔ آپ کے کلام کے دو حصّے مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت نے اپنی نگرانی میں مرتب کر کے شائع کرائے۔ ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے شائع شدہ "مرقع سخن" جلد اول میں راجہ چندو لعل کی شخصیت اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

شاداں نے قصیدے۔ غزل۔ مثنوی۔ اور رباعیات کہی ہیں لیکن غزلوں کا معیار بڑھا ہوا ہے۔ قصیدے اور مثنوی کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت اور شاعرانہ محاسن ایسے نہیں ہیں کہ ان کے کلام کو کسی استاد سخن کے مقابل رکھا جائے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے اور ان کا کلام ان کے جذبات اور کردار کا آئینہ دار ہے۔ بیان میں سادگی اور خلوص ہے۔ الفاظ کی ندرت تکلف اور رکھ رکھاؤ کی خاطر انھوں نے اپنے اصلی رنگ کو قربان نہیں کیا۔ وہ ایک مذہب پرست صوفی امیر تھے اور یہ رنگ ان کے کلام میں بھی جا بجا ملتا ہے:۔

پاؤں پر میرے قناعت کی لگی ہے مہندی
تو جو کہتا ہے مجھے دوڑ تو میں جاؤں کہاں

......

نہ بھٹکے گا نہ بھولے گا وہ رستہ
براہ راست جو کوئی چلے گا

......

جوہری کے سامنے جوہر کھلے تو قدر ہو
رازِ دل ان سے نہ کہہ جن کے سینے تنگ ہیں

......

جو کرتا ہے محنت وہ پاتا ہے راحت
جو پیسے ہے آٹا وہی چھانتا ہے

......

لالچ ہے بُری چیز خبردار ہو شاداں
جان اپنی گنواتی ہے مگس میٹھے کی لالچ

......

اپنے بادشاہ اور اپنے ملک سے انھیں بے حد پیار تھا:-
جس کا ہے نام شام سے لے روم تا عجم
ایسا ہے بادشاہ ہمارے دکن کے بیچ

شاداں ہر ایک ملک سے آتی ہے خلق یاں
ہے کس طرح کی سیر ہمارے دکن کے بیچ
عاشقانہ مضامین یوں موزوں کیے ہیں:-
ہے کسی کے عارض روشن سے شرمائی ہوئی
پردہ فانوس سے باہر نہیں آتی ہے شمع

......

سو سو طرح سے لیتے تھے بستر پہ کروٹیں
گزری تمام رات تیرے انتظار میں

......

سیر کو جاتا ہے جب سرو خراماں میرا
غنچے سب پیار سے لیتے ہیں بلائیں چٹ چٹ

....

ہم تو مشتاق دید تھے صاحب　　اپنا منھ ہم سے کیوں چھپانا تھا

......

یہ جانتے ہیں وہی جو عشق رکھتے ہیں
مزہ تھا لطف تھا اور وصل یار میں کیا تھا

حیدرآباد کی خوشحالی کے لیے وہ یوں دعا کرتے ہیں:-

جب تلک شمس و قمر ہیں یہ جہاں میں روشن
حیدرآباد رہے اس قدر آباد کہ بس

......

کس نے کہا تھا کہ جا طور پر برس
اے ابر آ ادھر کسی مخمور پر برس
سایہ تیرا ہے رحمت باری جہان کو
ہے یہ دعا ہماری کہ جمہور پر برس

راجہ رام بخش فرزند راجہ گوبند بخش کی مدار المہامی [1]

۱۸۴۳ء میں راجہ چندو لعل کی معزولی کے بعد ان کے بھتیجے راجہ رام بخش فرزند راجہ گوبند بخش خدمت مدار المہامی پر مامور کیے گئے۔ راجہ رام بخش راجہ چندو لعل کی طرح حیدرآباد کے ایک با اثر امیر تھے اور ان کے اثر و رسوخ کا یہ حال تھا کہ جب نیا سکّہ جاری ہوا تو سکّہ رام بخش کے نام سے مشہور ہو گیا۔ راجہ رام بخش تین سال تک خدمت مدار المہامی پر کام کر سکے۔

سراج الملک۔ سیف جنگ اور امیر کبیر کی مختصر مدتی وزارتیں

۱۸۴۵ء میں سراج الملک مدار المہام بنائے گئے لیکن کچھ مدت بعد وہ بھی معزول کیے گئے کچھ عرصہ کے لیے سیف جنگ میں امجد الملک اور شمس الامرا امیر کبیر فخر الدین خاں

---

[1] "مہاراجہ کشن پرشاد" مولفہ حافظ محمد مظہر صاحب صفحہ

تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لیے مدارالمہام رہے حکومت کا مالیہ اس قدر کمزور تھا کہ کوئی مدارالمہام (دیوان) ان حالات پر قابو نہ پاسکا۔ ۱۸۴۹ء میں راجہ رام بخش دوبارہ دو سال کے لیے مدارالمہام بنایا گیا۔ راجہ رام بخش نے انتظامی امور میں کئی تبدیلیاں کیں۔ سرکاری عملہ کی تنخواہیں بڑھا دیں بعض عہدہ داروں کے تنخواہ میں پانچ گنا اضافہ کیا گیا۔ ان انتظامات کی وجہ سے خزانہ پر کافی بوجھ پڑ گیا اور آخر کار ۱۲۶۲ھ میں وہ خدمت سے معزول کر دیے گئے۔ ان کے جانشین گنیش راؤ مقرر ہوئے جو صرف چند ماہ یہ خدمت انجام دے سکے۔ راجہ رام بخش نے ۳۰۔ جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ انتقال کیا۔

نواب سراج الملک کی مدارالمہامی

۱۸۵۱ء میں نواب سراج الملک کو گورنر جنرل کی سفارش پر مستقل مدارالمہام بنایا گیا نواب سراج الملک نواب میر عالم کے نواسے اور نواب منیرالملک کے دوسرے فرزند تھے۔ نواب منیرالملک کے انتقال کے بعد سراج الملک کو مدارالمہام نہ بنایا جا سکا۔ کیوں کہ اس زمانہ میں رزیڈنسی اور دربار حیدرآباد میں راجہ چندو لعل کا اثر ورسوخ تھا۔ پنے والد منیرالملک کے انتقال کے بارہ سال بعد وہ اس عہدہ پر فائز ہو سکے۔

نواب سراج الملک کے عہدہ وزارت اور نواب طالب الدولہ کی کوتوالی کے زمانہ میں حیدرآباد میں شیعہ سنی فساد ہوا۔ مکہ مسجد میں ایک نامی شخص کا سر کاٹ کر کسی نے لٹکا دیا۔ شاہ علی بنڈہ میں مرزا عباس اور دارالشفا میں کاسے نواب میر صلابت علی مارے گئے اور ان کے مکانات کو آگ لگا دی گئی۔ تمام مال واسباب بلوائیوں نے لوٹ لیا۔ شمس الامراء کے معروضہ پر آصف جاہ چہارم نے طالب الدولہ کو کوتوالی کی خدمت سے معزول کر دیا۔

حوالگی برار کے لیے لارڈ ڈلہوزی کا اصرار اور ناصر الدولہ کی مجبوری

اسی زمانہ یعنی ۱۸۵۳ء میں لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل نے رزیڈنٹ کے ذریعہ پیام ناصر الدولہ کو پہنچایا کہ ۶۴ لاکھ روپے کے قرض کی ادائی اور کنٹینجنٹ کی ماہوار تنخواہیں پابندی کے ساتھ ادا کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ناصر الدولہ برار پائین گھاٹ

کے اضلاع انگریز حکومت کے حوالہ کردیں۔ ڈلہوزی کی اس تجویز پر ناصر الدولہ نے رزیڈنٹ ڈیوڈسن سے کہاکہ

"کسی صاحب اقتدار حکمراں کے لیے دو باتیں ہمیشہ ذلت آمیز ہوا کرتی ہیں ایک تو اپنے آبائی علاقے کا کوئی حصہ دوسرے کے حوالہ کر دینا اور دوسرے اپنی بہادر و وفادار آزمودہ فوج کو برطرف کر دینا۔ انگریز جو کبھی سپاہی، کبھی ملاح اور کبھی ملک التجار بن جاتے ہیں ان احساسات کو سمجھ نہیں سکتے تمہاری حکومت اگر یہ سوچتی ہے کہ میں اپنی حکومت کا کوئی علاقہ تم کو دے کر خوش رہ سکتا ہوں تو یہ بھول ہے۔ تم مجھے بھی محمد غوث خاں نواب کرناٹک کی حالت میں نہیں رکھ سکتے اور نہ میں ایسی حالت میں خوش رہ سکتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ اس تجویز کو مان کر میں آٹھ لاکھ روپے کی بچت کر سکوں گا۔ لیکن میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ اگر آٹھ لاکھ روپے سے چار گنی بچت بھی ہو تب بھی میں مطمئن نہیں رہوں گا میں اپنا ملک اور قلمرو چھوڑ کر اپنی عزت و ناموس کھو دوں گا۔ انگریز کمپنی کو اداشدنی قرض چار ماہ کے اندر ادا کیا جائے گا۔ کنٹیجنٹ کی تنخواہیں ماہ بہ ماہ ادا کی جائے گی۔"

آخر میں ناصر الدولہ نے رزیڈنٹ سے دریافت کیا کہ "اگر میں کنٹیجنٹ کے قیام کو پسند نہ کروں تو تم کیا کرو گے" رزیڈنٹ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ "ہم کنٹیجنٹ کی برطرفی قبول کر لیں گے۔ لیکن فوجوں کی واپسی میں کئی سال لگ جائیں گے اور اس تمام مدت تک کنٹیجنٹ کی تنخواہ آپ کو ادا کرنا ہو گا جس کے لیے ان اضلاع کی حوالی کے سوا کوئی اور صورت نہ رہے گی" ناصر الدولہ نے تجویز پیش کی کہ برار کا علاقہ امیر الامرا امیر کبیر کے تفویض کیا جائے گا اور وہ قرضہ کی ادائی کے ساتھ ساتھ کنٹیجنٹ کی تنخواہیں بھی ادا کریں گے۔ رزیڈنٹ نے یہ ترمیم پیش کی کہ برار کے علاقہ کے انتظام میں رزیڈنٹ حیدرآباد بھی امیر کبیر کے ساتھ شریک رہیں۔ نواب ناصر الدولہ نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا۔

ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۹۔مئی ۱۸۵۳ء کو مدار المہام نواب سراج الملک کو رزیڈنٹ کے اسسٹنٹ کی دستخط سے ایک مراسلہ وصول ہوا کہ

"رزیڈنٹ اور حضور نظام کی گفتگو منقطع ہو گئی ہے اور گورنر جنرل سے سفارش کی گئی ہے کہ وہ اپنی افواج کو حرکت میں لائیں"۔

ان حالات میں آخر ناصر الدولہ نے مجبوراً بتاریخ ۲۰۔ مئی ۱۸۵۳ء م ۱۲۶۹ھ معاہدہ برار پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدہ کے پانچویں دن مدار المہام نواب سراج الملک نے انتقال کیا۔

معاہدہ برار کے تحت برار اور رائچور کے دوآبے کا علاقہ انگریزوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ جہاں کا نظم و نسق انگریز حکام رزیڈنٹ کی راست نگرانی میں چلاتے تھے۔ واپسی برار کے لیے نواب سر سالار جنگ اول اور بعد میں والی ریاست میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم نے لاکھ کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ برار کا علاقہ صوبہ جات متوسط (موجودہ مدھیہ پردیش) کا ایک جز بنا رہا۔

معاہدہ برار پر دستخط کرنے کے بعد نواب ناصر الدولہ، چار سال سے زیادہ زندہ نہ رہے۔ معاہدہ برار حکمران اور مدار المہام کے لیے جاں لیوا ثابت ہوا۔ شعبان ۱۲۷۳ھ میں بمقام سرور نگر آپ علیل ہوئے اور پھر وہاں سے شہر تشریف لائے۔ ۱۱۔ مارچ ۱۸۵۷ء م ۲۳۔ رمضان ۱۲۷۳ھ کو اسہال کے عارضہ سے ۶۶ سال کی عمر میں انتقال کیا اور صحن مکہ مسجد میں دفن کیے گئے۔ آپ کا دور حکمرانی ۲۸ سال، ۱ ماہ اور ۵ یوم رہا۔

آپ کے دو صاحب زادے تھے ایک نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس (پنجم) اور دوسرے نواب میر جہاں گیر علی خاں روشن الدولہ جن کا ۲۷۔ ربیع الثانی ۱۲۸۷ھ میں انتقال ہوا۔

(دبستان آصفیہ جلد چہارم ص۶)

دیسی اشیا کے استعمال کے لیے ناصر الدولہ کے احکام

نواب ناصر الدولہ کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سختی کے ساتھ یہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی انگریزی چیز استعمال نہ کی جائے۔ بلکہ ملک کے ہی ساختہ اشیاء استعمال کی جائیں۔ سرکاری دفاتر میں کاغذی گوڑہ کا بنا ہوا دیسی کاغذ استعمال

کیا جاتا تھا[1] ناندیڑ کے بنے ہوئے کپڑے کے جامے اور نیم جامے پہنا کرتے تھے۔ ایک دکنی امیر بمبئی کے کسی سوداگر سے خریدا ہوا انگریزی ساخت کا کپڑا خرید کر اس کا جامہ پہنے دربار میں حاضر ہوا۔

نواب ناصر الدولہ نے امیر سے دریافت کیا "یہ کہاں سے لائے ہو" اس امیر نے سکندرآباد کا نام لیا۔ ناصر الدولہ اس امیر پر ناراض ہوئے کہ "تمھارے پاس مفت کا روپیہ جمع ہوگیا ہے۔ لہٰذا تم مقررہ جرمانہ ادا کرو اور تا حکم ثانی خانہ نشیں رہو[2]"

۱۸۳۱ء میں نواب ناصر الدولہ کے عہد حکومت میں چادر گھاٹ کا پل تعمیر ہوا۔ اس پل کی تعمیر پر ۸۵ ہزار روپے صرف ہوئے۔ پل سو فٹ طویل اور ۲۷ فٹ عریض تھا (کچھ زمانہ پہلے اس پل کی چوڑائی میں اضافہ کیا گیا ہے)، بلندی ۵۴ فٹ ہے اس پل کا نقشہ میجر اسٹورٹ نے تیار کیا تھا جو برطانیہ کے شاہی انجنیر میجر جے آلی فن کی نگرانی میں تیار ہوا۔ یہ پل دراصل رزیڈنٹ اور اہل رزیڈنٹ کی سہولت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔

تاریخ تعمیر ہے

باسر عقل میجر اسٹورٹ

پل بنا کر دمثل مہر و ماہ

۱۸۳۱ء

نواب افضل الدولہ آصف جاہ پنجم ۱۲۷۳ھ تا ۱۲۸۵ھ م ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء

نواب افضل الدولہ بہادر حضرۃ دلاور النسا بیگم صاحبہ کے بطن سے بتاریخ ۳۔ ربیع الاول ۱۲۴۳، روز دوشنبہ بوقت دو ساعت دن تولد ہوئے۔ ۴۔ رمضان ۱۲۷۳ھ م ۱۱ مارچ ۱۸۵۷ء کو نواب ناصر الدولہ کے انتقال کے بعد آپ بہ حیثیت آصف جاہ پنجم مسند نشیں ہوئے۔ خلوت مبارک میں ایک مہتم بالشان دربار منعقد ہوا۔ جس میں تمام اراکین دولت، عہدہ داران سلطنت حاضر تھے۔ گورنر جنرل کی جانب سے رزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن

---

[1] کارنامہ سروری از نواب سرور الملک صفحہ ۱۹۱

[2] 〃 〃 〃 〃 ۱۹۱

نے مبارک باد پیش کی دربار کے ختم پر حسب رواج رزیڈنٹ کو پاندان دیا گیا۔ نئے نظام نے نواب سالار جنگ کو مدارالمہام (دیوان) اور راجہ نریندر پرشاد کو بدستور پیشکار قائم رکھا۔ مسند نشینی کے وقت نواب افضل الدولہ کی عمر ۲۰ سال تھی۔ اس وقت مدارالمہام نواب سالار جنگ کی عمر ۲۸ سال اور پیشکار وقت راجہ نریندر پرشاد کی عمر بمشکل ۱۹ سال تھی۔ رئیس، دیوان اور پیشکار ہر سہ نوجوان تھے بعض اہل دربار اور عمر رسیدہ لوگ طنزاً " ریاست جملہ بازی گاہ طفلاں شد " کہنے لگے تھے۔

نواب ناصر الدولہ انگریزوں سے خوش نہیں تھے اور انگریز قانون یا طور طریقوں پر برہم ہوا کرتے تھے۔ افضل الدولہ کمزور ارادہ کے انسان تھے اور کوئی ذاتی رائے نہ رکھتے تھے۔ حکمراں کی اس فطری کمزوری کا بعض اہل دربار مصاحبین اور امرا نے فائدہ اٹھایا اور مدارالمہام کو ان فتنہ پردازوں کی سازشوں کی بنا پر کافی پریشانی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بقول نواب شمس العلماء عزیز جنگ ولا۔ نواب افضل الدولہ کا درمیانی عہد شاہ و وزیر کی شکر رنجی کا زمانہ تھا۔ مگر انصاف پسند اور قدرشناس بادشاہ نے عملی طور پر کسی قسم کا نقصان اپنے جاں نثار کو نہیں پہنچایا۔

نواب افضل الدولہ ایک ایسے زمانہ میں مسند نشین ہوئے جب کہ ہندوستان میں انگریز غلامی سے نجات اور آزادی کے لیے عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی بمسند نشینی سے چند ماہ بعد یعنی ۲۴۔ شوال ۱۲۷۳ھ م ۱۷۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو شام کے وقت علاء الدین خاں چند سرفروشوں کو اپنے ساتھ لے کر طرہ باز خاں ولد رستم خاں اور ان کے حامیوں سے جا ملے اور غضب ناک جوش و خروش سے حیدرآباد رزیڈنسی پر حملہ آور ہوئے۔ مدارالمہام اور پیشکار سلطنت نے رزیڈنٹ کو احتیاط کے لیے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ سکندرآباد سے انگریز افواج رزیڈنسی پہنچ گئیں اور علاء الدین خاں طرہ باز خاں اور دیگر سرفروش اپنی کارروائی جاری نہ رکھ سکے۔ علاء الدین منگل پلی میں گرفتار ہوئے اور شہر بدر کیے گئے۔ طرہ باز خاں مجاہد پور میں گرفتاری کے بعد اسی مقام پر فوت ہوئے اس پر آشوب زمانہ میں گورنر بمبئی نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو ذریعہ ٹیلیگرام مطلع کیا کہ اگر نظام کا سہارا چھوٹ گیا تو سمجھو کہ ہمارا کوئی سہارا نہ رہا اور ہندوستان کو چھوڑنا پڑے گا۔

نواب افضل الدولہ کے ابتدائی دور میں ریاست کے ہر حصّہ میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی راجہ چندو لعل اور نواب سراج الملک کے زمانہ میں ریاستی خزانہ خالی ہوچکا تھا۔ برار کے چلے جانے سے ریاست کے زرخیز علاقے باقی نہ رہے تھے۔ برار کے جاگیردار جو انگریز عملداری کی بنا پر اپنی جاگیروں سے محروم ہو گئے تھے وہ معاوضہ کا مطالبہ کررہے تھے۔ سکھوں کی جمعیت بقایا تنخواہ کے لیے حکمرانِ وقت کی دیوڑھی پر دنگا کررہی تھی۔ دوسرے قرض خواہ سلطان قلندر بیگ وغیرہ بھی دنگا کررہے تھے۔ ساہوکاروں کے قرضے بھی کثیر رقم کے تھے۔ جواہرات جو سرکار کی جانب سے انگریزوں کے پاس ساٹھ لاکھ روپے میں رہن تھے وہ ان کو مسٹر دائین لندن لے گئے تھے اور ایک بڑا الماس جو ساہوکاروں کے پاس رہن تھا اس کو فک رہن کرنے کے لیے خزانہ سرکار میں روپیہ نہیں تھا۔ ان زیر باریوں کے علاوہ سلطنت کے کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے کثیر رقومات درکار تھے۔ محاصل دیوانی کی آمدنی گھٹتی جارہی تھی اور اخراجات بڑھتے جارہے تھے۔ مال کا انتظام عہد داروں کے ذمہ تھا جو رعایا سے کثیر محاصل رقم بہ ظلم و جبر وصول کرتے تھے۔ لیکن بہت کم رقم خزانہ میں داخل ہوتی تھی۔ رعایا۔ نابیاں۔ سررشتہ داراں۔ دیسمکھ۔ دیشپانڈے۔ پٹیل۔ پٹواری کے ہاتھوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسی طرح جاگیری علاقے میں رعایا کافی پریشان تھی۔ عربوں کے جمعدار دولت مند اور صاحب جمعیت ہو گئے تھے اور ان میں باہم اتحاد تھا۔ پولیس کا خوف عربوں کو نہ تھا بلکہ جوانانِ پولیس، عرب، پٹھان اور سکھوں سے خوف زدہ رہتے تھے۔ پٹھانوں کا زور کا یہ حال تھا کہ جب کوئی پٹھان راستہ پر سے گزرتا تو راستے پر لوگ باہم بات چیت بند کردیتے اور خاموش ہو رہتے تھے ان حالات میں چوری اور ڈکیتی زیادہ ہو گئی تھی۔ امیر علی ٹھگ نے اپنی سوانح حیات میں ایک جگہ لکھتا ہے "سبحان اللہ حیدرآباد ایک نادر جگہ ہے جہاں ہم بلا خوف و خطر ہر روز تازہ شکار کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ جگہ ہمارے زیادہ عرصہ تک قیام کے لیے موزوں ترین ہے۔"

کوتوال شہر نواب غالب الدولہ ان شرپسندوں کے آگے مغلوب ہو گئے تھے لوگ سڑکوں پر تنہا اور بلا اسلحہ کے نہ نکلتے تھے۔ موجودہ نامپلی اسٹیشن روڈ۔ (عابد شاپ چوراہا تا نامپلی چوراہا) ۱۸۷۰ء تک سہ پہر کے بعد سنسان ہو جاتی

تھی اور آمد و رفت کے لیے انتہائی مخدوش خیال کی جاتی تھی۔ شہر کی صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ پختہ موریاں نہ تھیں بلکہ گھروں کا پانی راستہ پر بہتا تھا۔ بارش کے زمانہ میں راستے کیچڑ سے بھر جاتے۔ راستے بہت تنگ تھے رتھ یا ہاتی کو گزرتا دیکھ کر لوگ کیچڑ اور گندگی سے بچنے کے لیے راستے پر دوڑتے پھرتے تھے۔ جب سالار جنگ نے شہر کی صفائی کا خیال کیا تو مخالفین نے جن میں مولوی محمود اور اکبر علی قابل ذکر ہیں غالباً امیر الامرا کے اشارہ پر افضل الدولہ سے شکایت کی کہ نواب سالار جنگ اس خیال سے کہ اندرون شہر انگریزوں کی آمد و رفت بڑھ جائے ان راستوں کو صاف اور کشادہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس شکایت پر سرکار سے حکم ہوا کہ صفائی شاہراہ کا کام فوراً بند کر دیا جائے۔

نواب افضل الدولہ کے مزاج میں بعض مخالف مصاحبین کے دخل پا جانے کی بنا پر مدار المہام سالار جنگ اول نے انتظام یا اصلاحات کو جاری کرنے سے مجبور تھے۔ پھر بھی انھوں نے چند احکام جاری کیے جو کافی دلچسپ ہیں اور اس زمانہ کے انداز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً ۲۔ ربیع الاول ۱۲۷۳ھ کو سالار جنگ اول نے پردہ فروشی کے قدیم طریقہ کو موقوف کیا۔ ہر شخص پر ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ اپنے چال چلن کا خود محاسبہ لے اور دریافت پر وہ مجرم ثابت ہو تو سخت سزا کا موجب ہوگا۔ کوئی شخص داڑھی نہ منڈوائے۔ کم درجہ کی عورتیں سبز رنگ کی چولی، انگیا ساڑھی، اور چوڑیاں نہ پہنے۔ زرد بانات کا جوتہ بھی کوئی نہ بنوائے اور نہ پہنے اس زمانہ میں چار مینار اور گنبدان قطب شاہی کی مرمت کرائی گئی اور دودھ باولی تا فتح دروازہ حصار کی تعمیر مکمل کرائی گئی۔

پہلی جنگ آزادی "غدر" کے بعد قصر چو محلہ میں تہنیتی دربار

جنگ آزادی کی ناکامی اور انگریز حکومت کے قیام کے بعد، انگریز حکومت کی جانب سے افضل الدولہ آصف جاہ پنجم کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ اس سلسلہ میں "قصر چو محلہ" میں ایک دربار منعقد ہوا۔ آصف جاہ پنجم مسند پر تشریف فرما تھے۔ مسند کے سیدھے کنارے پر کچھ دور رزیڈنٹ سالار جنگ، راجہ نریندر پرشاد اور آصف جاہ کی پشت میں امیر کبیر شمس الامرا بیٹھے تھے۔ انگریز حکومت کی جانب سے جن دیگر اصحاب کو تحائف پیش کیے گئے ان میں نواب سالار جنگ اول نواب شمس الامرا

امیر کبیر۔ راجہ نریندر پرشاد قابل ذکر ہیں۔ عرب امرا میں عبداللہ بن علی۔ عمر بن عوض۔ غالب جنگ۔ زور آور جنگ شامل ہیں۔ مقامی ساہوکاروں میں پورن مل۔ کشن داس۔ شیو لعل شاہو۔ یعقوب علی خاں۔ محمد غوث اور والی سمستان راجہ رامیشور راؤ وغیرہ شامل ہیں۔

نواب ناصر الدولہ کے عہد حکومت تک، انگریز کمپنی سے مراسلت کے لیے حضور نظام اپنے آپ کو "ما بدولت" لکھا کرتے تھے۔ گورنر جنرل اپنے لیے "نیاز مند" کے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے۔ نواب افضل الدولہ بہادر کی تخت نشینی کے بعد یہ الفاظ دوستانہ اور مساویانہ تخاطب میں بدل گئے اب حضور نظام کے لیے گورنر جنرل "نواب صاحب مشفق مہربان قدردان مخلصان" کے القاب استعمال کرنے لگا۔

اعلان حکومت ملکہ وکٹوریہ

۲۴۔ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ کو سکندر آباد میں ملکہ وکٹوریہ کی حکمرانی کی خوشی میں پریڈ ہوئی۔ اس روز رزیڈنسی میں اعلان قیام حکومت ملکہ وکٹوریہ ملکہ معظمہ ہند پڑھا گیا۔ رزیڈنسی میں اس موقعہ پر جو دربار ہوا اس میں حضور نظام کی جانب سے نواب شمس الامرا۔ نواب سالار جنگ اول نے شرکت کی۔ رزیڈنسی کے دربار کے بعد رزیڈنٹ بہادر فوجی افسروں کے جلوس میں باریابی کے لیے قصر چومحلہ آئے اور گورنر جنرل کی جانب سے حضور نظام کی خدمت میں خریطہ پیش کیا۔ کم و بیش اسی زمانہ میں رزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن اور سالار جنگ پر جہانگیر خاں نامی ایک پٹھان نے قاتلانہ حملہ کیا لیکن یہ دونوں اصحاب بچ گئے۔

"ستارہ ہند" کا اعزاز اور اعتراض

۴۔ ربیع الثانی ۱۲۷۸ھ کو ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے رزیڈنٹ حیدرآباد نے افضل الدولہ بہادر کی خدمت میں "ستارہ ہند" کا تمغہ پیش کیا۔ نواب افضل الدولہ کو اس تمغہ کو قبول کرنے میں پیش و پیش ہوا۔ وہ انگریز حکومت سے مساویانہ تعلقات رکھنا چاہتے تھے اور ملکہ کا دیا ہوا خطاب اور تمغہ حاصل کر کے انگریز بالادستی کو وہ قبول کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دربار نظام سے یہ اعتراض کیا گیا کہ "تمغہ" پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر

ہے اور حضور نظام کے اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے یہ جائز نہیں ہے۔اگر ستارہ ہند کے تمغہ میں کچھ تغیر و تبدل کیا جائے تو وہ اس تمغہ کو بخوشی قبول کریں گے' یہ اعتراض رزیڈنٹ کے ذریعہ گورنر جنرل ہند کو روانہ کیا گیا۔ اس اعتراض کی اطلاع گورنر جنرل نے ملکہ کی حکومت کو روانہ کر دی۔ انگلستان سے جواب وصول ہوا کہ " ستارہ ہند، نشان دوستی ہے جو بہت کم اصحاب کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں اگر مع شرائط نشان قبول کیا جائے تو مناسب ہے ورنہ حکومت کو واپس کر دیا جائے"۔ مدار المہام نواب مختار الملک سالار جنگ نے کمال دوراندیشی سے معروضہ پیش کیا کہ " ان حالات میں تمغہ ستارہ ہند کو واپس کرنا قرین مصلحت نہیں ہے " ۔ اس طرح آصف جاہ پنجم نے ستارہ ہند قبول کر لیا۔

زمانہ " پہلی جنگ آزادی " میں نظام اور حیدرآباد کی مدد اور اشتراک کے پیش نظر انگریز حکومت نے ۱۸۶۰ء میں ایک جدید معاہدہ کے ذریعہ حضور نظام کا علاقے یعنی رائچور دوابہ، دھاراسیون اور نلدرگ بجز علاقہ برار جو معاہدہ ۱۸۵۳ء کے تحت انگریز عملداری میں لے لیے گئے تھے۔ نظام کو واپس کر دیے۔ راجہ شولاپور نے غدر کے زمانہ میں انگریزوں کی مخالفت کی تھی۔ اس لیے راجہ شولاپور کے کئی علاقے ریاست حیدرآباد میں ضم کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ پچاس ہزار کا قرض جو انگریز حکومت کو واجب الادا تھا معاف کر دیا گیا۔ ۱۸۲۹ء تک حیدرآباد کا ایک وکیل کلکتہ میں مقیم رہا کرتا تھا لیکن ۱۸۲۹ء میں رزیڈنٹ نے معاہدہ پر دستخط کیے تھے اس لیے رزیڈنٹ ہی حضور نظام کی نیابت کیا کرتے تھے اور حیدرآباد سے کوئی وکیل کلکتہ میں مقیم نہ رہا

نواب افضل الدولہ کے آخری زمانہ میں مالی امور کی بہتری کے لیے اولاً مجلس مال قایم کی گئی۔ محاصل کی وصولی کے لیے صوبے ضلع اور تعلقے قایم ہوئے اور صوبہ دار۔ تعلقدار اور تحصیلدار کا تقرر کیا گیا۔ صوبہ دار کی سرکاری قیام گاہ کو " ایوان صوبہ داری " سے موسوم کیا گیا۔ صوبہ دار اپنے اپنے علاقوں میں بادشاہ کی سالگرہ اور یوم خود مختاری سلطنت آصفیہ کے موقعہ پر عوام اور عہدہ داروں سے نذر قبول کرتے تھے۔

نواب افضل الدولہ کے عہد میں چار محل یعنی آفتاب محل۔ مہتاب محل۔ تہنیت محل افضل محل تعمیر کیے گئے۔ نواب امیر کبیر کے اہتمام سے ان ایوانات کی مشرقی طرز پر آرائش کی گئی۔ کئی امرا اور جاگیر داروں کو خطابات اور جدید جاگیرات عطا کیے گئے۔ پانچ ہزار جوانان علی غول بھرتی کیے گئے۔ افضل الدولہ نے چند آبی جہاز خرید کر حاجیوں کے لیے وقف کیے گئے۔

"غدر" میں انگریزوں کی کامیابی اور سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے بعد گورنر جنرل نے نواب سالار جنگ کے ذریعہ نواب افضل الدولہ کو مطلع کیا کہ دہلی کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر یہ مناسب ہے کہ ریاست کا سکہ تبدیل کیا جائے اور "شہنشاہ دہلی بادشاہ غازی" کے الفاظ خارج کیے جائیں۔ نواب افضل الدولہ نے اس تجویز کو سنی ان سنی کر دی۔ رزیڈنٹ حیدرآباد کرنل ڈیویڈسن نے افضل الدولہ کے پھوپھا نواب امیر کبیر شمس الامرا کے ذریعہ یہ کہلا بھیجا کہ سکہ کے الفاظ کو اب بدل دیا جائے۔ اس معروضہ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نواب افضل الدولہ چاہتے تھے کہ جب تک بہادر شاہ زندہ رہیں ان کے نام کا سکہ جاری یہاں رہے۔ لیکن انگریزوں کے مسلسل اور شدید ترین اصرار کی بنا پر سکہ میں تبدیلی کی گئی۔ جس کے ایک رخ پر "نظام الملک آصف جاہ اور دوسرے رخ پر جلوس میمنت مانوس ضرب حیدرآباد فرخندہ بنیاد" کندہ کیا گیا۔ سکہ کا نام حالی سکہ قرار دیا گیا۔ سکوں پر عہد افضل الدولہ میں سرحرف "ا"۔ نواب میر محبوب علی خاں کے دور میں سرحرف "م" اور نواب میر عثمان علی خان کے دور میں سرحرف "ع" کندہ کیے جاتے تھے ۱۸۵۷ء کے بعد نماز جمعہ اور عیدین کے خطبات میں بہادر شاہ ظفر کے نام کے بجائے نواب افضل الدولہ کا نام پڑھا جانے لگا۔

نواب افضل الدولہ اور سالار جنگ اول کے درمیان درباری سازشوں اور سالار جنگ کے مخالف امرا اور مصاحبین کی کوشش سے غلط فہمی پیدا ہو گئی اور تعلقات کشیدہ ہو گئے رزیڈنٹ حیدرآباد نے کئی مرتبہ صلح صفائی کرادی لیکن دلوں کی رنجش دور نہ ہوئی۔ ان تمام حالات کے باوجود بستر مرگ پر نواب افضل الدولہ نے نواب سالار جنگ کو طلب فرمایا اور خواہش کی کہ وہ ان کے کمسن فرزند نواب میر محبوب علی خاں کی حفاظت کرتے رہیں۔ آخر ۱۳۔ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۶۔ فروری ۱۸۶۹ء نواب افضل الدولہ

بہادر نے بیالس سال کی عمر میں انتقال کیا اور صحن مکہ مسجد میں دفن کیے گئے۔ آپ کا دورِ حکومت بارہ سال ایک ماہ اور بیس یوم رہا۔ آپ کے جانشیں نواب میر محبوب علی کی عمر اس وقت صرف دو سال سات ماہ کی تھی۔

دورِ ریجنسی (دورِ نیابت) ۱۲-ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ تا ۷-ربیع الاول ۱۳۰۱ھ مطابق ۲۶-فروری ۱۸۶۹ء تا ۵-فروری ۱۸۸۴ء

نواب افضل الدولہ آصف جاہ پنجم کے انتقال کے فوری بعد، قبل اس سے کہ رزیڈنٹ حیدرآباد کو نواب صاحب کے انتقال کی خبر پہنچے۔ مقدم جنگ جمعدار عرب نے، مدار المہام، پیشکار اور امیر کبیر کے اشارہ پر شہر کے تمام دروازے بند کر دیے اور پہرے بیٹھا دیے تاکہ کوئی انگریز یا کوئی رزیڈنسی کا ملازم شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ تمام امرا عظام در دولت پر حاضر ہوئے اور کمسن میر محبوب علی خاں کو مسند پر بیٹھا کر نذریں پیش کیں۔ خاندان آصفی میں نواب میر محبوب علی خاں پہلے حکمراں ہیں جو انتہائی کم عمر یعنی ڈھائی سال کی عمر میں والی ریاست بنے۔ نواب میر محبوب علی خاں کی کمسنی کی بنا پر انگریز چاہتے تھے کہ نواب افضل الدولہ آصف جاہ پنجم کے بھائی نواب روشن الدولہ جانشیں ہوں۔ خورشید جاہ بہادر کی خواہش تھی کہ ان کے فرزند اور نواب افضل الدولہ کے نواسے، نواب ظفر جنگ جانشیں ہوں۔ نواب ظفر جنگ عمر میں نواب محبوب علی خاں سے بڑے تھے۔ ان تمام خطرات کے پیش نظر یہ مناسب خیال کیا گیا کہ نئے بادشاہ کے نام کی منادی کرادی جائے۔ اور پھر رزیڈنٹ کو سابق حکمراں کے انتقال اور نئے حکمراں کی جانشینی کی اطلاع دی جائے۔ چنانچہ مدار المہام پیشکار اور امیر کبیر، امرا عظام کی حمایت سے کمسن بادشاہ کے نام کی منادی شہر کے محلوں اور بازاروں میں کر دی گئی۔ اس تمام کارروائی کے تکمیل پانے کے بعد رزیڈنٹ حیدرآباد کو نئے بادشاہ کی مسند نشینی سے واقف کیا گیا۔

مغلئی اور انگریزی دربار

مسند نشینی کی اس ایک طرفہ کارروائی سے رزیڈنٹ مسٹر سانڈرس کافی برہم ہوئے اور مدار المہام کو اطلاع دی کہ دربار تعزیت اور دوسرے درباروں میں وہ بلا جوتا اتارے آئیں گے اور کرسیوں پر نشست کا انتظام رہے[1] نواب افضل الدولہ کے دور حکومت تک یہ دستور تھا کہ انگریز رزیڈنٹ مدار المہام کے ذریعہ باریابی کی درخواست کرتا۔ مسند پر والی ریاست رونق افروز ہوئے رزیڈنٹ مع ہمراہیاں برہنہ سر جوتے اتار کر سیدھے جانب، مسند شاہی سے دور ایک جانب فرش پر بیٹھتا[2] بائیں جانب مدار المہام (دیوان ریاست) پیشکار اور امرا عظام بیٹھتے تھے۔ والی ریاست کے پیچھے امیر کبیر کی نشست ہوا کرتی تھی۔ انگریزی دربار کے لیے رزیڈنٹ کا مطالبہ اس کی شدید ناراضگی کا اظہار تھا۔ ان حالات میں مدار المہام۔ پیشکار اور امیر کبیر مجبور ہو گئے۔ وہ کمسن بادشاہ اور ریاست کے لیے کوئی الجھن پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے اس طرح قدیم مغلئی دربار کا طریقہ ختم ہو گیا اور انگریزی طرز کے دربار کی ابتدا ہوئی۔

دربار تعزیت

۱۵- ذیعقدہ ۱۲۸۵ھ م ۲۸ فروری ۱۸۶۹ء کو نواب افضل الدولہ بہادر کی رسم زیارت ادا ہوئی اور اس روز دوپہر کے وقت منجلی بیگم کی حویلی میں دربار تعزیت منعقد ہوا۔ تمام امرا دولت اور عہدہ داروں نے رزیڈنٹ مسٹر سانڈرس کی موجودگی میں تعزیت ادا کی اور نذریں پیش کیں۔

ع[1] کارنامہ سروری صنہ۱۵۰

ع[2] کارنامہ سروری از نواب سرور الملک صنہ۱۵۰

دربار مسند نشینی

دوسرے دن آفتاب محل کے صدر دالان میں دربار مسند نشینی منعقد ہوا۔ دالان کے صدر میں ایک تخت بچھایا گیا اور اس پر ایک خوبصورت سنہری کرسی رکھی گئی۔ تخت سے نیچے سیدھی جانب رزیڈنٹ اور ان کے ہمراہیوں کے واسطے کرسیاں رکھی گئیں۔ بائیں جانب امیر کبیر دیوان (مدارالمہام)، پیشکار دیگر امراء عظام کے لیے کرسیاں رکھی گئیں۔ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت پھولوں کے ہار، عطر دان و پاندان وغیرہ کشتیوں میں جمائے آفتاب محل کے قریب موجود تھے۔ درباری دستور کے بموجب رزیڈنٹ کی آمد پر مدارالمہام استقبال کے لیے صدر دروازے تک پہنچے اور پھر رزیڈنٹ کا ہاتھ تھامے آفتاب محل میں لے آئے۔ جہاں نواب وقارالامرا اور پیشکار سلطنت تا لب زینہ کھڑے ہوئے تھے۔ یہاں امیر کبیر اور پیشکار رزیڈنٹ سے گلے ملے مدارالمہام رزیڈنٹ کو شاہی نشست گاہ تک لے آئے۔ رزیڈنٹ نے تعظیماً " GOOD MORNING " عرض کیا۔ پھر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ مزاج پرسی کے بعد مسند نشینی کی مبارک باد پیش کی۔ دربار کے ختم ہونے پر راجہ گردھاری پرشاد نے مدارالمہام کو ہار پیش کیا۔ جو رزیڈنٹ کو پہنا دیا گیا۔ راجہ گردھاری پرشاد نے پاندان پیش کیا جو رزیڈنٹ کی جانب سے ان کے مددگار نے تھام لیا۔ رزیڈنٹ کی جانب سے مدارالمہام، پیش کار اور دیگر امرا عظام کی گل پوشی کی گئی اور رزیڈنٹ واپس روانہ ہو گئے۔

راجہ صاحب نے ۲۳۔صفر ۱۳۱۴ھ کو ایکادشی کے دن انتقال کیا۔ دربار تعزیت اور دربار مسند نشینی کے چند دنوں بعد، انتظام مملکت اور نیابت کے لیے ایک کونسل ریجنسی مقرر کی گئی۔ جس کے اراکین نواب سالار جنگ اوّل اور نواب عمدۃ الملک امیر کبیر شمس الامرا مقرر ہوئے۔ اہم امور میں کونسل آف ریجنسی رزیڈنٹ بہادر سے مشورہ بھی لیا کرتی تھی۔ اس طرح رزیڈنٹ کا اثر کافی بڑھ گیا اور وہ کونسل آف ریجنسی کا دراصل نگراں کار بن گیا۔

نواب شمس الامرا عمدۃ الملک امیر کبیر

کونسل آف ریجنسی کے اہم ترین رکن نواب رفیع الدین خاں نواب عمدۃ الملک امیر کبیر تھے جو حیدر آباد کے ہر دلعزیز امیر تھے [1] اہل حیدر آباد خلوص و محبت کی بنا پر انھیں "منجلے میاں" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ وہ علم ریاضی کے ماہر اور عربی و فارسی میں خوب مہارت رکھتے تھے۔ ریاست کے تمام امرا جمعداران۔ منصبداران اور سررشتہ داران ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ نواب صاحب والی ریاست سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ سر سالار جنگ میں کچھ انگریزی تہذیب کی جھلک آگئی تھی لیکن نواب شمس الامرا کے یہاں انگریزیت کا گزر نہ تھا۔ وہ اپنی جوانی کے دنوں میں کلکتہ کا سفر کر چکے تھے اور وائسرائے کے مہمان بھی رہ چکے تھے۔ پھر بھی ان کی دیوڑھی میں قدم رکھتے ہی یہ محسوس ہوتا تھا کہ عہد عالمگیری میں داخل ہو گئے ہیں۔ تمام ملازم (سوائے عہدہ داران فوج) نیچے نیچے دکنی انگرکھے پہنے ہوئے کمر بستہ۔ دستار پہنے ہوئے پیش قبض اور شمشیر سے آراستہ، باریاب رہا کرتے تھے۔ دربار کا باضابطہ دستور جو مختار الملک سر سالار جنگ کے پاس دکھائی دیتا تھا یہاں بالکل مفقود تھا۔ انگریزوں کی ضیافت بھی بہت کم کی جاتی تھی۔ معاملات ملکی میں وہ مطلق دخل نہ دیتے تھے۔ اور نہ مختار الملک سالار جنگ کے متعلق کوئی بدگوئی کو سننا گوارا کرتے تھے اور ایسے درباری کو حاضری سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ عوام اور وابستگان کے ساتھ انتہائی فیاضی سے سلوک فرماتے تھے۔ عیدین۔ نوروز۔ بسنت۔ ایام عرائس اولیا کرام و شب برات وغیرہ کے موقع پر ان کی دیوڑھی پر قابل دید رونق رہا کرتی تھی۔ اس خاندان کا قدیم دستور تیغ جنگ کے زمانہ سے یہ چلا آتا تھا کہ ضیافت کے موقع پر مہمانوں کے ہاتھ خود صاحب خانہ دھلایا کرتے تھے۔ امیر کبیر اپنی کمزوری کی وجہ سے اپنے بھتیجوں مختشم الدولہ اور بشیر الدولہ سے یہ خدمت مہمانداری ادا کرتے تھے۔ نواب سرور الملک نواب

---

[1] کارنامہ سروری از نواب سرور الملک ص۱۵۱

شمس الامرا امیر کبیر سے اپنی پہلی ملاقات کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

نواب امیر کبیر کے مشرقی آداب

" جلوخانہ[1] میں پہنچ کر جوں ہی میں نے پالکی سے قدم باہر نکالا۔ ایک مرد لمبا قد، دوہرا جسم، ریش سفید دراز، دستار شاگرد پیشگان برسر کمر پر کوئی دس بارہ گز کا کپڑا لپیٹے ہوئے اس میں پیش قبض اڑسے ہوئے تلوار ہاتھ میں لیے آ کھڑے ہوئے اور سخت آواز میں مجھ سے کہا" یہ کیا انسانیت ہے، نواب صاحب کو تم نے اتنا منتظر رکھا" میں نے بلاوجہ چند الفاظ عذر کے کہہ دیے وہ مجھ کو ایک سہ دری کی طرف لے گیا۔ دو درجوں میں پردے پڑے ہوئے تھے۔ تیسرے درجہ میں میں نے قدم رکھا ایک پیر کہنہ سال نہایت ضعیف بشکل مریض، دستار برسر، جامہ زیب تن نہایت نورانی چہرہ، جس پر رعب دار امارت، بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ یہ خندہ پیشانی ہاتھ ماتھے پر رکھ لیا مسکراتے ہوئے نذر قبول فرما کر مسند کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ سہ دری نہایت مختصر تھی۔ صرف دری چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی الماری مسند کے پیچھے رکھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد میرا نام دریافت فرمایا۔ پھر خوب میری طرف دیکھ کر فرمایا۔

"تم سمجھتے ہو کہ تم کس ذمہ داری کی خدمت پر مقرر ہوئے ہو" میں روزِ حشر تم کو پکڑوں گا۔ اگر کچھ بھی بندگان عالی کے مذہبی یا معاشرتی خیالات میں فرق آیا"

نواب صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور فرمایا:۔

" میں ابھی سے دیکھتا ہوں کہ ایک انقلاب عظیم ہونے والا ہے۔ میں چند دن کا مہمان ہوں۔ میں کہاں حضور والا کا عہد حکومت و مختاری

---

[1] کارنامہ سروری از نواب سردار الملک ص۱۴۳

دیکھتا کہاں۔ صرف تم لوگ نگراں حال رہو گے۔ معلوم نہیں انگریز کا تعزیہ
اور تعلیم حضور پر کیا اثر دیکھا تے انگریزیت کا ریلا مثل سیلاب کون روک
سکتا ہے نئی امت جو ہمارے بعد آنے والی ہے ہماری وضع ہمارے
مراسم سے بے خبر۔ نہیں معلوم کیا شطرنج بچھائے۔ بہر حال اس قدر تو
ضرور ہے کہ مذہبی خیالات قایم رہیں اور آداب شاہی میں فرق نہ
آنے پائے۔"

"پھر عطر پیش کرنے کا حکم ہوا پہلو کے تکیے بدل دیے گئے۔ یہ
اشارہ تھا کہ برخاست۔ میں بھی سلام کر کے رخصت ہوا۔"

علم وادب کی سرپرستی

نواب امیر کبیر کے والد نواب فخر الدین خاں شمس الامرا امیر کبیر نے علم وفن کی خوب سرپرستی کی علم وادب کی خدمت ان کا نصب العین تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے ترجمہ کی طرف توجہ کی۔ یورپ اور امریکہ سے علم وفن کی جو کتابیں شائع ہوتیں تھیں ان کا اردو میں ترجمہ کرایا جاتا تھا۔ کئی مترجم بڑی بڑی تنخواہوں پر مامور ہوئے۔ ان ترجموں کی طباعت واشاعت کے لیے مطبع بھی قایم کیا گیا۔ جو حیدرآباد کا پہلا مطبع تھا۔ یہ تراجم چھ جلدوں میں "سد شمسیہ" کے نام سے شائع کیے گئے۔ اشاعت علم کے لیے نواب شمس الامرا نے حیدرآباد میں مدرسہ بھی قایم کیا۔ جو اُن کے نام کی مناسبت سے "مدرسہ فخریہ" کہلایا۔ یہ پہلا مدرسہ اور غالباً اپنی نوعیت کا واحد مدرسہ تھا جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی۔ طلبا کی ہمت افزائی کے لیے رقمی امداد اور وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ اس مدرسہ کے قایم ہونے کے بہت بعد مدرسہ دارالعلوم کی بنیاد ڈالی گئی جو بعد میں حیدرآباد کا سب سے بڑا مدرسہ بن گیا۔ مدرسہ عالیہ کی بنا بہت بعد میں ڈالی گئی۔ جو حیدرآباد میں انگریزی طریق تعلیم کا پہلا مدرسہ اور جامعہ مدراس سے ملحق تھا۔ مدرسہ دارالعلوم جامعہ پنجاب سے ملحق تھا۔

ماہ رمضان ۱۲۹۴ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۷۷ء میں نواب صاحب نے انتقال فرمایا۔

نواب رشید الدین خاں وقار الامرا۔ امیر کبیر (شریک نائب)

نواب رفیع الدین خاں شمس الامرا کے انتقال کے بعد ان کے برادر خورد نواب رشید الدین خاں وقار الامرا بتاریخ ۱۱۔ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو شریک نائب رئیس مقرر ہوئے نواب رشید الدین خاں نے ۱۹۔ ذیقعدہ ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا[1] نواب رشید الدین خاں اپنے بھائی کی طرح با وقار امیر اور وزیر با تدبیر تھے۔ لیکن سرسالار جنگ کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکے۔ خرابی تعلقات کی ایک وجہ تو امیرانہ چشمک اور کچھ مذہبی عقائد کا اختلاف بھی تھا۔ وہ ایک دلیر سپاہی تھے لیکن بہت تیز مزاج واقع ہوئے تھے۔ قد متوسط سانولا رنگ، چھریرا بدن مونچھیں ہمیشہ چڑھی ہوئی۔ کچھ زیادہ لکھے پڑھے نہ تھے۔ لیکن اپنے بڑے بھائی کی طرح انتہا درجہ فیاض اور رحم دل واقع ہوئے تھے۔ اکثر مجرمین بھاگ بھاگ کر آپ کی ڈیوڑھی میں پناہ لیتے اور قانونی سزا سے بچ جاتے۔

نواب رشید الدین خاں۔ رزیڈنٹ سر رچرڈ میڈ کی مدد اور پشت پناہی کی بنا پر بشیر الدولہ کے مقابل اعزازات و خدمات متعلقہ ایوان شاہی اور خطاب شمس الامرا امیر کبیر پانے کے مستحق قرار دیے گئے۔ سرسالار جنگ کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لیے رزیڈنٹ سر رچرڈ منڈ کی سفارش پر وقار الامرا نواب رشید الدین خاں شریک رئیس (Co-Regent) بنائے گئے۔ وقار الامرا کی تعلیمی لیاقت زیادہ

مسٹر شاپور جی مددگار نائب رئیس

نہ تھی لیکن انھیں ایک مستعد اور ہوشیار مددگار (شاپور جی) مل گیا جس کی بنا پر وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ شاپور جی[2] انگریزی تحریر و تقریر میں اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ قد میانہ اور رنگ گندمی تھا۔ شاپور جی کی کوشش سے نواب امیر کبیر اور

---

[1] کارنامہ سروری صفحہ ۱۰۹

[2] 〃 〃 〃 صفحہ ۱۵۷

رزیڈنٹ بہت قریبی دوست بن گئے اور اندر ہی اندر سر سالار جنگ کے اثر و اقتدار کو ختم کرنے کے منصوبے بننے لگے۔

سالار جنگ کے اثر و اقتدار کو ختم کرنے کے لیے امیر کبیر اور رزیڈنٹ کی کوشش

سب سے پہلے راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت کے کارخانہ آہنگراں پر اعتراض کیا گیا[1] اور یہ افواہ پھیلائی گئی کہ سر سالار جنگ راجہ گردھاری پرشاد کی مدد سے بندوقیں تیار کروا رہے ہیں۔ تاکہ بوقت فساد استعمال کی جائیں۔ قدیم احکام اور قاعدہ، تاکہ ریاست کا کوئی عہدہ دار یا اہل بلدہ بغیر اجازت خاص، سکندرآباد یا چادر گھاٹ نہ جائے توڑ دیا گیا۔ افسران فوج بے قاعدہ بھی رزیڈنسی طلب کیے جانے لگے[2] جمعداران عرب کے دماغ میں یہ بات بیٹھائی گئی کہ سر سالار جنگ والی سلطنت کو ناخواندہ رکھ کر خود ریاست کے مالک و مختار بننا چاہتے ہیں۔ لیکن رزیڈنسی سے اڑائی ہوئی ان افواہوں کا اثر نہ افواج بے قاعدہ پر ہوا اور نہ افسران محکمہ مال پر وہ حسب سابق مدار المہام ریاست کے وفادار اور وابستہ رہے۔ دوسری جانب امیر کبیر اس فکر میں تھے کہ ڈیوڑھی مبارک پر سالار جنگ کے عہدہ دار حاضر نہ رہیں کمسن حکمراں کو سالار جنگ کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ ان عناصر کا صفایا کیا جائے مسیح الزماں خاں جو مولانا زماں خاں کی شہادت کے بعد بطور اتالیق حضور مقرر ہوئے تھے سر سالار جنگ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ امیر کبیر کے دست راست بن گئے اور کم عمر حکمراں کے دل میں مدار المہام کے خلاف بدظنی پیدا کرنے لگے۔ اس درباری توڑ جوڑ کے نتیجے میں اب دو گروپ بن گئے تھے۔ ایک جانب مدار المہام سر سالار جنگ اور کپتان جان کلارک اور دوسری جانب امیر کبیر رشید الدین خاں اور رزیڈنٹ سر رچرڈ منٹ۔

---

[1] کارنامہ سروری ص ۱۵۷

[2] " " "

مولوی مسیح الزماں خاں کی یہ کوشش تھی کہ نواب میر محبوب علی خاں صرف ان ہی کے زیر نگرانی رہیں اور ایوانات شاہی میں انھیں سالار جنگ اور ان کے نامی خواہوں سے دور رکھا جائے۔ چنانچہ طے پایا کہ حضور مہتاب محل میں قیام فرمائیں گے اور کبھی کبھی محلات میں جانے کا موقع دیا جائے گا۔ سرورالملک کے درس کے لیے سلیمان جاہ کی ڈیوڑھی میں تشریف لے جائیں گے[1] جب سرورالملک چو محلہ پیالس میں والی سلطنت کی پیشی میں رہنے لگے تو مسیح الزماں انھیں چو محلہ سے کسی اور مقام پر منتقل کرنے کی فکر کرنے لگے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سر سالار جنگ نے رزیڈنٹ سر رچرڈ منڈ کو لکھا کہ اصل رزیڈنسی کا مقام بلارام ہے اور چادر گھاٹ میں کوٹھی صرف بوقت ضرورت برائے عارضی قیام رزیڈنٹ کو دی گئی ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ کوٹھی چادر گھاٹ خالی کر کے ریاست کو دے دی جائے۔ تاکہ حضور نظام کی تعلیم گاہ بنائی جا سکے۔ رچرڈ منڈ نے بہ ظاہر کوئی اعتراض نہیں کیا اور امکان تھا کہ کوٹھی ریاست کو واپس مل جاتی اس عرصہ میں امیر کبیر نے غالباً رزیڈنٹ کی شہ پر والدہ ماجدہ صاحبہ حضور نظام کو یہ باور کرایا کہ مختار الملک سالار جنگ کمسن بادشاہ کو انگریزوں کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں اس طرح سالار جنگ کی یہ تجویز محلات سے نامنظور کی گئی اور پرانی حویلی میں قیام گاہ اور مدرسہ کا انتظام کیا گیا[2] اس واقعہ کے بعد ایوان شاہی کی منھ چڑھی ماماؤں نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہ پور جی رات کے خاصہ میں یاد کیے جانے لگے[3] سالار جنگ نو عمر حکمراں کو رزیڈنٹ سے دور رکھنا چاہتے تھے ادھر رزیڈنٹ سر رچرڈ منڈ نے کہلا بھیجا کہ مقررہ درباروں کے علاوہ وہ جب چاہیں حضور سے خانگی ملاقات کر سکیں گے۔ یہ تجویز تمام امرا عظام کو پسند نہ تھی۔ لیکن مصلحت کی بنا پر وہ مخالفت نہ کر سکے۔ سر سالار جنگ نے چادر گھاٹ پل پر چند ہر کارے مقرر کر دیے اور راجہ گردھاری

---

[1] کارنامہ سروری ص ۱۴۲

[2] " " ص ۱۴۳

[3] " " ص ۱۴۳

ایک روز رزیڈنٹ گرجا پرشاد کو ہدایت کی کہ رزیڈنٹ کی آمد سے پہلے انھیں مطلع کیا جاتے۔ ایک روز رزیڈنٹ
پرشاد کو ہدایت کی کہ رزیڈنٹ کی آمد سے پہلے انھیں مطلع کیا جاتے۔
گھوڑے پر سوار تنہا چادرگھاٹ پل پر آئے رزیڈنٹ کو دیکھتے ہی تمام ہرکارے چاروں
طرف دوڑ پڑے اسی عرصہ میں جمعیت نظام آ پہنچی اور رزیڈنٹ کی سلامی کے لیے
صف آرا ہونے لگی۔ رزیڈنٹ نے برہم ہو کر راجہ گردھاری پرشاد سے دریافت کیا کہ کس
کے حکم سے یہ سلامی دی جارہی ہے۔ راجہ نے عرض کیا کہ ہم کسی کے حکم کے تابع نہیں
ہیں۔ لیکن اپنے فرائض سے کبھی غافل نہیں رہ سکتے[1] اسی عرصہ میں نواب امیر کبیر، نواب
مختار الملک سالار جنگ اور پیشکار مہاراجہ بہادر (راجہ نریندر پرشاد) آ پہنچے۔ اس طرح
رزیڈنٹ کی کوشش کہ حضور نظام سے خانگی ملاقات کریں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

اخبار اسٹیٹمین کی ایک خبر سے رزیڈنٹ سر رچرڈ کی بدنامی

اس زمانہ میں اخبار اسٹیٹ مین مورخہ ۸۔ اپریل ۱۸۸۴ء میں ایک خبر شائع ہوئی
کہ امیر کبیر، رزیڈنٹ سے ملاقات کے لیے رزیڈنسی تشریف لے گئے اس وقت
امیر کبیر زمرد کا ایک قیمتی ہار پہنے ہوئے تھے۔ لیڈی رچرڈ منڈ نے نواب صاحب
سے اس ہار کی بڑی تعریف کی۔ امیر کبیر نے وہ ہار لیڈی صاحبہ کو پہنچا دیا۔ اور واپس
چلے گئے۔ یہ صرف ایک تہمت تھی جو سر رچرڈ کی کے چند مخالفین نے پھیلائی تھی[2]۔
امیر کبیر نے بیرسٹر پالر کے مشورہ سے اخبار کے خلاف دعوا دائر کیا۔ لیکن سر رچرڈ
کی جو بدنامی ہونا تھی وہ ہو کر رہی۔ اس خبر کی اشاعت کے کچھ دن بعد رزیڈنٹ
سر رچرڈ منڈ واپس چلے گئے اور سر اسٹوارٹ بیلی رزیڈنٹ مقرر ہوئے سر بیلی
مختار الملک کے قدرداں تھے۔ کچھ زمانہ بعد امیر کبیر رشید الدین خاں نے انتقال
کیا اور ان کے بعد کوئی شریک نائب مقرر نہ ہوا۔ سر اسٹوارٹ بیلی کی صلح کن پالیسی
کی وجہ سے امرا پائیگاہ کے اختلافات بھی ختم ہو گئے خطاب "سر" و "شمس الامرا"
امیر کبیر اور نشست خواصی و مورچھل وغیرہ نواب خورشید جاہ کو اور خطاب "سر"

---

[1] کارنامہ سروری ص ۱۷۸
[2] ″ ″ ″ ص ۱۹۲

"آسمان جاہ" امیر اکبر نواب بشرالدولہ کو عطا ہوئے[1] سر اسٹورٹ بیلی کے جانشین مسٹر جونز ہوئے وہ اپنے پیش رو کی طرح سر سالار جنگ کے خلوص کے معترف رہے۔ جاں کلارک نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ والی ریاست کو سفر انگلستان کے لیے آمادہ کر لیا اور اس سفر سے متعلق ایک خط حضور کی جانب سے وائسرائے کو لکھا گیا سر سالار جنگ اس سفر کے سخت خلاف تھے لیکن بات اب اس قدر آگے بڑھ گئی تھی کہ وہ کھلی مخالفت نہ کر سکے۔ سفر کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ لیکن سر سالار جنگ کا اچانک انتقال ہوگیا اور سفر انگلستان کا ارادہ ہمیشہ کے لیے ملتوی ہوگیا۔

ریجنسی کے اس نازک زمانہ میں۔ شریک ریجنٹ نواب رشید الدین خاں امیر کبیر کی مخالف سالار جنگ پالیسی نے رزیڈنٹ کے اثر و رسوخ کو بڑھا دیا تھا۔ کم عمر حکمراں اپنے ان دو عالم، بیدار مغز اور بزرگ امرا کی اس مخالفت سے خائف رہتے تھے۔ ادھر والدہ ماجدہ (میر محبوب علی خاں) بھی سالار جنگ کی زیادہ طرفدار نہیں تھیں۔ ان حالات میں حضور میر محبوب علی خاں صرف رزیڈنٹ کے مشورہ کو قبول کرنے کے لیے مجبور تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ انگریز رزیڈنٹ سر رچرڈ میڈ سر سالار جنگ کی تمام خدمات کو فراموش کر چکا تھا اور ان کا سخت مخالف ہوگیا تھا۔ اگر سالار جنگ اول ان مخالف حالات کا مصلحت کے ساتھ مقابلہ نہ کرتے تو شاید نواب میر عالم اور راجہ چندو لعل کی طرح وہ بھی خدمت سے معزول کر دیے جاتے۔

نواب سر تراب علی خاں مختار الملک سالار جنگ اول مدت مدار المہامی ۱۸۵۳ء تا ۱۸۸۳ء

نواب سر تراب علی خاں سالار جنگ اول حیدرآباد کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ تین آصف جاہی حکمرانوں کے عہد میں یعنی نواب ناصر الدولہ آصف جاہ

---

[1] کارنامہ سروری ص ۱۹۴

رابع (چہارم) کے دور میں ۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۷ء (۴ سال) نواب ناصر الدولہ آصف جاہ خامس (پنجم) کے دور میں ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء (۱۲ سال) نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس (ششم) کے دور حکومت میں ۱۸۶۹ء تا ۱۸۸۳ء اس طرح تقریباً تیس[۳۰] سال تک اس ریاست کے سب سے اعلا اور کلیدی عہدہ مدار المہامی پر فائز رہے۔ مخالفین کی سخت مخالفت کے باوجود وہ مقدور بھر ریاست کی خدمت کرتے رہے۔ تنظیم مالگزاری اور اصلاحات دیوانی کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

وطن اور سلسلہ نسب

نواب سالار جنگ اول کے جد اعلی اویس قرنی تھے۔ جو یمن کے باشندے تھے لیکن انھوں نے مدینہ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہ پیغمبر اسلام کے صحابی تھے اور جنگ ـــــ میں درجہ شہادت پائی۔ اسی قرنی خاندان کے چشم و چراغ اویس ثالث مدینہ کے اوقاف کی مہتمی پر فائز تھے اور ان کی علمی صلاحیت کی بنا پر انھیں بڑے احترام اور قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اویس ثالث نے اپنے فرزند شیخ محمد علی کے ساتھ ترک وطن کیا اور سترھویں صدی عیسوی میں بحرین سے ہوتے ہوئے ہندوستان کے ساحل کوکن پہنچے اس زمانہ میں بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا دربار علماء۔ شعرا انشاپردازوں اور دیگر فن کاروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس علمی و ادبی ماحول سے متاثر ہو کر اویس ثالث اور ان کے فرزند شیخ محمد علی نے بیجاپور کو اپنا وطن بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ شیخ محمد علی کے دو فرزند شیخ باقر اور شیخ محمد حیدر تھے جو عادل شاہی اور مغل درباروں میں اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ یہ دونوں اصحاب بڑے عالم اور بلند پایہ مصنف تھے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں ایک بیش ترین قرآن مجید موجود ہے جس پر محمد علی اور محمد باقر کی مہریں ثبت ہیں اور جس کو انھوں نے اپنے افراد خاندان کے لیے ۱۶۵۷ء میں وقف کیا۔ اس خاندانی قرآن کو سالار جنگ کے کتب خانہ کی خشت اول سمجھنا چاہیے۔

محمد باقر کے پوتے شیخ شمس الدین محمد حیدر تھے۔ جنھیں نواب نظام الملک

آصف جاہ اول اور بعد کے آصف جاہی حکمرانوں نے منیرالملک اول۔ منیرالدولہ حیدر یار خاں۔ شیر جنگ کے خطابات عطا کیے۔

آخری عمر میں شیخ شمس الدین منیرالملک اول اور اورنگ آباد کے صوبہ دار مقرر کیے گئے اور ۱۷۷۵ء میں وہیں انتقال کیا۔ ان کے جمع کردہ کئی مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔

نواب منیرالملک اول شیر جنگ کے دو فرزند شیخ محمد صفدر اور شیخ محمد تقی تھے۔ شیخ محمد صفدر غیور جنگ کی شادی درگاہ قلی خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو آصف جاہ اول کے دور میں اہم مرتبہ رکھتے تھے۔ غیور جنگ کا انتقال ۱۷۹۰ء میں ہوا۔ نواب غیور جنگ کے تیسرے فرزند علی زماں خاں منیرالملک ثانی تھے۔ جن کو نواب میرعالم کی پہلی صاحب زادی نفیسہ بیگم بیاہی گئی تھی۔ جن کے بطن سے دو صاحب زادے محمد صفدر خاں ذوالقدر جنگ اکرام جنگ اور عبداللہ قوی جنگ تولد ہوئے۔ نفیسہ بیگم کی وفات کے بعد میر عالم کی دوسری صاحب زادی صاحبہ بیگم منیرالملک ثانی سے بیاہی گئیں جن کے بطن سے دو فرزند محمد علی خاں شجاع الدولہ اور میر علی خاں مشیر جنگ سراج الملک تھے۔ نواب تراب علی خاں سالار جنگ اول شجاع الدولہ کے فرزند اور نواب سراج الملک کے بھتیجے تھے۔ سالار جنگ اول کا نواب میر عالم سے ننہیالی رشتہ تھا۔ وہ سر سالار جنگ کے پرنانا ہوتے تھے۔

سر سالار جنگ ۲۔ جنوری ۱۸۲۹ء کو بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے۔ صغر سنی ہی میں والد شجاع الدولہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ جد امجد نواب منیرالملک ثانی بھی ۱۸۳۲ء میں انتقال کر گئے۔ اس لیے ان کے چچا نواب سراج الملک ثانی ان کے سرپرست تھے۔ خورد سالی میں سر سالار جنگ سخت علیل ہوئے اور لڑکپن میں وہ بہت کمزور اور لاغر تھے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر سے گھریلو تعلیم شروع ہوئی۔ سراج الملک تقریباً دو سال مدار المہام رہے اور انھیں بڑا ناموافق زمانہ ملا تھا۔ اس لیے سراج الملک ہمیشہ متفکر رہا کرتے تھے۔ نواب ناصرالدولہ کی خفگی اور شجاع الدولہ کے کثیر قرضہ کی وجہ سے تمام جاگیرات ضبط تھیں۔ صرف دو گاؤں سر سالار جنگ کی دادی کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے۔ سر سالار جنگ کی تعلیم و تربیت ان کی دادی یعنی صاحب بیگم

دختر میر عالم کی سرپرستی اور نگرانی میں ہوئی۔ مدارالمہام کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہنے کے باوجود نواب سراج الملک ؔ قرضوں میں مبتلا تھے۔ اس زمانہ میں ادائی قرضہ کا اطمینان دلانے تک قرض خواہ مقروض کی میت کو اٹھانے نہ دیتے تھے۔ اس لیے سراج الملک علیل ہوکر طبی مشورہ کی بناپر اُس کوٹھی کو چلے گئے جو اب تھیری اسس ہوٹل اور کبھی ویکاجی کے ہوٹل کے نام سے مشہور تھی اور وہیں ۱۸۵۳ء میں انتقال کیا۔ جب انتقال ہوا تو اس خبر کو راز میں رکھا گیا۔ میت کو چھپا کر دیوڑھی لایا گیا اور بڑی عجلت کے ساتھ مراسم تجہیز وتکفین ادا کیے گئے۔[1]

۲۶۔ مئی ۱۸۵۳ء کو نواب سراج الملک کا انتقال ہوا اور پانچ دن بعد ۳۰۔ مئی ۱۸۵۳ء کو عام دربار میں رزیڈنٹ کرنیل لوکی موجودگی میں نواب ناصرالدولہ آصف جاہ چہارم نے نواب سالارجنگ کو خدمت مدارالمہامی پر مامور کیا۔ اس وقت نواب صاحب کے جو جذبات تھے اس کا اندازہ ان کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے مسٹر ڈیٹن کو لکھا تھا۔

> "جی چاہتا تھا کہ مرحوم کی جاگیر پر قابض رہ کر گوشہ نشینی میں گزاروں اور اپنی عمر ان خدشات اور افکارات میں نہ گزاروں جو عہدہ دیوانی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ خصوصاً ان دنوں جب کہ حوادث گوناگوں سے ایک تلاطم پیدا ہے۔"

جب سالارجنگ کا تقرر بہ حیثیت دیوان مدارالمہام ہوا اس وقت ان کی عمر بمشکل ۲۴ سال تھی۔ جس پریشان کن اور بحرانی دور میں انھوں نے عنان دیوانی سنبھالا وہ کسی تجربہ کار معمر سیاست داں یا ایڈمنسٹریٹر کے لیے بھی درد سر ہو سکتے تھے۔ ناصرالدولہ کا آخری زمانہ تھا اور برار کے علاقہ سے دست بردار ہونے کے بعد کئی نئے معاشی مسائل اُٹھ کھڑے ہو گئے تھے۔ افضل الدولہ بڑے مرنجا مرنج حکمراں تھے اور انگریزوں کی مخالفت سے ہمیشہ بچنا چاہتے تھے۔ میر محبوب علی خاں کی کمسنی اور ریجنسی کونسل کے تقرر کے بعد وہ شریک ریجنٹ کے

---

[1] کارنامہ سروری از سرورالملک

مشورہ کے بغیر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ لیکن جب تک رفیع الدین خاں امیر کبیر ریجنٹ رہے انھوں نے سالار جنگ کی زیادہ مخالفت نہیں کی۔ لیکن جب نواب رشید الدین خاں وقار الامرا ۔ امیر کبیر اور شمس الامرا بن گئے اور نواب صاحب کے ساتھ شریک ریجنٹ بنائے گئے تو سالار جنگ کو بڑے ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر رزیڈنٹ سر رچرڈ منڈ اور والدہ ماجدہ حضور نظام کی ناراضگی، ان کے کام کو مشکل بنا رہی تھی۔ رشید الدین خاں امیر کبیر کے بعد جب کوئی شریک ریجنٹ نہیں بنا تو سالار جنگ کو انتظام مالگزاری اور دیوانی میں اصلاح کا موقع ملا۔ خوش قسمتی سے اس زمانہ میں نئے رزیڈنٹ کی تائید انھیں حاصل رہی جس کی وجہ سے درباری سازشوں اور نوجوان حکمراں کی ناراضگی سے وہ بچے رہے۔

مالیاتی استحکام کے لیے سر سالار جنگ کے اقدامات

اس زمانہ میں عربوں اور پٹھانوں کے مقروض نہ صرف یہاں کے عوام تھے بلکہ حکومت کے کئی قصبات اور جاگیرداروں کے کئی تعلقہ جات ان کے پاس رہن تھے۔ قلیل قرضوں پر گراں بہا سود مقرر تھا اور مقروض کی نجات کسی طرح ممکن نہ تھی۔ سالار جنگ نے ابتداً عمر بن عوض سے تیرہ لاکھ کے مالگزاری کا علاقہ واپس لے لیا۔ اور اس سردار کی بے بسی کے بعد دیگر عرب اور پٹھان سرداروں پر قابو پانا مشکل نہ رہا۔ کئی جاگیرات جو اُن کے پاس رہن رکھی گئی تھیں واگذاشت کی گئیں۔ عربوں اور پٹھانوں کو جس قدر ممکن ہو سکا نقد رقم خزانہ سے دی گئی اور بقایا رقم کے لیے ساہوکاروں اور گوساہوں کی ضمانت دی گئی۔ دیوانی سے حکمراں وقت کو حبیب خاص اور ان کے رشتہ داروں کو ماہانہ منصب اجرا ہوتی تھی۔ نواب سالار جنگ نے ان اخراجات میں بہت کچھ کمی کر دی اور باضابطگی پیدا کر دی۔ بے قاعدہ فوج میں تخفیف کر دی گئی۔ فوج پولیس اور دیگر عملے کی تنخواہیں پابندی سے ادا کی جاتی تھیں۔ ورنہ پہلے ہر ہفتہ عشرہ میں عرب اور پٹھان، کبھی پولیس اور کبھی فوج تنخواہ کی ادائی کے لیے دنگا فساد کیا کرتے تھے۔ ڈیوڑھیوں کے پھاٹک بند ہو جاتے اور ساہوکاروں کی بے عزتی ہوتی تھی۔ نئے مدارالمہام نے اعلان

کر دیا کہ فوج اور پولیس کے وہ جوان جو حکومت کی ملازمت چاہتے ہوں وہ اپنی بقایا تنخواہ سے دست بردار ہو جائیں اور آئندہ ماہ یملہ تنخواہ حاصل کریں اور وہ فوج یا پولیس کے جوان جو ملازمت سرکاری کو چھوڑنا چاہتے ہیں وہ اپنی بقایارقم مدارالمہام کی دفتر سے حاصل کریں۔

اس زمانہ میں سرکاری ملازمت، عزت واحترام کا درجہ رکھتی تھے۔ اس لیے فوج اور پولیس کے جوان اپنی بقایا تنخواہ سے دست بردار ہو گئے اور حکومت کی ساکھ بھی قایم رہی۔ تنخواہوں کی پابندی سے ادائی کے بعد ملازمین سرکار جوانان پولیس، فوج اور فوج بے قاعدہ بہت مطمئن ہوئے اور قرض خواہوں کے ظلم سے بڑی حدتک بچ گئے۔

معاشی حالات کے اس قدر سدھر جانے کے بعد مدارالمہام انتظام مالگزاری اور دیوانی کی جانب متوجہ ہوئے۔

انتظام مالگزاری و دیوانی

انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک ریاست حیدرآباد کے امور سلطنت شہر حیدرآباد میں واقع صرف دو دفاتر یعنی دفتر مال و دیوانی کے ذریعہ انجام پاتے تھے۔ جو دفترداروں کی نگرانی میں کام کرتے تھے دیوان یا مدارالمہام ریاست کے کاروبار ایک دارالانشاء کے ذریعہ انجام پاتے تھے شہر حیدرآباد میں چند عدالتیں اور کچھ پولیس کا انتظام تھا۔ اضلاع میں پولیس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ وصولی مالگزاری کے لیے" علاقے" تعہداروں کو ٹھیکے پر یا تعلقداروں کی مکمل عمل داری میں دیے جاتے تھے۔ اس طریق انتظام سے ریاست کی آمدنی بہت کم ہوگئی تھی بلکہ خزانہ خالی رہتا تھا۔ اس کے برعکس اخراجات میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مالگزاری سالانہ ایک کروڑ روپے سے زائد نہ تھی۔ آبکاری کی آمدنی بمشکل ایک لاکھ روپے تھی دیگر مدات یعنی کروڑگیری۔ جنگلات وغیرہ کی آمدنی بس برائے نام تھی خسارہ تقریباً ۳۰ لاکھ روپے سالانہ پہنچ چکا تھا۔ نواب سالار جنگ نے سب سے پہلے طریق تعہداداری کا خاتمہ کیا۔ کم سود پر نئے قرض حاصل

کیے گئے اور ان قرضوں کی ادائی کی گئی جن کی شرح سود زیادہ تھی۔ اس طرح جو بچت ہوئی اسے مکفول علاقوں کی بازیابی پر خرچ کیا گیا۔ نتیجتاً چند ہی سال میں آمدنی میں پچاس لاکھ روپے کا اضافہ ہوگیا۔ اضلاع رائچور اور عثمان آباد کی بازیابی سے سالانہ مزید ستائیس لاکھ روپیوں کا اضافہ ہوگیا۔

۱۸۶۵ء میں خزانہ سرکاری قائم کیا گیا اور اس سال وصولی مالگزاری کے لیے ضلع بندی کی گئی۔ جس کے تحت ریاست کو اضلاع، تعلقوں اور مواضعات پر تقسیم کر کے ان کے حدود معین کیے گئے۔ مالگزاری جو پہلے نقدی اور جنس کی صورت میں وصول کی جاتی تھی اب صرف نقدی میں وصول کی جانے لگی بے چراغ مواضعات کی باز آبادی اور وسیع الرقبہ قابل کاشت افتادہ اراضیات کو زیر کاشت لانے کے لیے اجارہ داری کا طریقہ نافذ ہوا۔ اس طریقہ کے تحت اراضیات برائے نام محاصل پر طویل مدت کے لیے اجارے پر دی جاتی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ محاصل میں تدریجی اضافہ کیا جاتا تھا۔ بے چراغ مواضعات کے آباد کنندگان کو اس موضع کا پٹیل مقرر کیا گیا۔ ابتداً اضلاع کی تعداد ۱۴ اور تعلقوں کی ۷۳ تھی۔ ۱۸۷۵ء میں محکمہ پیمائش و بندوبست کا قیام عمل میں آیا اور صوبہ متحدہ (یوپی) اور بمبئی کے طریقہ پیمائش کو آزمایا گیا۔ بالآخر صوبہ بمبئی کا طریقہ پیمائش زیادہ مناسب ثابت ہوا اور اس کو اختیار کیا گیا۔ ہر ضلع پر تنخواہ یاب تعلقدار اور تعلقہ پر تحصیلدار کا تقرر کیا گیا۔ چونکہ تعلقداروں سے مراسلت کافی بڑھ گئی تھی اس لیے دارالانشا ناکافی تھا اس غرض کے لیے ایک جدید محکمہ منشی خانہ" قایم کیا گیا۔ ۱۸۶۵ء میں منشی خانہ برخاست کر کے علاقہ دیوانی کے امور مالگزاری کی نگرانی کے لیے مجلس مال قایم کی گئی۔ سنہ ۱۸۶۸ء میں ریاست کو پانچ اسمات میں تقسیم کر کے ہر سمت پر ایک صدر تعلقدار مقرر کیا گیا اور مجلس مال برخاست کر دی گئی۔ ایک سال کے بعد یہ انتظام بھی ختم کر دیا گیا اور صدر المہامین (وزرا) کے تقررات عمل میں آئے۔ ہر صدر المہام کے تحت چند محکمے اور ایک معتمدی قایم کی گئی۔ مال کا کام صدر المہام مالگزاری کے تحت دیا گیا۔ نواب مکرم الدولہ جو نواب سالار جنگ کے بھانجے تھے۔ صدر المہام مال۔ نواب بشیر الدولہ (آسمان جاہ) صدر المہام

عدالت۔ شمشیر جنگ صدرالمہام کوتوالی اور نواب شہاب الدین صدرالمہام متفرقات و تعمیرات۔ صفائی۔ تعلیمات۔ طباعت۔ مقرر کیے گئے۔ سر سالار جنگ کی ان اصلاحات اور انتظام کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۳ء میں جو اُن کی زندگی کا آخری سال تھا خزانہ سرکاری کی مجموعی آمدنی تین کروڑ گیارہ لاکھ ہوئی انتقال کے دن ۱۸ لاکھ روپے خزانہ عامرہ میں تھے۔

واپسی برار کے لیے سر سالار جنگ کی کوشش

سر سالار جنگ نے معاشی استحکام اور مالی اصلاحات میں کامیابی کے بعد برار کے واپسی کے لیے کوشش شروع کی۔ سر سالار جنگ کے چچا نواب سراج الملک کی مدار المہامی کے آخری زمانہ میں عہدنامہ ۱۸۵۳ء کی رو سے برار رائچور دوآبہ اور مغربی علاقہ انگریزوں کے قبضہ و اقتدار میں چلا گیا تھا اور نواب سالار جنگ عہدنامہ ۱۸۵۳ء کو اپنے خاندان کے ماتھے پر کلنک تصور کرتے تھے اور ان کی بڑی آرزو تھی کہ برار کا علاقہ واپس لے لیا جائے۔

نواب میر عالم کے زمانہ سے سالار جنگ کے خاندان نے کافی غور کے بعد انگریز دوستی کی پالیسی اختیار کی تھی۔ دکن کے گرد و پیش کے حالات اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار کے پیش نظر اس حکمت عملی کا جواز پیدا ہو رہا تھا۔ اس پالیسی سے ریاست کو کچھ فائدے بھی حاصل ہوئے تھے۔ حالانکہ عوامی جذبات انگریزوں کے شدید خلاف تھے۔ سالار جنگ اپنے پرنانا کی پالیسی پر کاربند رہے اور جنگ آزادی کے موقع پر رزیڈنٹ اور رزیڈنسی کا تحفظ کرتے رہے۔ انگریز حکومت نواب سالار جنگ کی پالیسی سے متفق رہی۔ ۱۲۸۴ھ م ۱۸۶۷ء میں حکومت برطانیہ کی جانب سے آپ کو اسٹار آف انڈیا کا اعزاز اور تمغہ عطا کیا گیا۔

۱۲۸۵ھ م ۱۸۷۱ء میں نواب سالار جنگ کو G.C.S کا اعزاز ملا جو اس زمانہ میں صرف والیان ریاست کو دیا جاتا تھا۔ ۱۲۹۳ھ م ۱۸۷۶ء میں آپ انگلستان تشریف لے گئے جہاں آپ کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ ملکہ وکٹوریہ اور ولی عہد نے شخصی طور پر آپ کی مہمانداری کی۔ گلڈ ہال میں ایک شاہانہ تقریب ہوئی جس

میں آپ کو انگلستان کی شہریت کا اہم اعزاز FREEDOM OF CITY OF LONDON پیش کیا گیا۔

انگلستان کے سفر کے وقت حالات بھی بہت مناسب تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے بعد روس اس کے اثر و رسوخ سے خائف ہونے لگا روس کو اندیشہ تھا کہ انگلستان جنگ کریمیا کی طرح پھر کسی جنگ میں اس کو الجھا دے گا۔ روس نے اس بات کی کوشش شروع کر دی کہ وسط ایشیا میں اپنی قوت کو اس قدر مستحکم کرے کہ وہ انگلستان کی شہنشاہیت کے لیے ایک مستقل خطرہ بن جائے۔ اس حکمت عملی کے تحت وہ افغانستان یا اس سے قریب ایک ایسا اڈا بنانا چاہتا تھا۔ جس سے انگریزوں کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکے۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان نے مسلمانوں کے خلاف تشدد کی جو پالیسی ۱۸۵۷ء کے بعد شروع کر دی تھی وہ موقوف کر دی گئی۔ مسلمانوں کے دلوں میں ترکی کے ساتھ ہمدردی پیدا کرائی گئی تاکہ اس طرح روس کے خلاف ان کے جذبات مشتعل ہو جائیں۔ نہر سویز کے کھل جانے کی وجہ سے انگلستان اور ہندوستان کے درمیان آمد و رفت اور مواصلاتی فاصلہ کم ہو گیا۔ شمالی مغربی سرحدات اور افغانستان کے معاملات کا اثر حیدرآباد اور دیگر دیسی ریاستوں پر امپیریل سروس ٹروپ کی شکل میں پڑا۔ ہندوستان کی داخلی اور خارجی امور میں ہوم گورنمنٹ کی مداخلت شروع ہو گئی اور وائسرائے کے اختیار تمیزی پر پابندی عائد ہو گئی۔ روس کے خلاف مسلمانوں کو بھڑکانے اور انگلستان کے لیے ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے مقصد سے انگریز حکومت نے خانقاہوں کی امداد، تعلیم گاہوں کو چندے مشائخین کو وظائف اور حجاج کے قافلے بڑے انتظام اور اہتمام سے روانہ کیے گئے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد سے متعلق قدیم انگریز پالیسی بالکل بدل گئی اور حیدرآباد کو سلطنت مغلیہ کی "یادگار" اور عمداً "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ اس سیاسی پس منظر میں نواب سالار جنگ نے مناسب سمجھا کہ بلا توسط وائسرائے گورنر جنرل ہند، خود راست طور پر انگلستان سے واپسی برار کا مطالبہ کریں۔

انگلستان کو روانگی سے قبل اپنی ملاقات میں نواب سالار جنگ نے رزیڈنٹ حیدرآباد سر رچرڈ منڈ سے کہا "یا تو برار کو واپس لوں یا مر جاؤں تو مجھے چین آئے گا"۔ نواب صاحب نے بحیثیت ریجنٹ اس مسئلہ کو یہ کہہ کر اٹھایا کہ علاقہ برار واگذشت ہو تو اسّی لاکھ پونڈ خرچ کنٹیجنٹ وہ انگریز حکومت کو ادا کرنے کو تیار ہیں۔ اس بات کو لارڈ سالسبری وزیر اعظم نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اعلیٰ حضرت نابالغ ہیں۔ ان کی تخت نشینی کے بعد اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا۔ اس طرح سالار جنگ اپنے اثر و رسوخ کے باوجود اس مشن میں ناکام رہے۔

لندن میں قیام کے دوران منشی محمد صدیق نواب صدیق یار جنگ معتمد دفتر ملکی بھی نواب صاحب کے ہمراہ تھے انھوں نے عرض کیا کہ لندن کے کتب فروشوں کے پاس کئی نادر کتابیں ہیں جو نواب صاحب کے کتب خانہ کے لیے موزوں ہیں نواب صاحب نے تمام قدیم نادر کتب کی خریداری کا حکم دیا۔ جب قدیم نادر کتابیں خرید لی گئیں تو پھر صدیق یار جنگ نے عرض کیا کہ "کتب فروش کے پاس قرآن مجید کے بہت سارے نسخے ہیں۔ ان کو ملازمین بڑی بے احتیاطی کے ساتھ اوپر نیچے اور نیچے سے اوپر لے جاتے ہیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ اس کا احترام کیا ہے" یہ سنتے ہی نواب صاحب نے حکم دیا کہ جس قدر بھی قرآن مجید کے نسخے کتب فروش کے پاس موجود ہوں وہ سب کے سب ہدیہ کرا لیے جائیں۔ چنانچہ جتنے بھی قرآن مجید کے قلمی و مطبوعہ نسخے تھے وہ سارے کے سارے کتب فروش سے لے لیے گئے ان میں سے کئی قلمی نسخے آج بھی کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔

انگلستان سے واپس ہوتے ہوئے نواب سالار جنگ نے روم میں قیام کیا اطالوی شہنشاہ اور پوپ سے ملاقات کی۔ روم میں آپ نے وہ نادر اسٹاچو ویلڈ ربیکا VEILED REBECCA خریدا جو آج بھی سالار جنگ نیشنل میوزیم میں سیاحوں کا مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔ اس نادر اسٹاچو کے علاوہ سر سالار جنگ کئی نادر اشیا اور مخطوطات لے آئے جو آج بھی سالار جنگ میوزیم میں موجود ہیں۔

فرانس میں نواب سالار جنگ کو ایک حادثہ پیش آیا اور ان کے ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جس کی وجہ سے آخر عمر تک لنگ باقی رہا اس حادثہ کے باوجود نواب

صاحب نے اپنا سفر جاری رکھا۔

لقب "ملکہ معظمہ قیصر ہند" کا دہلی دربار

جب لارڈ لٹن گورنر جنرل ہند اور وائسرائے ہو کر آئے تو اس خوشی میں کہ ملکہ معظمہ نے قیصر ہند کا خطاب قبول کیا، دہلی میں دربار منعقد کرنا طے پایا۔ دربار کی تاریخ یکم جنوری ۱۸۷۷ء مقرر ہوئی۔ اس دربار میں ہندوستان کے تمام والیان ریاست کی شرکت کو لازمی قرار دیا گیا۔ سر سالار جنگ دیکھ چکے تھے کہ بمبئی میں پرنس آف ویلز کے استقبال میں شرکت سے حضور نظام کو روکنے کا کیا نتیجہ ہوا۔ اس موقع پر انھیں اقتدار اعلا کا خیال دل سے نکال دینا پڑا اور تاج برطانیہ کا برتری اور حکمرانی کا کھلم کھلا اعتراف کرنا پڑا۔ ۲۲۔دسمبر ۱۸۷۶ء کو حضور نظام محبوب علی خاں کی سواری دہلی میں داخل ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر دس سال تھی۔ اس موقع پر بڑے شان و شوکت کا اظہار کیا گیا۔ دربار کے موقع پر سالار جنگ نے بحیثیت ریجنٹ تقریر کی اور حضور پُر نور کی جانب سے ملکہ معظمہ کی خدمت میں خطاب قیصر ہند اختیار کرنے کی مبارک باد پیش کی۔ لیکن انگریز حکام کے دلوں میں سر سالار جنگ کے خلاف جو جذبات بمبئی میں حضور نظام کی غیر موجوگی کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے وہ دہلی دربار کے جوش و خروش پر کم نہ ہو سکے۔ حیدر آباد کے رزیڈنٹ سر رچرڈ منٹڈ حیدر آباد کے امرا اور عہدہ داروں سے اپنی نجی ملاقاتوں میں سر سالار جنگ کے خلاف اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں سر سالار جنگ حیدر آباد کے نظام بننا چاہتے تھے اور اس مقصد کے تحت کمسن حکمراں (میر محبوب علی خاں) کو اچھی تعلیم نہیں دی گئی۔ لیڈی رچرڈ نے سرور الملک[1] سے شکایت کی کہ امیر کبیر جب رزیڈنسی آتے ہیں تو اپنے خدم و حشم کو باہر پھاٹک پر چھوڑ آتے ہیں لیکن سر سالار جنگ جب رزیڈنسی آتے ہیں تو ایسا نہیں کرتے اور رزیڈنسی کی سیڑھیوں تک ان کا جلوس چلا آتا ہے جس کے شور و غل سے لیڈی صاحبہ کو اکثر سر کا درد ہو جاتا ہے۔

---

[1] کارنامہ سروری از نواب سرور الملک

نواب میر محبوب علی خاں کی ابتدائی تعلیم و تربیت

بحیثیت ریجنٹ و مدارالمہام نواب سالار جنگ جہاں ریاست کے امن، انتظام اور استحکام کے ذمہ دار تھے وہیں ان پر کم عمر حکمراں کی تربیت اور نگرانی کی ذمہ داری بھی تھی۔ جس کو نواب صاحب نے انتہائی خلوص اور دیانت سے انجام دیا۔ رزیڈنٹ کا اثر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کم عمر حکمراں کے استاد اور اتالیق کا انتخاب اور تقرر بھی رزیڈنٹ کے ایما اور مشورہ سے کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں وائسرائے ہند کا مشورہ اور رضامندی بھی ضروری تھی جو خود کو نابالغ نظام کا قانونی ولی قرار دے چکے تھے۔

سر سالار جنگ نے حضور نظام (میر محبوب علی خاں) کی تعلیم کے نگراں کی حیثیت سے کیپٹن جان کلارک کا نام تجویز کیا جو ایک مشہور ماہر تعلیم تھے۔ انگریز حکومت نے اس تقرر پر اپنی رضامندی دے دی۔ نواب سالار جنگ چاہتے تھے کہ کیپٹن جان کلارک کے ساتھ کچھ ایسے اتالیق بھی ہوں جو نہ صرف مشرقی علوم و فنون کے ماہر ہوں بلکہ ہندوستانی تہذیب کے پرستار بھی ہوں تاکہ حکمراں مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم و آداب سے بھی متعارف ہو سکے۔ چنانچہ سالار جنگ نے کیپٹن جان کلارک کے مددگار (اسسٹنٹ) کی حیثیت سے آغا مرزا بیگ نواب سرور الملک کا نام تجویز کیا جس کو برٹش گورنمنٹ نے پسند کیا۔

مجموعہ معلومات سلطنت

نواب سالار جنگ نے نو عمر حکمراں کو جہاں بانی اور رموز سلطنت سے واقف کرانے کے لیے ایک مجموعہ معلومات سلطنت خود تحریر کیا۔ شاہی تربیت کے لیے اپنے فرزند میر لائق علی خاں اعتماد السلطنہ نواب ظفر جنگ فرزند نواب سر خورشید جاہ اور مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت کو آپ کا ہم جماعت اور مصاحب بنایا تاکہ وہ سوسائٹی کی ذمہ داری اور آداب کو مد نظر رکھ سکیں۔

دس سال کی عمر میں جب نواب میر محبوب علی خاں لارڈ کیننگ کی دعوت پر دہلی

دربار میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تو دیگر سینیر امرا کے علاوہ آپ کے ہم عمر امیرزادے نواب میر لائق علی خاں، ظفر جنگ، نواب سعادت علی خاں اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی آپ کے ہمراہ تھے۔

نواب سر سالار جنگ کے مخالفین

نواب سالار جنگ اول کے زبردست مخالف وہ لوگ تھے جن کے مفادات کو نئی اصلاح اور تنظیم سے نقصان پہنچا تھا۔ ان میں سرداران عرب، جمعدار اور پٹھان پیش پیش تھے۔ ایسے عہدہ دار بھی تھے جن کے خلاف بدنظمی کی بنا پر کارروائی کی گئی تھی۔ سالار جنگ اول نے رشوت کے جرم میں ایک اعلا عہدہ دار عدالت کو دو برس کی قید دلوائی اور دو ججوں کو جنھوں نے اس واقعہ سے چشم پوشی کی تھی عہدوں سے برطرف کرا دیا۔ ایک سرکاری محاسب (خزانچی) امانت میں خیانت کا مرتکب ہوا اور اپنی خدمت سے نہ صرف برطرف کر دیا گیا بلکہ ایک عرصہ تک قید رکھا گیا۔

زمانہ غدر (ہماری جنگ آزادی) میں سالار جنگ اول نے جو انگریز دوست پالیسی اپنائی تھی اس کی بنا پر عوام شدید ناراض تھے اورنگ آباد میں جو باغی جمع ہو گئے تھے وہ سالار جنگ کے حکم سے گرفتار کیے گئے اور انگریز رزیڈنٹ کے سپرد کیے گئے۔ سالار جنگ کو دھمکی دی گئی تھی کہ وہ تمام قیدیوں کو رہا کردیں ورنہ ان کی جان کی خیر نہ ہوگی۔ شہر کے تمام دروازوں پر عربوں کا زبردست پہرہ لگا دیا گیا اور عام ہدایت دی گئی کہ "سازشی افراد" کو دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔

انگریز رزیڈنٹ خصوصاً سر رچرڈ منڈ سالار جنگ کے سخت مخالف تھے گورنمنٹ آف انڈیا (برطانیہ) اس بات کو پسند نہ کرتی تھی کہ سر سالار جنگ اس کے بعض ارادوں میں خلل انداز ہوں۔ جب ۱۸۶۶ء میں سالار جنگ اول کو تاج برطانیہ کی جانب سے "سر" کا خطاب ملا تو مخالفین نے خوب شور مچایا۔ حضور نظام کے ذہن میں یہ بات عمداً پیدا کی گئی کہ سالار جنگ

انگریزوں کے خیر خواہ ہیں اور ملکی اعزازات سے زیادہ "سر" کے خطاب پر نازاں اور شاداں ہیں ۔ رزیڈنٹ سر جارج نے بڑے فہم و فراست سے اس ہنگامہ کو دور کیا۔

۱۲۷۵ھ میں مختار الملک سالار جنگ اور بہادر رزیڈنیٹ پر دربار سے واپسی کے وقت لانبے حوض (لاڑ بازار) کے قریب جہانگیر خاں نامی ایک افغان نے قرابین کا فایر کیا ۔ سالار جنگ اور رزیڈنٹ بال بال بچ گئے جہانگیر خاں قید کر لیا گیا اور اس پر اقدام قتل کا مقدمہ چلا اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ حملہ کی پشت پناہی جن عناصر نے کی تھی وہ ظاہر نہ ہو سکے۔ دوسری مرتبہ سر سالار جنگ پر اسی وقت حملہ ہوا جب کہ وہ اپنے میانہ میں لارڈ بازار سے گزر رہے تھے۔ گولی میانے کے آئینہ کو توڑتی چلی گئی ان واقعات کے بعد احکام اجرا ہوئے کہ سوائے ملازمین سرکار کوئی شخص اسلحہ لے کر بازار میں نہ گھومے ۔ جو لوگ اپنی فوج رکھتے تھے وہ اپنے جوانوں کی ہر حرکت کے ذمہ دار قرار دیے گئے ۔ ملازمین سرکار پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ وہ اس وقت اسلحہ لگائیں جب کہ وہ اپنے آقا کے جلوس میں ہوں۔

انگریز ارباب اقتدار مدار المہام سر سالار جنگ کی لاثانی خدمات اور ان کی بیدار مغزی کے قصیدے تو پڑھا کرتے تھے لیکن اندر ہی اندر ان کے اثر و اقتدار کو توڑنے کی فکر کر رہے تھے۔ شمس الامرا کے خاندان کو ان کا حریف بنایا اور ان کے کاموں میں مساوی اختیارات کے ساتھ شریک کیا۔ پھر کونسل آف ریجنسی کی صورت قایم کی جس میں سر سالار جنگ دیگر ریجنٹ کے ساتھ کام کرنے پر مجبور کیے گئے ۔ بعض اوقات رزیڈنٹ اور وائسرائے نے اصرار کیا حضور نظام وائسرائے کے دربار میں شریک ہوں لیکن نواب سالار جنگ شاہانہ آصفی کے شریک دربار ہونے کو ان کے درجہ و شان کے خلاف سمجھتے تھے اور ان مطالبات کو ٹال دیتے۔ کہیں کسی دربار میں وہ خود بطور نیابت (ریجنٹ) شریک ہوتے اور کہیں دوسرے کسی امیر کو حضور نظام کی نمایندگی کے لیے بھیجا کرتے ۔ ۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلز نے ہندوستان کا دورہ کیا ۔ گورنر جنرل نے خواہش بلکہ مطالبہ کیا کہ حکمران نواب میر محبوب علی خاں دیگر راجگان کے ساتھ بندرگاہ بمبئی پر پرنس آف ویلز

کا استقبال کریں یہ تجویز نہ تو امرا حیدرآباد کو پسند تھی اور نہ مدارالمہام اس کو مناسب خیال کرتے تھے۔ لیکن مصلحتاً سفر بمبئی کی تیاری شروع کی گئی۔ تاریخ روانگی سے قبل حضور کی اچانک بیماری کا عذر کیا گیا اور مدارالمہام نے حضور نظام کے نمائندے کی حیثیت سے پرنس کا استقبال کیا۔ لیکن یہ ترکیب دہلی دربار کے موقع پر نہیں چل سکی اور سر سالار جنگ کو مجبوراً حضور نظام کو شرکت دربار کے لیے لے جانا پڑا۔

برار کی واپسی کے لیے سر سالار جنگ نے شدت سے مطالبہ کیا اور اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر بلا توسط وائسرائے گورنر جنرل بالا انگلستان کے اعلا حکام اور وزرائے سے تعلق قایم رکھا۔ یہ باتیں ان لوگوں کو سخت ناپسند تھیں جو ایک تجارتی کمپنی کی کرسی سے اُٹھ کر شہنشاہی اقتدار کی نمایندگی کا دعوا کر رہے تھے لارڈ میو اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"مجھے نہ افغانستان سے خوف ہے اور نہ میں نیپال کی پرواکرتا ہوں لیکن سر سالار جنگ کے خیالات سے مجھے کبھی اطمینان نہیں ہوتا جو کبھی کشمیر میں نظر آتے ہیں اور کبھی ایران میں دکھائی دیتے ہیں اور کسی وقت قبائل عرب میں ان کی سلامی اتاری جاتی ہے اور کبھی ہاؤس آف کامنس اور ہوس آف لارڈز کے ممبروں سے بات کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ میرے دفتر کی ہر بات ان کو پہنچ جاتی ہے اور یہ ان کے لیے نہایت معمولی بات ہے۔"

وائسرائے کے اس بہ ظاہر تعریفی نوٹ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دراصل ان کا منشا اور نیت کیا تھی۔ سر سالار جنگ کی زندگی میں وائسرائے اور رزیڈنٹ کچھ نہ کر سکے لیکن ان کی کوشش تھی کہ سر سالار جنگ کے بعد اس خاندان کے اثر کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ مسند نشینی کے دربار میں لارڈ رپن وائسرائے ہند نے سر سالار جنگ کی بڑی تعریف کی اور ان کی عدم موجودگی کا تذکرہ کیا جو ایک تہنیتی دربار میں قطعاً بے محل تھا۔ لیکن لارڈ رپن نے نئے بادشاہ کے نئے مدارالمہام میر لائق علی خاں کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا جیسے کہ ان کی اپنی حیثیت ہی نہ ہو۔

رزیڈنسی میں سالار جنگ کے وکیل کندہ سوامی

رزیڈنٹ حیدرآباد سے راست تعلق قایم رکھنے کے لیے نواب سر سالار جنگ کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو خود رزیڈنٹ کا با اعتماد شخص ہو اور اس قدر سیدھا سادھا آدمی ہو جو سازشی غلط بیانی خود غرضی اور اپنے نفع و نقصان کی تدبیر نہ سوچ سکے جلد ہی کندا[1] سوامی نام کا ایک شخص انھیں مل گیا جو محکمہ تعمیرات میں ٹھیکہ کا کام انجام دیتا تھا۔ سر سالار جنگ نے کندہ سوامی کو رزیڈنسی میں اپنا وکیل مقرر کیا۔ کندہ سوامی انگریزی سے بقدر ضرورت واقف تھے اور فارسی اردو سے وہ تقریباً نابلد تھے تلگوان کی مادری زبان تھی جس میں وہ مشتاق تھے۔ کندہ سوامی ایک سیدھے سادھے انسان تھے رنگ گندمی، موٹے موٹے ہونٹ، لمبے لمبے کان جن میں چھوٹے چھوٹے چھلے پہنا کرتے تھے۔ ان کا مکان بہت شاندار تھا۔ سر سبز و شاداب باغ میں اونچی کرسی کی دو منزلہ کوٹھی تھی۔ فرش و فروش میز کرسی سے آراستہ پیراستہ شیشہ آلات سے بام و در چمکتے ہوئے صدر دروازے کے آگے اہل غرض کے بیانے جمگھٹے جمع رہا کرتے تھے۔ کندہ سوامی نے نہایت خلوص کے ساتھ سر سالار جنگ کی وکالت کی اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔

سر سالار جنگ سے ملاقات کا قاعدہ اور "دیوان دیوڑھی" کے آداب[2]

نواب سر سالار جنگ کی قیام گاہ "دیوان دیوڑھی" میں آفتاب کے طلوع ہونے سے قبل اور رات میں نیم شب تک بڑی ہماہمی اور رونق رہا کرتی تھی۔ بہرہ دار روز و شب وسیع جلوخانہ میں مستعدی کے ساتھ حاضر رہا کرتے تھے ملازمین، عہدہ داران دفاتر کے میانے۔ پالکیاں، گھوڑے۔ ہاتھی اور ہودے دیوڑھی کے وسیع صحن میں ہمیشہ دکھائی دیتے تھے۔ دیوڑھی کے اندر دفتر خزانہ و محاسبی کا عملہ دکھائی دیتا تھا۔ دیوڑھی کے صدر دالان میں چوبدار فراشان وغیرہ جمع رہتے تھے۔ دالان سے زینہ پر چڑھ کر

---

۱ کارنامہ سروری از سرور الملک (کندہ سوامی ندیم سالار جنگ، صفحہ ۸۳

۲ کارنامہ سروری از نواب سرور الملک صفحہ ۹۲

مختلف کمروں میں اہلِ دربار صبح سے شام تک باریابی کے منتظر رہا کرتے تھے۔ ملاقات کے لیے وقت کا تعین قبل از قبل کیا جاتا تھا۔ اور ملاقاتی کو اس کے مقررہ وقت کے لحاظ سے علاحدہ علاحدہ کمروں میں بیٹھایا جاتا تھا۔ جن کی دیکھ بھال اور نگرانی فقیر محمد کے ذمہ تھی جو دراصل ایوان وزارت کا مارشل تھا۔ نواب سر سالار جنگ سے ایک شخص نے فقیر محمد کے جبر کی شکایت کی اس پر تحریراً جواب صادر ہوا کہ اگر آپ میرے دربار کو اپنی حاضری کے لائق نہیں سمجھتے تو آپ آئندہ تکلیف نہ فرمائیں۔[1]

معزز ترین اصحاب آئینہ خانہ میں (جو اب منہدم کر دیا گیا ہے) اپنے مقررہ دن اور مقررہ وقت پر نواب مدار المہام سے ملاقات کر سکتے تھے۔ فقرا، مشائخ اور علما کے لیے بھی علاحدہ علاحدہ ملاقات کا دن اور وقت مقرر تھا۔ ان کی ملاقات کے وقت نواب صاحب مسند چھوڑ کر فرش پر بیٹھا کرتے تھے۔ ہر ملاقاتی سے اس قدر خندہ پیشانی سے ملا کرتے کہ ہر ملاقاتی خود کو مدار المہام کا خاص مورد الطفات خیال کرتا تھا۔

لوگوں کے مانگنے اور نواب سر سالار جنگ کے نوازنے کے بھی کچھ انداز تھے ایک صاحب نے نواب صاحب کی خدمت میں ایک رباعی پیش کی جس کا ایک شعر تھا۔

کچھ نہ پوچھو کہ کیا پیتے ہیں کیا کھاتے ہیں
بیٹھ کر روز میانہ میں ہوا کھاتے ہیں[2]

نواب صاحب نے ان کا تقرر کسی خدمت پر کر دیا اور زندگی بھر تفکرات سے بے نیاز رہے۔ عید کی ایک ملاقات کے وقت ایک صاحب دیوان دیوڑھی میں حاضر ہوئے اور کرنسی نوٹ کا نصف حصہ کتر کر بطور نظر پیش کی۔ نواب صاحب نے ہاتھ کھینچ لیا تو موصوف نے نظریں نیچی کر لیں اور عرض کیا کہ "گھر سے جو کچھ لے آیا تھا سب خرچ ہوا۔ لیکن نظر پیش کرنا ضروری تھا۔ بس سرکار اس حقیر نذر کو قبول فرمائیں۔"

---

[1] کارنامہ سروری از نواب سرور الملک ص۹۴

[2] کارنامہ سروری " " ص۱۰۲

یہ صاحب بھی کافی نوازے گئے۔

سر سالار جنگ کے تعلق سے یہ بار ہا مشہور ہے کہ وہ کان کے کچے تھے لیکن بغیر دریافت کسی کے خلاف کارروائی نہ کرتے تھے۔ جس شخص سے بدظن ہو جاتے تو پھر اس کی تباہی لازمی تھی اکبر جنگ کے فرزند احمد علی کا نام ونشان نہ رہا۔ خود اکبر جنگ جو مدار المہام اور رزیڈنٹ کے درمیان باعث فساد تھے اپنے اعمال کی سزا پاتے رہے غالب جنگ اور تہنیت یاورالدولہ جنھوں نے بہ وقت ضرورت سرفروشی کا ثبوت دیا تھا خطابات جمعیت، نوبت ونقارہ اور جاگیرات سے سرفراز کیے گئے۔

نواب سر سالار جنگ وقت کے بڑے پابند تھے۔ یہاں تک کہ اپنی روزمرہ زندگی میں وہ ایک مستقل نظام العمل کے پابند رہے صبح کی نماز کے بعد شاگرد پیشہ، پہرہ دار اور دیگر اہل نشست کی سلامی لی جاتی تھی۔ پھر خانہ باغ (جو بعد میں نظام باغ کے نام سے مشہور ہوا) چلے جاتے جہاں ٹیپو خاں وغیرہ چابک سواراں چند گھوڑے خاصہ کے اور چند کوتل لیے حاضر رہتے اس موقع پر مخصوص مصاحب بگلوس و دستاریں لمبے لمبے دکھنی چھینٹ کے انگر کھے اور مدراسی اچکن پہنے حاضر رہا کرتے تھے۔ ان مصاحبین کے ساتھ نواب مدار المہام شہر سے باہر سرونگر تک نکل جاتے۔ لیکن سورج نکلنے تک دیوڑھی واپس آجاتے تھے اپنی مسند پر جلوہ افروز ہوتے۔ کچھ سادہ کاغذ اور پینسل مسند کے قریب رکھے جاتے تھے۔ عموماً پانچ روپے کی نذر رومال پر رکھ کر پیش کی جاتی تھی۔ نذر قبول کرنے کے بعد بیٹھنے کا حکم دیا جاتا تھا ملاقات کے بعد عطر بردار ملاقاتی کے آگے عطر پیش کرتا۔ ملاقاتی پہلے سرکار مدار المہام کو سلام کرتا عطر لیتا اور پھر سلام کر کے الٹے پاؤں کمرہ ملاقات سے باہر خوش خوش نکل جاتا۔ جب برخاست کا وقت ہوتا تو چوبدار مسند کے تکیے بدل دیا کرتا تھا اور یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ملاقاتی اب ٹھہر نہیں سکتے۔

نواب سر سالار جنگ چند اصولوں کی پابندی کیا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ ایک مقتدر وزیر اعظم (مدار المہام) تھے اور کسی دستور یا قاعدے کے پابند نہ تھے ہر ملازم ریاست بالمشافہ عرض ومعروض کر سکتا تھا۔ لیکن درخواستیں صرف فارسی میں قبول کی جاتی تھیں اور احکام بھی فارسی میں جاری کیے

جاتے تھے[1] رزیڈنٹ کے نام تمام سرکاری مراسلت فارسی میں ہوا کرتی تھی۔ البتہ نجی اور شخصی خط وکتابت انگریزی میں ہوا کرتی تھی، جس کے لیے علاحدہ دفتر قایم تھا۔ اس دفتر کے صدر مسٹر یوپن نیم (معتمد خانگی) تھے۔ فارسی دفتر کا نام" دفتر ملکی "تھا اور منشی محمد صدیق (نواب صدیق یار جنگ) اس کے معتمد تھے۔ مسٹر یوپن کے انتقال کے بعد مسٹر آ لیفانٹ معتمد خانگی اور سید حسین بلگرامی ان کے مددگار مقرر ہوئے۔

کل ریاست میں تنخواہ پانچ سو روپے سے زیادہ کسی عہدہ دار کو نہ ملتی تھی۔ البتہ صوبہ دار۔ تعلقدار اس قاعدہ سے مستثنیٰ تھے۔ کسی مدراسی یا ہندوستانی کو خدمت کارفرمائی (منصرمی) نہ دی جاتی تھی۔ صرف کارکن یعنی معتمد مقرر کیے جاتے تھے۔ اضلاع میں صدر تعلقداری تک ترقی دی جاتی تھی مگر صوبہ اورنگ آباد کا صوبہ دار صرف قدیم خاندان کا کوئی امیرزادہ ہی مقرر ہوتا تھا۔ نواب مختار الملک سرسالار جنگ اہم ملکی معاملات کو سرشمس الامرا امیر کبیر کے مشورہ سے انجام دیا کرتے تھے۔ نرسنگ راؤ، نواب سرشمس الامرا امیر کبیر کے وکیل تھے اور دیوان دیوڑھی ہی میں حاضر رہا کرتے تھے۔ نرسنگ راؤ ایک نہایت مہذب ذی وقعت آدمی تھے اور ان کی مخلصانہ کوشش سے سرسالار جنگ اور امیر کبیر کے درمیان کوئی غلط فہمی نہ ہو سکی۔ محلات شاہی کے انتظامی امور میں نواب میر محبوب علی خاں کی والدہ ماجدہ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

نواب تہنیت یاور الدولہ، دیوڑھی مبارک (یعنی پیشگاہ حضور نظام) میں نواب مختار الملک سرسالار جنگ اول کے وکیل تھے۔ نواب تہنیت یاور الدولہ کی مستعدی اور فرض شناسی کی بنا پر مابین شاہ و وزیر میں کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکی۔ تہنیت یاور الدولہ نے اپنی دوراندیشی سے رزیڈنٹ کے اثر ورسوخ کو ایوان شاہی میں بڑھنے نہ دیا۔ تہنیت یاور الدولہ ابتداً ایک معمولی منصب دار تھے۔ لیکن اپنی لیاقت کے باعث وہ وکیل مدار المہام کے عہدہ جلیلہ تک پہنچ گئے۔ معز الدین اور فصیح الدین (جن کے

---

[1] کارنامہ سروری ص ۹۵

نام سے ایک محلہ کوچہ فصیح جنگ مشہور ہے) امیر کبیر کے وکیل کی حیثیت سے دیوڑھی مبارک پر حاضر رہا کرتے تھے۔ اسی طرح مستحکم جنگ۔ اکرام جنگ اور شہسوار جنگ بہ حیثیت بندگان خاص ایوان شاہی میں حاضر رہتے۔

محلات شاہی کے امور میں اگر رزیڈنٹ کی رائے سے متفق نہ ہوتے تو نواب صاحب یہ کہہ کر رزیڈنٹ کو خاموش کر دیتے کہ" جدہ ماجدہ حضور پُر نور کا منشا یہی ہے۔"

یورپین یا نیم یورپین ملازم (سیوائے عہدہ داران فوج)، جوتے اتار کر باریاب ہوتے کھڑے کھڑے عرض ومعروض کرتے اور چلے جاتے تھے۔

بارہ دری میں صبح کے ناشتہ کی دعوت کبھی کبھی ہوا کرتی تھی اور اکثر انگریز مہمان ہی مدعو کیے جاتے تھے۔ شب کی دعوت دھوم دھام سے ہوا کرتی تھی پوری بارہ دری رنگ برنگی روشنی سے جگمگا اٹھتی۔ دیسی مہمانوں کے لیے دستر خوان اور انگریز مہمانوں کے لیے میز جما دیے جاتے تھے۔ نواب صاحب بہ نفس نفیس دروازہ پر مہمانوں کے استقبال کے لیے کھڑے رہتے ذی مرتبہ مہمانوں سے ہاتھ ملاتے تھے۔ دوسروں کے واسطے صرف گردن ہلاتے تھے۔ مہمانوں کی واپسی کے موقع پر نواب صاحب دروازہ پر آ کھڑے ہوتے اور اپنے مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے لمبی لمبی عطر کی شیشیاں کسی کو بارہ کسی کو دس کسی کو دو اور کسی کو ایک عطا فرماتے۔ شیشیوں کا تعین مہمان کی قربت اور اعزاز کے لحاظ سے ہوتا تھا۔

نواب سر سالار جنگ ہولی کا تہوار بڑے اہتمام سے مناتے تھے، امرا اور مصاحب آپ کی دیوڑھی پر جمع ہوتے راگ رنگ کے اس تہوار کو اس طرح مناتے کہ مدار المہام اور معمولی منصب دار ایک ہی صف میں دکھائی دیتے تھے۔

آخر ۸۔ فروری سنہ ۱۸۸۳ء کو شام میں پانچ بج کر پچیس منٹ کو مرض ہیضہ سے سر سالار جنگ نے انتقال کیا۔ مسٹر ای۔ کلاڈ لیبل اپنی تصنیف تاریخ قلمرو نظام (تاریخ اشاعت ۱۸۹۷ء) میں نواب سر سالار جنگ کے انتقال پر شہر کی حالت کا یوں ذکر کرتے ہیں:۔

" دیوان دیوڑھی کے کمپاؤنڈ اور اس سے باہر موجود لوگوں کو جب یہ

یہ خبر ہوئی کہ نواب صاحب نے انتقال فرمایا تو وہ جھوٹ سمجھے لیکن جب نواب صاحب کے اقربا۔ احباب اور ملازمین کے رونے کی آواز بلند ہوئی تو سب کے سب رونے اور چلانے لگے۔

"اس کے بعد بالکل سناٹا چھا گیا۔ سوائے سسکیاں بھرنے کے اور کوئی آواز نہیں آئی جب ان کے انتقال کی خبر شہر میں پھیلی تو کل زن و مرد زار زار رونے لگے کہ جیسے کوئی ان کا قریب کا رشتہ دار مرگیا اور حقیقت میں ان کا یوں رونا کچھ بے جا نہ تھا کیونکہ وہ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آتے تھے۔

شہر میں مردنی چھائی ہوئی تھی۔ تمام راستوں پر سناٹا تھا۔ نہ کسی کی آواز آتی تھی نہ کہیں ہل چل پائی جاتی تھی غرض وہ رات تمام اور اس کے بعد کئی روز تک حیدرآباد غریق رنج والم نظر آتا تھا ۹۔ فروری ۱۸۸۳ء کو یعنی انتقال کے دوسرے دن بلارم کنٹونمنٹ سے عزداری کی توپیں سر ہوئیں۔ ۹۔ فروری کو صبح دس بجے دائرہ میر مومن میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ اس وقت چادر گھاٹ سے تعزیتی توپیں سر کی گئیں"

نواب سر سالار جنگ نہایت دانش مند ماہر نظم و نسق تھے ہر کام کو مصلحت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ طبیعت میں عجلت نام کو نہ تھی۔ حتی کہ تیز سواری کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ بقول شمس العلما نواب عزیز جنگ ولاؔ جس چیز نے سر سالار جنگ کو حیدرآباد کی وزارت پر ان کی زندگی تک مستقل اور نیک نام رکھا وہ ان کی راست بازی اور ان کا استقلال تھا۔

راجہ نریندر پرشاد کی منصرم مدار المہامی

نواب سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد میجر گاف، کپتان کلارک اور حسین بلگرامی رزیڈنٹ جونس کے پاس پہنچے اور استدعا کی کہ نواب میر لائق علی خاں فرزند نواب سر سالار جنگ کے استحقاق جانشینی کا اعلان کریں۔ رزیڈنٹ نے ان اصحاب کی ایک نہ سنی[1]۔

---

[1] کارنامہ سروری صفحہ ۱۰۴

دیوان دیوڑھی میں مرحوم نواب کے وابستگان کو پرسہ دیا اور ایوان شاہی پہنچے اور والی ریاست کی منظوری سے مہاراجہ نریندر پرشاد پیشکار کو بلدہ کے انتظام اور امن و امان کا ذمہ دار قرار دیا۔

مہاراجہ نریندر پرشاد، مہاراجہ دھیراج بالا پرشاد کے فرزند اور مہاراجہ چندو لعل کے پوتے ہوتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی۔ عربی اور فارسی میں ان کی مہارت نواب مختار الملک سالار جنگ اور امیر کبیر رشید الدین خاں سے زیادہ تھی[1]۔ البتہ انگریزی میں اتنی قدرت حاصل نہ تھی کہ انگریزوں کے ساتھ باآسانی گفتگو کر سکتے۔ خانگی امور میں اپنے آبا و اجداد کے طریقہ کو نبھاتے تھے۔ اعتقاد کے لحاظ سے صوفی اور ہر مذہب کا احترام کیا کرتے تھے ۱۲۔ جون ۱۸۵۳ء کو ناصر الدولہ نے جس دن نواب سالار جنگ کو اپنا مدار المہام مقرر کیا اسی دن راجہ نریندر پرشاد کو پیشکار مقرر کیا۔ اس طرح نواب ناصر الدولہ اپنی رعایا میں یہ اعتماد پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنی رعایا میں کوئی فرق نہیں رکھتے اسی خیال کے تحت ہر دو امرا کو رسمی خلعت ایک ہی وقت میں عطا کی گئی ۱۲۷۳ھ میں نواب ناصر الدولہ نے راجہ نریندر پرشاد کو خطاب راجہ راجایان مرحمت فرمایا اور پانچ قیمتی جواہرات عطا کیے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں جب رزیڈنسی پر حملہ کا منصوبہ بنایا گیا تو اس کارروائی کی اطلاع سب سے پہلے راجہ نریندر پرشاد کو ہوئی[2] اور انھوں نے اس خطرہ سے مدار المہام سر سالار جنگ کو مطلع کیا۔ شورش ختم ہونے کے بعد انگریز حکومت نے راجہ صاحب کی قدر کی اور ان کے اعزاز بڑھائے[3] نواب افضل الدولہ مہاراجہ نریندر پرشاد کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اکثر آپ کی دیوڑھی پر تشریف فرما ہوتے تھے۔

رزیڈنٹ جونس کے عارضی انتظام کے کچھ دن بعد وائسرائے نے سر اسٹورٹ

ع۱ کارنامہ سروری ص۱۱

ع۲ مہاراجہ کشن پرشاد مولفہ حافظ محمد مظہر ص۲۰

ع۳ 〃 〃 〃 〃 ص۲۱

بیلی دکن کونسل کو حیدرآباد کے رزیڈنٹ سے مشاورت کے لیے حیدرآباد روانہ کیا۔ اس مشاورت کے بعد راجہ نریندر پرشاد اور نواب میر لائق علی خان سالار جنگ ثانی کو شریک منتظمین ریاست مقرر کیا گیا[1]۔ کونسل ریجنسی کے صدر حضور نظام اور اراکین نواب بشیر الدولہ (آسمان جاہ)، نواب شمس الامرا مقرر ہوئے۔ خدمت مدار المہامی کے لیے میر لائق علی خاں کے حق کو تسلیم کیا گیا لیکن ان کی کم عمری کی بنا پر یہ مناسب خیال کیا گیا کہ انھیں راجہ نریندر پرشاد کا شریک بنایا جائے تاکہ وہ امور ریاست سے واقف ہو کر تجربہ حاصل کر سکیں۔ آسمان جاہ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے پرنواسے تھے اور انھوں نے میر محبوب علی خاں والی ریاست کی ایک ہمشیرہ سے عقد کیا تھا۔ عہدہ وزارت عدلیہ سر آسمان جاہ کے سپرد کیا۔ لیکن وزیر کی تنخواہ پانچ ہزار روپے وہ حاصل نہ کرتے تھے بلکہ یہ رقم خزانہ سرکار میں جمع کی جاتی تھی۔ یہ (دوسری) کونسل آف ریجنسی ۵۔ فروری ۱۸۸۴ء تک قایم رہی۔

ضعیف مہاراجہ نریندر پرشاد کے خلاف نوجوان امرا کی سازشیں

نواب سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد سوائے نواب خورشید جاہ دکن میں کوئی با اثر وزیر یا امیر نہ رہا۔ راجہ نریندر پرشاد کافی ضعیف ہو چکے تھے اور ان میں درباری سازشوں سے بچاؤ کی قوت نہیں رہی تھی۔ دیگر امرا اپنے ذاتی منافع کی فکر میں غلطاں تھے۔ والی ریاست کے اتالیق مولوی مسیح الزماں خاں بتاریخ ۷ شعبان سنہ ۱۳۰۱ھ میں خدمت سے علاحدہ کر کے خارج ابد کر دیے گئے ان کا وظیفہ ماہانہ چار سو روپے مقرر کیا گیا۔ راجہ نریندر پرشاد کے خلاف کچھ نوجوان امرا محاذ آرا ہوئے اور ان امرا کی مدد سے بمبئی، مدراس اور کلکتہ کے اخبارات اپنے صفحات سیاہ کرنے لگے۔ ان اخبارات میں سب سے پیش پیش پائنیر اخبار تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے مسٹر جونس کی بجائے سر اسٹوارٹ بیلی کو ریاست کے نظم و نسق میں اصلاح کے لیے روانہ کیا۔ مخالفین نے راجہ نریندر پرشاد کے ساتھ ساتھ نواب سر خورشید جاہ کی مخالفت بھی شروع

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد مولفہ حافظ محمد مظہر صہ۱

کر دی۔ آخر کار نئی کونسل آف ریجنسی مقرر کی گئی جس کا ذکر قبل ازیں آچکا ہے۔ مہاراجہ نریندر اس انتظام سے خوش نہ تھے لیکن مسٹر پالمر بیرسٹر اور رستم جی کے مشورہ سے انھوں نے اس انتظام کو مجبوراً قبول کر لیا۔

مدار المہامی کے لیے میر لائق علی خاں کی نامزدگی کے بعد مرزا محمد علی بیگ (نواب افسر جنگ) اور مولوی مہدی علی۔ نوجواں میر لائق علی کے حاشیہ نشیں ہو گئے انھوں نے رزیڈنسی میں اپنی آمد و رفت کو بڑھا دیا اور انگریز حکام کے لیے پر تکلف ضیافتیں ترتیب دینے لگے۔ افسر جنگ کے خلاف بوڑھے مہاراجہ کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ وہ مصاحب شاہ اور نور نظر رزیڈنٹ تھے البتہ مہاراجہ نے خزانہ کے عہدہ دار پٹابھی راما راؤ کو ہدایت دی کہ وہ مولوی مہدی علی سے ان کے محکمہ کا حساب لیں[1] لیکن جلد ہی یہ معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ رزیڈنسی میں امرا اور عہدہ داروں کی دوڑ دھوپ سے رزیڈنٹ کو موقع مل گیا کہ وہ ریاست کے اندرونی انتظامات میں دخل اندازی کر سکے۔ اب رزیڈنسی میں مخبروں کی تعداد بھی بڑھنے لگی جو رزیڈنٹ کو مہاراجہ نریندر پرشاد کے خلاف مسلسل کان بھرنے لگے ان سازشوں سے تنگ آکر مہاراجہ پیشکار اور نواب خورشید جاہ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ والی ریاست کی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا جائے اور عنان حکومت ان کے حوالے کر دی جائے[2]۔ میر لائق علی خاں کے بہی خواہ اس تجویز سے متفق نہ تھے۔ آخر طے پایا کہ نمائش کلکتہ کی سیر کے لیے والی ریاست کلکتہ تشریف لے جائیں اور منتقلی اختیارات کا تصفیہ وائسرائے لارڈ رپن پر منحصر رہے گا۔

سفر کلکتہ میں نواب سرو قار الامرا۔ نواب شمس الامرا۔ راجہ نریندر پرشاد نواب میر لائق علی خاں۔ نواب سعادت علی خاں (شجاع الدولہ) مہاراجہ کشن پرشاد نواب صمصام الملک نواب افسر جنگ نواب محبوب یار جنگ۔ نوجواں حکمراں کے ساتھ تھے۔

---

[1] کارنامہ سروری ص۲۱۶

[2] 〃 〃 ص۲۲۱

میر لائق علی خاں۔ نواب میر سعادت علی خاں۔ افسر جنگ۔ میر ریاست علی خاں اور کپتان کلارک نوجوان بادشاہ کے ساتھ ساتھ رہے انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ نوجوان بادشاہ کو اولاً ظفر جنگ کے خلاف پھر خورشید جاہ اور پیشکار راجہ نریندر پرشاد کے خلاف کر دیا۔ حضور کی ملاقات گورنر جنرل لارڈ رپن سے ہوئی اور وہ اس بات سے مطمئن ہو ئے کہ عنان حکومت نوجوان بادشاہ کے حوالہ کر سکتے ہیں۔ اس ملاقات اور سیر و تفریح کے بعد حیدرآباد آتے ہوئے سواری شاہانہ گلبرگہ پہنچی جہاں حضور نے محبوب شاہی ملز کا سنگ بنیاد رکھا۔ حیدرآباد میں آپ کی واپسی کا بڑا جشن منایا گیا اور اعلیٰ حضرت نے منصور نامی ہاتھی پر سوار ہو کر جشن چراغاں کا معائنہ فرمایا۔

گورنر جنرل آف انڈیا لارڈ رپن کو مسند نشینی میں شرکت کے لیے ایک دعوت نامہ منجانب مہاراجہ پیشکار اور امیر کبیر روانہ کیا گیا۔ جو پہلے بنائے ہوئے منصوبہ کے تحت فوری منظور کیا گیا اس دعوت نامہ کی بنا پر انگریزی برتری کا کھلے عام اعلان کیا گیا۔

جب وائسرائے گورنر جنرل لارڈ رپن پونا پہنچے تو منصرم مدار المہام مہاراجہ نریندر پرشاد کو رزیڈنٹ حیدرآباد کی جانب سے ایک خط وصول ہوا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ والی ریاست کو چاہیے تھا کہ وہ بہ نفس نفیس سرحد ریاست تک آکر وائسرائے کا استقبال کرتے لیکن وائسرائے نے ازراہ کرم اس تکلف کو نظر انداز فرمایا ہے اس لیے ضروری ہے کہ چار امرائے عظام سرحد پر برائے استقبال حاضر رہیں۔"

اس خط کو دیکھتے ہی راجہ نریندر پرشاد کی آنکھوں سے آنسو جھلک گئے اور مختار الملک کے فرزند میر سعادت علی خاں نے ایک آہ دردناک بھر کر کہا۔ "ہائے اس وقت بابا کو زندہ ہونا تھا۔"[1]

رزیڈنٹ کے خط پر ابھی غور و خوص ہو رہا تھا کہ ادھر وائسرائے آن پہنچے

---

[1] کارنامہ سروری ص ۲۳۵

اور رزیڈنسی میں قیام کیا۔ چار امرأعظام صبح میں مزاج پرسی کے لیے رزیڈنسی گئے۔ سازشی امرآ اور عہدہ دار رزیڈنسی کے ارد گرد پیادوں اور ہرکاروں کی طرح دوڑنے پھرنے لگے۔

میر لائق علی خاں اور آسمان جاہ کی کوٹھیوں پر" صاحب بہادروں" کی پر تکلف ضیافتیں ہوتی رہیں۔ دوسری جانب ضیعف مہاراجہ اور وضعدار خورشید جاہ ان تمام خوشامدی کارروائیوں سے بے تعلق رہے راجہ نریندر پرشاد نے بیرسٹر پالمر کے مشورہ سے انگلستان کے نامی وکیل سرجان گارسٹ کو بمعاوضہ پچھتر ہزار روپے انگلستان سے بلوایا تاکہ وہ انھیں خدمت دیوانی پر مستقل تقرر کے لیے کوشش کریں سرجان اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور انگلستان واپس جاکر انھوں نے ایک رسالہ میں میر محبوب علی خاں اور نواب میر لائق علی خاں کے خلاف سخت مضامین لکھے۔ یہاں ہندوستان کے فارن آفس میں یہ خیال کیا گیا کہ یہ مضامین راجہ صاحب کے علم و ہدایت سے شائع ہو رہے ہیں۔ اس غیر دانش مندانہ حرکت سے فارن آفس راجہ صاحب سے بدگماں ہوگیا[1] ان حالات میں جب لارڈ رپن حیدرآباد پہنچے تو وہ وزارت سے متعلق تصفیہ کر چکے تھے۔ سفر کلکتہ کی وجہ سے والی ریاست بھی میر لائق علی خاں کے طرفدار اور حامی بن گئے تھے اس لیے ان کے تقرر دیوانی کے لیے کوئی مشکل نہ رہی۔

۵۔ فروری سنہ ۱۸۸۴ء م سنہ ۱۳۰۱ھ میں جب دربار مسند نشینی منعقد ہوا تو راجہ کی کرسی دور رکھ دی گئی اور نواب میر لائق علی خاں کی کرسی بجائے مہاراجہ، درجہ وزارت پر رکھ دی گئی[2] مہاراجہ اس تمام کارروائی سے لاعلم تھے۔ انھیں اس بات کی اطلاع اس وقت ہوئی جب کہ وہ سواری عماری جلوس دیوڑھی مبارک پہنچے اور مہتاب محل میں داخل ہو رہے تھے۔ جب یہ خبر مہاراجہ کو دی گئی تو بڑی مشکل سے

---

۱ کارنامہ سروری ص۲۳۵

۲ " " ص۲۴۵

۳ " " ص۲۳۸

خود کو سنبھال سکے[1]

مہاراجہ نریندر پرشاد ۱۲-مئی سنہ ۱۸۸۸ء م ۱۴-رمضان ۱۳۰۷ھ کو بیمار ہوئے دوسرے روز حکیم شمس الدین اور فیملی ڈاکٹر محمد اشرف نے علاج شروع کیا لیکن تیسرے دن یعنی ۱۳-رمضان ۱۳۰۷ھ کو شب کے دس بجے راجہ نریندر پرشاد نے انتقال کیا اور ۶۲ سال کی عمر پائی۔

راجہ نریندر پرشاد کو کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، صرف ایک صاحبزادی تھی جن کا عقد راجہ ہری کشن بہادر سے ہوا تھا اور راجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت انہی کے فرزند تھے۔

دربار تخت نشینی ۱۸۸۴ء کی سیاسی اہمیت

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے نواب افضل الدولہ کے انتقال کے فوری بعد قبل اس کے کہ رزیڈنٹ حیدرآباد کو آصف جاہ پنجم کے انتقال کی خبر پہنچے تمام امرأ عظام در دولت پر حاضر ہوئے اور کمسن حکمراں کو مسند شاہی پر بیٹھا کر مسند نشینی کی نذریں پیش کیں۔ رزیڈنٹ نے اس ایک طرفہ کارروائی پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ برٹش گورنمنٹ نے اس مسند نشینی کی کارروائی کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک کونسل آف ریجنسی مقرر کردی اور وائسرائے کو کمسن حکمراں کا ولی قرار دیا۔ جب نواب میر محبوب علی خاں سن شعور کو پہنچے تو برٹش گورنمنٹ نے (۲۶-فروری ۱۸۶۹ء کے اعلان مسند نشینی کو یکسر نظر انداز کرکے)، مسند نشینی کے دربار کا اہتمام کرایا اور اس موقع پر جو اہتمام کیا گیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ برٹش گورنمنٹ اس دربار مسند نشینی میں ملکہ معظمہ قیصر ہند کے اقتدار اعلا کو منوانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس موقع پر لارڈ رپن کی تقریر اور نواب میر محبوب علی خاں کی جوابی تقریر سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے۔

لارڈ رپن کی آمد اور دربار مسند نشینی کا حال تزک محبوبیہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

[2] " ۲۸-ربیع الاول ۱۳۰۱ھ مطابق ۲۸-جنوری ۱۸۸۴ء کو لارڈ رپن کے کلکتہ

---

[1] کارنامہ سرداری ص۱۳۸

[2] گلمز آف دی نظامس ڈومینیشن تزک محبوبیہ

سے جہاز پر سوار ہو کر مدراس پہنچے۔ وہاں سے تیسری ربیع الثانی کو اسپشل ٹرین پروانہ حیدر آباد ہوئے۔ ادھر حضرت کی جانب سے راجہ یاں راجہ نریندر پرشاد اور نواب میر لائق علی خاں مختار الملک ثانی استقبالاً رائچور تک گئے۔

چوتھی ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ کو گورنر جنرل کے ریلوے اسٹیشن حیدر آباد پر اترتے ہی اکیس ضرب توپ سلامی سر ہوئی۔ اسٹیشن آراستگی سے دلہن بنا ہوا تھا اور اسٹیشن سے رزیڈنسی تک مخلوق کا ازدہام تھا لارڈ رپن ورود سے" پانچ منٹ آگے اعلیٰ حضرت ارکان سلطنت و اعیان دولت اسٹیشن پر تشریف فرما ہوئے۔ اعلیٰ حضرت ایک سیاہ سادہ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے اور ایک سیاہ دستار فرق مبارک پر تھی۔ اس پگڑی میں وہ خوشنما طرح تھا جس کو صرف خاندان شاہی کے ممبر لگا سکتے ہیں۔ مسٹر کاڈری رزیڈنٹ مع ملٹری سکریٹری اور دیگر یورپین افسران کے ہمراہ موجود تھے وقت مقررہ پر ٹرین آئی۔ جس میں ہز اکسلنیسی لارڈ رپن اور لیڈی رپن اور وائسرائے کا بہت بڑا اسٹاف سوار تھا۔ اعلیٰ حضرت نے ہز اکسلنیسی سے مصافحہ فرمایا۔ تعظیمی گارڈ نے سلامی دی۔ بینڈ بجنا شروع ہوا۔ فوٹو گرافر نے تمام پارٹی کی تصویریں لی۔ اور لارڈ رپن بہ سواری بگھی چواسپہ رزیڈنسی بلارم کو روانہ ہوئے اور حضرت اقدس نے ایوان شاہی کو معاودت فرمائی۔

دوسرے روز اتوار کا دن تھا اس لیے کوئی کارروئی نہیں ہوئی چھٹویں ربیع الثانی روز دوشنبہ صبح کے وقت بندگان عالی نے لارڈ رپن سے تخلیہ کی ملاقات فرمائی۔ اس میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہوا پھر دوپہر کے بعد مارکیوبس آف رپن نے ہز ہائنس حضور پر نور سے ملاقات باز دید کی۔ الوال سے ایوان شاہی تک انتظام کیا گیا تھا کہ کوئی شخص سڑک پر سے گزرنے نہیں پاتے اور سڑک کے دونوں طرف پولیس اور جوانان پلٹن اور سواراں باقاعدہ آئین فوجی کے

ساتھ باادب صف بستہ و ایستادہ تھے"۔ جس وقت لارڈ رپن ایوان شاہی میں داخل ہوئے توپ خانہ سرکار عالی سے اکتیس ضرب توپ کی سلامی اتاری گئی اور شام کو بہت بڑا دربار ہوا۔ رعایا کی طرف سے جو جوش اور سرگرمی اس مبارک تقریب میں ظاہر کی گئی تھی وہ معرض بیان نہیں آسکتی۔ ہر شخص امیر و غریب بلا لحاظ مذہب و ملت اس تقریب میں خلوص دل سے شریک ہوا۔"

" دوسرے دن صبح کے سات بجے سے لشکر باقاعدہ اور رسالہ جات وغیرہ کا فراہم ہونا شروع ہوا اور اہلکاران کوتوالی نے ناکہ بندی کردی کہ کوئی نکلنے نہ پائے۔ ہر طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا اور سڑک کے دونوں جانب سواران باقاعدہ کی صفیں جمی تھیں شاہی محل کے داخلہ کے لیے امرا وغیرہ اور سرداران اہل سیف و قلم کو ٹکٹ تقسیم ہوئے دارالامارہ شاہی میں ایک جانب حبشیوں کا رسالہ اور دوسری طرف خاص جمعیت علاقہ میسرم نظام محبوب شاہی صف بستہ استادہ تھی اور دوسو جوان فوج باقاعدہ مع بیانڈ بیرونی گیٹ کے روبرو سلامی کے لیے کھڑے کیے گئے تھے" چو محلہ مبارک" جس میں دربار ہوا وہ محلات شاہی میں سب سے زیادہ وسیع اور خوش نما منظر و طلا کار ہے اور آفتاب محل۔ مہتاب محل۔ تہنیت محل افضل محل کی خوش نما و عالیشان عمارتیں ہر طرف سے اس کو زینت دے رہی ہیں اس محل کے بیچ میں زربفت کا شامیانہ سونے چاندی کی چوبوں پر استادہ تھا اور اس کے اطراف کرسیاں اپنے اپنے مرتبہ سے بچھی" ہوئی تھیں اور تخت پر مکلل زرد مسند شاہی آراستہ تھی۔ داہنے بائیں امرا وارکان اور افسران انگریزی کی نشست کے لیے کرسیاں لگائی گئی تھی سب امرا نامدار اور ارکان دولت اور اعیان سلطنت راجہ مہاراجہ یونیفارم زیب تن کیے ہوئے اپنے مقام پر موجود تھے۔ باہر کے درجہ میں عہدہ داران منصب داران شاہی حاضر تھے۔ اس آگے کے دروں میں تین تین حبشی وردیاں پہنے ہتھیاروں میں ڈوبے ننگی تلواریں

علم کیے ہوئے قایم تھے۔ پھر ان کے برابر بہادران عرب و افغان جدا جدا وردیاں پہنے ہوجے تھے۔ وہاں سے دروازہ تک سواروں کے پرے دونوں طرف پابستہ آراستہ تھے۔ جو درباری آتے پہرہ پہرہ پر ٹکٹ دکھاتے اور داخل دربار ہوتے۔"

نو بجے کے قبل چار امرآ عظام کا ڈپوٹیشن وائسرائے بہادر کی خدمت میں بلارم کو روانہ ہوا۔ ٹھیک نو بجے وائسرائے بہادر ایوان شاہی کو روانہ ہوئے۔ وائسرائے کی معیت میں فارن سکریٹری۔ پرائیوٹ سکریٹری۔ ملٹری سکریٹری فارن ڈپارٹمنٹ کے افسران پرسنل اسٹاف بریگیڈر جنرل حیدرآباد کنٹیجنٹ کے بریگیڈر جنرل اور جلو میں چودھویں حصار اور توپ خانہ کا رسالہ جس میں دو سو سوار یورپین اور چھ توپیں تھیں روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت حیدرآباد کنٹیجنٹ کے توپ خانہ سے سلامی اتاری گئی۔ جب وائسرائے ایوان شاہی میں داخل ہوئے تو حضور پرنور نے وائسرائے بہادر کا استقبال فرمایا اور ہز اکسلنسی کو ساتھ لے کر مع ان مصاحبین کے محل دربار میں تشریف لائے فی الفور توپ خانہ آصفیہ سے اکتیس ضرب توپ سلامی سر ہوئیں اور اعلیٰ حضرت اور حضور وائسرائے مطلا کرسیوں پر رونق افروز ہوئے۔ ارکان دولت اور اعیان سلطنت اور افسران انگریزی چپ و راست و پس پشت علی قدر مراتب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے جب آخری توپ کی گرج بند ہوئی تو حضور وائسرائے استادہ ہوئے اور (بموجب بیان گلمسز آف دی نظامس مینن) حضور نظام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:-

وائسرائے لارڈ رپن کی تقریر

حضور نظام!

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج کے روز اس موقع پر حضور ملکہ معظمہ (کوئین وکٹوریہ) قیصر ہند کی طرف سے آپ کو ریاست کے اختیارات" سپرد" کرنے کی خدمت بجا لانے میں مجھ کو کمال درجہ خوشی حاصل ہو رہی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ میں پہلا ہی وائسرے ہوں جسے

حیدرآباد آنے کا اتفاق ہوا ہے اور میرا یہاں آنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس ریاست اعظمی اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان نہایت مضبوط دوستانہ روابط ہیں بلکہ اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ حضور ملکہ معظمہ کو آپ کی خیر خواہی و خوشی کا نہایت خیال ہے اور اس میں وہ پوری دلچسپی لیتی ہیں۔

حضور نظام :

آج میں جس بادشاہ کی طرف سے نیابت کر رہا ہوں اس کی خاص آرزو یہی ہے جو میں نے بیان کی ملکہ معظمہ نہایت دلچسپی کے ساتھ آپ کی "نگراں حال" رہیں گی۔ آپ انھیں نا امید نہ کریں۔

میرے دوست! اب جو کام میرے لیے باقی رہا ہے وہ یہ ہے کہ میں آپ کو مسند پر بیٹھاؤں اور اپنی دلی امید کا اظہار کروں اور دعا کروں کہ "خدائے تعالیٰ آپ کو مبارک کرے اور آپ کا مددگار رہے۔ آپ کی حکومت کو کامیاب اور آپ کی عملداری کو معزز و ممتاز فرمائے اور اس طرح سے کے وعدے تمام سچے ہوں۔"

فارن سکریٹری نے وائسرائے کی اس تقریر کا ترجمہ کیا۔ تزک محبوبیہ کے مطابق فارن سکریٹری نے وائسرائے کی اس تقریر کا ترجمہ فارسی میں خاص ایرانی لہجے سے کیا۔

اس کارروائی کے بعد وائسرائے حضور نظام کو شاہی کرسی تک جو کسی قدر فاصلے سے ایک بلند مقام پر رکھی ہوئی تھی لے گئے اور ان پورے خطابات سے مخاطب کر کے فرمایا کہ "حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند اور ان کی گورنمنٹ کی طرف سے اب میں آپ کو اعلاروس الاشہاد ظاہر کرتا ہوں کہ "آج سے" آپ کو اپنی ریاست کے پورے اختیارات دیے گئے۔"

اس کے بعد بینڈ نے نیشنل انیتھم بجایا اور حیدرآباد و سکندرآباد دیلارم میں سلامی کی اکیس اکیس توپیں سر کی گئیں۔ حضور نظام کو وائسرائے کا بیش بہا خلعت پہنایا گیا اور مرصع تلوار کمر سے باندھی گئی۔ پھر نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی راجہ نرپندر پرشاد اور نواب خورشید جاہ بہادر کو خلعت دے گئے۔ اس کے

بعد حضور نظام اٹھے اور وائسرائے کی تقریر کا جواب دیا۔

نواب میر محبوب علی خاں کی جوابی تقریر

حضور وائسرائے!

میں آپ کے حیدرآباد تشریف لانے کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ اس موقع پر تشریف فرما نہ ہوتے تو مجھ کو اور میری رعایا کو سخت رنج گزرتا آپ نے جو عزت افزائی فرمائی اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ اس ریاست کے سچے خیر خواہ ہیں اور میرے خاص نوازش فرما۔ مجھ کو حال میں بھی اس کی تصدیق ہو گئی ہے اور میں آپ کی مہربانی کو کبھی فراموش نہیں کروں گا۔ آپ کے ہاتھ سے آج کی کارروائی ہونا میری آئندہ گورنمنٹ کے لیے نیک شگون ہے۔ جو "دوستانہ روابط" برٹش گورنمنٹ اور میرے جانشیناں سابق کے درمیان رہے ہیں آج آپ کی تشریف آوری سے ان کا تازہ ثبوت ملتا ہے۔ آپ نے ازراہِ مہربانی جو اس وقت مجھ کو نصیحت کی ہے اس کو کمال صدق دلی سے قبول کرتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کل امور میں جو اس ریاست کی رفاہ و بہبود سے متعلق ہیں میں آپ کی اور اس گورنمنٹ کی، جس کے آپ معزز افسر ہیں ہمیشہ صلاح و مشورت لیتا رہوں گا۔ جس سے میری اور میری رعایا کی بہبودی مقصود ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ بہت جلد حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند کی خدمت میں میری طرف سے بندگی پہنچائیں گے۔

حضور نظام کی تقریر کے بعد مسٹر گرانٹ ڈف سر فانٹڈ اسٹوارٹ اور فریڈرک رابرٹس باری باری سے آگے بڑھے اور اعلیٰ حضرت کو مبارک باد پیش کی۔ بعد تقسیم عطر و پان دان کارروائی، معمولی سلامی اور دیگر مراسم شاہی کے ساتھ ختم ہوئی۔

وائسرائے کی تقریر کے لب و لہجہ کو امرا عظام اور رعایا نے سخت ناپسند کیا۔ لیکن کس میں جرأت تھی کہ احتجاج کر سکے؟ وائسرائے نے نواب سر سالار جنگ کی وفات پر کافی افسوس کا اظہار کیا جو مسند نشینی کے تہنیتی دربار کے

موقع پر نامناسب بات تھی۔ چنانچہ حضور نظام میر محبوب علی خاں نے اپنے تقریر میں وائسرائے کی تقریر کے اس حصہ کو اکثر نظر انداز کر دیا۔

نئے مدارالمہام میر لائق علی خاں کے متعلق وائسرائے کی تقریر میں کوئی تذکرہ نہیں تھا اور عمداً انھیں نظر انداز کیا گیا۔ وائسرائے کی تقریر کے اس حصہ کو عوام اور امرائے نے ناپسند کیا جہاں کہا گیا تھا کہ

"آپ اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ پر چلیں اور جب اپنے آباؤ اجداد سے متصل ہوں تو لوگ کی نسبت بھی کہیں کہ انھوں نے نہایت عمدہ ریاست کی۔"

مشرقی آداب کے لحاظ سے ایک تہنیتی دربار کے موقع پر اس قسم کا اظہار خیال انتہائی نامناسب سمجھا گیا۔ وائسرائے کی تقریر میں ملکہ معظمہ قیصر ہند کی جانب سے اختیارات کی سپردگی کا ذکر بارہا کیا گیا اور ملکہ معظمہ کو نئے حکمراں سے نگراں حال کہہ کر انگریز بالادستی کو جتانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ نئے حکمراں سے یہ وعدہ بھی لے لیا گیا کہ "کل امور میں جو اس ریاست کے فلاح و بہبود سے متعلق ہیں میں آپ کی اور اس گورنمنٹ کی جس کے آپ معزز افسر ہیں ہمیشہ صلاح و مشورت لیتا رہوں گا۔" اور اس وعدہ کا اعلان اس دربار کے انعقاد کا اصل مقصد تھا جو وائسرائے کی موجودگی میں برسر دربار کیا گیا۔

چوتھا دور

۱۳۰۰ھ تا ۱۳۳۰ھ
یعنی ۱۸۸۴ء تا ۱۹۱۱ء

حیدرآباد کی سیاسی، تمدنی، علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے یہ تیس سالہ چوتھا دور، تیسرے دور سے کچھ کم نہ تھا۔ اس دور کی سب سے نمایاں شخصیت والی ریاست نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کی تھی۔ جو نہ صرف ایک مکمل انسان تھے بلکہ شاہی اور مطلق العنانی کے دور میں عوام سے بہت قریب اور درباری امرا سے بہت دور رہنا پسند کرتے تھے۔ یقیناً نواب میر محبوب علی خاں کو اہل حیدرآباد نے خلوص، پیار اور احترام دیا۔ وہ نہ صرف ایک ہر دلعزیز حکمراں تھے بلکہ پرگو شاعر بھی تھے اور آصف تخلص فرماتے تھے۔

شمالی ہند سے یوں تو پہلے بھی کئی شعرا دکن چلے آئے تھے لیکن نواب میر محبوب علی خاں کے دور زریں میں حیدرآباد کو آنے والے شعرا، ادیب اور سیاست دانوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔ دکھنی اور شمالی ہند کے شعرا کے میل جول مشاعروں کی کثرت سے دکن میں علم و ادب کی ایک خوشگوار فضا پیدا ہو گئی اور اصلاح زبان کے لیے خاص کوشش کی جانے لگی۔

اس دور کے حیدرآبادی شعرا میں سید رضی الدین کیفی۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد، محمد حیدر خاں نقمان الدولہ دل۔ شمس العلما، احمد عبدالعزیز عزیز جنگ ولا۔ مہدی حسن الم کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں جو شعرا حیدرآباد آئے ان میں سید کاظم حسین شیفتہ، حیدر یار جنگ

نظم طباطبائی۔ فصیح الملک داغ دہلوی۔ امیر احمد امیر مینائی۔ ظہیر الدین ظہیر دہلوی۔ سید محمد شاہ دارثی بے نظیر۔ درگا پرشاد نزکا۔ فصاحت جنگ جلیل۔ اختر یار جنگ اختر مینائی اصغر یار جنگ اصغر کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

اس دور کے شمالی ہند کے شعراء میں سید علی شاد عظیم آبادی۔ محمد حسین آزاد۔ شمس العلماء الطاف حسین حالی۔ محمد اسمٰعیل میرٹھی۔ درگا سہائے سرور۔ برج نارائن چکبست کے نام قابل ذکر ہیں۔

نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی کا تقرر بحیثیت مدار المہام بادشاہ کی ناراضگی اور سبکدوشی

ماہ فروری ۱۸۸۴ء م ۱۳۰۱ھ میں اپنی مسند نشینی کے بعد نواب میر محبوب علی خاں نظام ششم نے نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی کو اپنا مدار المہام مقرر کیا۔ نوجوان بادشاہ اور نو عمر وزیر اعظم کا ساتھ صرف تین سال بہ مشکل قائم رہا۔ نواب میر لائق علی خاں کو مدار المہامی، انگریزی رزیڈنٹ کی سعی سفارش سے حاصل ہوئی تھی۔ اس لیے رزیڈنٹ کا ٹوڑی۔ کمسن بادشاہ اور ناتجربہ کار وزیر اعلیٰ پر پوری طرح حاوی ہو گئے۔ معمولی اہلکاران اور عہدہ داران کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ رزیڈنٹ کو خوش رکھیں اور اپنے عہدوں پر قائم رہنے کے لیے رزیڈنٹ کو ہر طرح مطمئن رکھیں۔ یہ پالیسی مختار الملک اور امیر کبیر نواب رشید الدین خاں کی وسیع النظری اور تدبر کی بنا پر اب تک قایم نہ ہو سکی تھی۔

پرانی حویلی کی فضا ان سازشوں سے بہر حال پاک و صاف تھی۔ سوائے مرزا محمد علی بیگ (نواب افسر جنگ) اور میر ریاست علی خاں۔ تمام حاضرین دربار قدیم رفتار اور انتظام کے قائل تھے[1] وہ نواب خورشید جاہ بہادر اور راجہ نریندر پرشاد کی علاحدگی کو پسند نہ کرتے تھے۔ نوجوان مدار المہام نے دیوڑھی مبارک کی فضا کو موافق بنانے کے لیے جدید انتظام کیا۔ "عرض بیگی" کے بجائے یہ عہدہ "ایڈیکانگ" موسوم

---

[1] کارنامہ سروری صفحہ ۲۴۱۔

کیا گیا۔[1] نواب افسر جنگ اور محبوب یار جنگ اس خدمت پر مامور کیے گئے۔ "سیہ نویسی" ڈیوڑھی مبارک صرف برائے نام رہ گئی۔ معروضات کے پیش کشی اور باریابی ایڈیکانگ کے ذریعہ ہو سکتی تھی دربار انگریزی میں شرکت اور دیگر ضیافتوں کے رقعے ایڈیکانگ کی مرتب کردہ فہرست کی بنا پر جاری کیے جاتے تھے۔ امرائے عظام، نواب خورشید جاہ بہادر اور نواب آسمان جاہ بہادر انگریزی دربار میں یونیفارم کی بجائے اپنے قدیم لباس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ امرا بھی نئے طرز کو قبول کرنے لگے[2] حضور کی پیشی میں کاغذات اب صرف بطور اطلاع پیش کیے جاتے تھے۔ سرکاری زبان جواب تک فارسی تھی اردو قرار دی گئی۔

رزیڈنسی میر لائق علی خاں عماد السلطنت کی وزارت سے کچھ خوش نہ تھی۔ ایک ترقی پسند با اعتماد اور با اثر مدار المہام کی موجودگی میں انگریز مفادات کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ حکمراں کو اپنے مدار المہام پر کامل بھروسہ تھا اور جب تک وزیر اور بادشاہ، میں اختلاف پیدا نہ ہوں۔ انگریز رزیڈنٹ کو مدار المہام سے نجات نہ مل سکتی تھی۔

نواب میر محبوب علی خاں کا سفر نیلگری

رزیڈنٹ حیدرآباد (مسٹر کاڈری) نے نوجوان حکمران، میر محبوب علی خاں کو مشورہ دیا کہ موسم گرما گزارنے کے لیے وہ نیلگری (اوٹی) تشریف لے جائیں[4] رزیڈنٹ نے نواب میر لائق علی خاں عماد السلطنت سے خواہش کی کہ وہ سفر

---

[1] کارنامہ سروری ص ۲۴۳

[2] ” ” ص ۲۴۳

[3] ” ” ص ۲۴۳

[4] سوانح عمری اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مولفہ سید امجد علی صاحب اشہری ص ۸۲ (سنہ تالیف ۱۹۰۶ء شنہ اشاعت ۱۹۱۱ء

نیلگری میں اعلیٰ حضرت کے ساتھ رہیں۔ حیدر آباد کے فرمان رواکے لیے اس قسم کا سفر بالکل غیر معمولی تھا۔ موسم گرما گزارنے کے لیے کسی آصف جاہی حکمراں نے اس طرح کا سفر نہ کیا تھا۔ شاہی بیگمات اور رعایا حیدر آباد ایسے موقع پر اپنے بادشاہ کی متارفت سے طرح طرح کے اندیشے باندھ رہے تھے۔ آخر ۲۳۔رجب سنہ ۱۳۰۲ھ کو نواب میر محبوب علی خاں بہمراہی مدار المہام نواب میر لائق علی خاں، نواب آسمان جاہ اور دیگر رفقاء مصاجبین نیلگری روانہ ہوئے۔ دوران سفر نیلگری میر محبوب علی خاں اور نواب عماد السلطنت میں کسی موضوع پر گفتگو ہوئی اور اعلیٰ حضرت نے محسوس کیا کہ میر لائق علی خاں آداب شاہی کا خیال نہیں رکھتے اور ہم مکتب ہونے کی وجہ سے وہ خود کو اعلیٰ حضرت کا قریبی دوست اور ہم رتبہ خیال کررہے ہیں۔ دوران سفر لوگوں نے دیکھا کہ میر لائق علی خاں حکمراں کی موجودگی میں سگریٹ نوش کررہے ہیں اور دعوت اور پارٹی کے موقع پر قطعی احکام کے خلاف جو لباس چاہا پہن کر حاضر ہوتے تھے[1] رزیڈنسی سے سید حسن بلگرامی من مانی مراسلت کیا کرتے تھے جس کا علم والی ریاست کو نہ ہوتا تھا۔

۱۶۔رمضان ۱۳۰۲ھ کو نواب میر محبوب علی خاں مع الخیر حشم خدم داخل بلدہ ہوئے۔ اسٹیشن پر رزیڈنٹ نے دیگر امرائے کے ساتھ میر محبوب علی پاشا کا استقبال کیا اور اعلیٰ حضرت ایوان شاہی کی جانب روانہ ہوئے۔ نیلگری کے سفر سے اعلیٰ حضرت کا دل نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی سے مکدر ہوگیا تھا وہ اپنے مدار المہام کو جلد سے جلد بدلنا چاہتے تھے رزیڈنٹ بھی در پردہ اس تحریک کا حامی تھا لیکن بادشاہ کو مزید طیش دینے کے لیے اس نے اس تحریک کی مخالفت شروع کردی۔ منہرم رزیڈنٹ مسٹر کاڈری نے ایک خط والی ریاست کو لکھا کہ

"وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ تو کیا دونوں ہوز آف پارلیمنٹ حتیٰ کہ ملکہ قیصرہ ہند تک سر سالار جنگ کے خدمات کا احترام کرتے ہیں وہ ان کے لڑکے یا خاندان کو نقصان پہنچانے

---

[1] کارنامہ سروری ص۲۵۴

کی اجازت نہ دیں گے۔ بہر طور آپ کا گدی سے اترنا آسان ہے لیکن
لائق علی خاں کی علاحدگی ناممکن ہے"[1]

نواب میر محبوب علی خاں نے فوری اس خط کا جواب روانہ کیا کہ آپ کا خط اس قابل نہ تھا کہ اس کا جواب دیا جائے مگر چوں کہ معاملہ اہم ہے لہٰذا میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ میں لائق علی خاں کے ساتھ ایک دن بھی کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے ان کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ پر جس کو مقرر میں کروں گا آپ کو جلد اطلاع دوں گا تاکہ آپ گورنمنٹ آف انڈیا کو مطلع کر دیں"[2]

لارڈ ڈفرن وائسرائے کو جب یہ اطلاع ہوئی تو انھوں نے حضور نظام کو مطلع کیا کہ "میں خود حیدر آباد آتا ہوں میں ممنون ہوں گا اگر اس وقت تک یور ہائنس کوئی اقدام نہ فرمائیں"[3] رزیڈنٹ کاڈری رخصت حاصل کر کے حیدر آباد سے روانہ ہوئے اور منفرم رزیڈنٹ کی حیثیت سے ایک سپاہی منشی دانشور کرنل راس کا تقرر عمل میں آیا۔

۲۷۔ صفر ۱۳۰۴ھ محرم ۱۸۸۷ء کو لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند حیدر آباد آئے حضور نظام سے دو چار ملاقاتیں ہوئیں۔ وائسرائے نے نواب میر لائق علی خاں کی معزولی سے اتفاق کیا اور ان کے جانشیں کے حیثیت سے سر خورشید جاہ کے تقرر کی حمایت کی۔ طے پایا کہ وائسرائے کی واپسی کلکتہ کے بعد نئے مدار المہام کا تقرر کیا جائے[4] اس موقعہ پر یہ بھی طے پایا کہ کرنل مارشل حضور نظام کے پرائیوٹ سکریٹری رہیں گے۔ بعد میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ والی ریاست نے مدار المہامی کے لیے سر خورشید جاہ کی بجائے نواب آسمان جاہ کا نام تجویز کیا جو

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد کے حالات زندگی۔ مؤلفہ حافظ محمد مظہر ص۱

[2] کارنامہ سرداری ص۲۵۶

[3] کارنامہ سرداری ص۲۵۹

[4] 〃 〃 〃 ص۲۷۳

ان دنوں انگلستان میں مقیم تھے۔ ان افواہوں کے پیش نظر نواب میر لائق علی خاں نے استعفیٰ پیش کیا۔ ۲۴۔رجب ۱۳۰۴ھ کو اعلیٰ حضرت کی جانب سے استعفیٰ کی منظوری کا فرمان جاری ہوا نواب موصوف اعلیٰ حضرت کے عتاب سے سخت رنجیدہ تھے اور حیدرآباد میں قیام کو مناسب نہ سمجھا وہ پونا چلے گئے اور ایک کوٹھی کرایہ پر لے کر مقیم رہے۔ دو سال کے قیام کے بعد اچانک بیمار ہوئے اور نیم جان حالت میں حیدرآباد لایا گیا۔ حیدرآباد میں یہ افواہ عام تھی کہ عمادالسلطنت نے کچھ کھالیا تھا جس سے ان کی موت واقع ہوئی غرض ۸۔ذیعقدہ ۱۳۰۶ھ کو عین عالم شباب میں انتقال کیا اور اپنے باپ کے قریب دائرہ میر مومن میں دفن کیے گئے۔ انتقال کے وقت ان کے تنہا فرزند میر یوسف علی خاں صرف دو سال کے تھے جو بعد میں سالار جنگ ثالث کے خاندانی خطاب سے سرفراز ہوئے۔ اور اپنے میوزیم کی بنا پر دوامی شہرت پائی۔ میر لائق علی خاں کے سوگ میں حیدرآباد ڈوبا ہوا تھا ایک شاعر نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا:۔

افسوس خرد مند خلائق نہ رہا
دنیا میں وہ علم و فن کا شائق نہ رہا
کہتی ہے یہ شمع رو کے اے اہل دکن
اس بزم میں سب ہے پہ لائق نہ رہا

جس وقت نواب لائق علی خاں سالار جنگ ثانی نے خدمت دیوانی سے استعفیٰ دیا اور نواب سر آسمان جاہ کا تقرر بحیثیت مدارالمہام عمل میں آیا اس وقت نواب صاحب موصوف ملکہ وکٹوریہ کے جشن جوبلی میں شرکت کے لیے لندن میں مقیم تھے ۲۰۔رجب ۱۳۰۴ھ میں آپ سفر یورپ کے لیے روانہ ہوئے۔ اسٹاف میں کپتان عبداللہ بیگ (افسر اسٹاف) مسٹر کوبرن (چیف سکریٹری) مسٹر دوسا بھائی (پرائیوٹ سکریٹری) سید رکن الدین (ایڈیکانگ، ڈاکٹر اعتماد الحق (اسٹاف سرجن) متعدد شاگرد پیشہ اور چوبدار آپ کی ہمراہی میں تھے۔ لندن کی تقاریب میں آپ کو نمایاں جگہ پر نشست دی گئی دوران سفر ہی میں بتاریخ ۲۸۔شوال ۱۳۰۴ھ

آپ کو مدار المہام مقرر ہونے کی اطلاع بہ ذریعہ تار وصول ہوئی۔ ۴۔ ذیعقدہ ۱۳۰۴ھ کو آپ حیدر آباد واپس ہوئے اور ۱۰۔ ذیعقدہ کو آپ نے بمقام ایوان سیف آباد (موجودہ اصل عمارت سکریٹریٹ) باریابی حاصل کی اور واپسی سفر و سرفرازی وزارت کے لیے متواتر چار نذریں پیش کیں[1]

۱۳۔ شوال ۵ ۱۳۰ھ کو ایک عظیم الشان دربار منعقد ہوا۔ جس میں کل امرائے عمائدین ریاست شریک ہوئے۔ حضور نظام نے اس دربار خاص میں آسمان جاہ کی وزارت کا باضابطہ اعلان فرمایا اور خلعت وزارت میں نواب میر نظام علی خاں بہادر کا ملبوس خاص عطا کیا گیا۔ اس کے علاوہ متعدد جواہرات لاقیمت سے سرفراز ہوئے[2]۔

نواب آسمان جاہ کے دور وزارت میں صحافت کو کامل آزادی حاصل رہی ریاست کے اہم معاملات میں ایڈیٹروں سے مشاورت کی جاتی تھی۔ یونانی اور ایورویدک طب کی آسمان جاہ نے بطور خاص سرپرستی کی۔ آپ کا خیال تھا کہ مریض کا علاج اس کے ماحول اور آب وہوا کے لحاظ سے کیا جانا چاہیئے۔

ریاست کے عوام کے نئے نئے خیالات اور ایجادات سے واقف کرانے کے لیے آپ نے ملک پیٹھ میں ایک بڑی نمائش کا افتتاح کیا۔ حیدر آباد میں یہ اپنی قسم کی پہلی نمائش تھی جس میں صنعتی ایجادات کے مظاہرے کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ عوام کو پابند اوقات بنانے کے لیے آپ نے چوک کے مقام پر ایک "کلاک ٹاور" تعمیر کرایا۔

نواب سر آسمان جاہ کے دور وزارت میں حسب ذیل علمائ اور مصنفین کو وظیفہ ماہانہ سو روپے منظور ہوا۔ ۱۔ مولوی عبدالحق مصنف تفسیر قرآنی۔ مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی۔ مولوی عبدالحق صاحب کانپوری اور مولانا الطاف حسین حالی[3] حالی نے شکریہ میں ایک طویل نظم کہی جس کے دو اشعار ہیں :۔

---

[1] دبستان آصفیہ جلد اول ص۱۷۵ مولفہ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ

[2] " " " ص۱۷۶ " " "

[3] " " " ص۱۷۵ " " "

اے بشیر دولت و دین نایب شاہ دکن
ہے مہمات دکن کا ذات پر تیری مدار
مجھ پہ فرمایا ہے لطف و کرم سرکار نے
شکر اس کا کر نہیں سکتا ادا میں زنہار

......

نواب سر آسمان جاہ کی مدار المہامی

نواب آسمان جاہ بہادر کا نام منظہر الدین خاں تھا۔ نواب محمد سلطان الدین خاں المخاطب سیف جنگ بشیر الملک کے چھوٹے فرزند تھے۔ وہ ماہ شوال ۱۲۵۶ھ م ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ چند سال کے ہوئے تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نواب عمدۃ الملک بہادر جو آپ کے چچا ہوتے تھے اور جنھیں کوئی اولاد نہیں تھی۔ سر آسمان جاہ سے دلبستگی پیدا کر لی[1] اور انھیں گود لے لیا۔ اس زمانہ میں سرکاری درباری زبان فارسی تھی۔ اس لیے ابتدائی تعلیم فارسی میں دی گئی البتہ عربی کو بطور زبان دوم پڑھایا گیا۔ کچھ زمانہ کے بعد انگریزی کی تعلیم شروع ہوئی تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی خیال رکھا گیا اور لائق اساتذہ اور اتالیق مقرر کیے گئے۔ جنھیں درباری آداب اور مشرقی تہذیب کا خوگر بنا دیا۔ انھیں عام بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہ تھی[2] چند معزز امرا کے بچوں کو منتخب کر کے ان کا ہم درس بنایا گیا ۱۴۔ ربیع الاول ۱۲۸۶ھ کو نواب عمدۃ الملک بہادر نے آپ کو نواب اقتدار الملک نواب وقار الامرا اور نواب خورشید جاہ بہادر کی ہمراہی میں حضور نظام کی خدمت میں حاضر کیا اور ایک سو اشرفی اور پچاس روپے بطور نذر پیش کیے۔ حضور نظام نے آپ کو اپنی ہمشیرہ پرورش النسا بیگم کے لیے منتخب فرمایا۔ ۱۴۔ ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ

---

[1] دبستان آصفیہ جلد اول ص ۵۶۸ مولفہ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ
[2] 〃 〃 〃 ص ۵۶۹ 〃 〃 〃 〃
[3] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

کو رسم نسبت انجام پائی اور ۲۴۔ شعبان ۱۲۸۶ھ کو عقد ہوا۔ شہزادی صاحبہ کے بطن سے آپ کوئی اولاد نہیں ہوئی[1]

سر سالار جنگ کے عہد وزارت میں جب ابتداً چار مدار المہامیاں قایم ہوئیں تو نواب سر آسمان جاہ کو ۱۲۸۶ھ میں صدار المہام عدالت مقرر کیا گیا۔ نواب صاحب نے یہ خدمت بطور اعزازی انجام دی۔ سر سالار جنگ کے ساتھ کام کرنے اور اکثر و بیشتر دوروں میں ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے آپ امور سلطنت سے بہت زیادہ واقف ہوگئے جب سالار جنگ سفر یورپ کے لیے روانہ ہوئے تو سر آسمان جاہ کو خدمت وزارت اور ایجنسی کا کام انجام دینے کے لیے منتخب کیا۔ آپ نے یہ خدمت نواب مکرم الدولہ کی شرکت میں بہ حُسن خوبی انجام دیا[2] سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد ریجنسی کونسل کے ممبر مقرر کیے گئے اور صدر المہامی عدالت کی خدمت سے سبکدوش ہوئے[3] حضور نظام میر محبوب علی خاں کے سفر کلکتہ کے دوران والی ریاست کے غیاب میں آپ نے امور سلطنت کے تمام کاروبار کی نگرانی کی[4]

نواب شمس الامرأ امیر کبیر عمدۃ الملک کو کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے امیر کبیر کے انتقال کے بعد نواب آسمان جاہ اور ان کے بھائی نواب محتشم الدولہ نواب عمدۃ الملک کے وارث قرار پائے[5] حیدر آباد کے امرأ میں یہ واقعہ بطور مثال پیش کیا جاتا تھا کہ کروڑوں کی ملکیت اور جائداد، ان بھائیوں نے ایک کمرہ میں بیٹھ کر صرف چند ہی گھنٹوں میں تقسیم کر لیا[6] اور پھر اس طرح اٹھے کہ دونوں مطمئن تھے اور کبھی کسی نے حرف شکایت زبان پر نہ لایا۔ حضور نظام نے دونوں

---

[1] دبستان آصفیہ جلد اول ص۵۶۹ مولف پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ

[2] دبستان آصفیہ جلد اول و دوم ص۵۷۰ 〃 〃 〃 〃

[3] 〃 〃 〃 ص۵۷۱ 〃 〃 〃 〃

[4] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[5] 〃 〃 〃 ص۵۷۳ 〃 〃 〃 〃

[6] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

بھائیوں کے لیے تعزیتی پوشاک کے طور پر نواب افضل الدولہ بہادر کا کہنہ ملبوس اور دو شالے عطا فرمائے [1] جنھیں زیب تن کر کے دونوں بھائی یکم جمادی الثانی ۱۲۹۴ھ حضور نظام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

بتاریخ ۱۷۔ربیع الاول ۱۲۹۷ھ نواب محتشم الدولہ نے بمقام باغ جہاں نما انتقال کیا۔ نواب صاحب موصوف کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے نواب آسمان جاہ ان کے تنہا وارث قرار پائے [2]

ایوان بشیر باغ

۱۲۹۷ھ میں نواب آسمان جاہ نے حسین ساگر سے قریب حسن بن محسن فرزند مقدم جنگ جمعدار عرب سے ایک باغ ۲۲ ہزار روپے میں خریدا بیس ہزار روپے میں اس کے اطراف واکناف کے علاقے خریدے گئے [3] اور پھر وہاں ایوان و عمارتیں تعمیر کی گئیں جس پر چار لاکھ روپے صرف کیے گئے۔ ایوان کی آرائش پر کئی لاکھ خرچ کیے۔ نواب صاحب نے اس محل کو ایوان بشیر باغ کے نام سے موسوم کیا۔

آسمان گڑھ

۱۳۰۳ھ میں نواب آسمان جاہ نے آسمان گڑھ کی تعمیر شروع کروائی [4] یہ محل ایک بلند پہاڑی پر ملک پیٹھ و یجائے واڑہ روڈ پر قایم ہے۔ حال ہی میں حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات نے ٹیلی وژن سنٹر کے قیام کے لیے اس ایوان کو پسند کیا ہے۔ باغ سرورنگر اور باغ عمدہ ساگر آپ کے ستھرے ذوق کے شاہد ہیں۔

ح۱ دبستان آصفیہ جلد اول و دوم ص۵۷۴ مولفہ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ

ح۲ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

ح۳ 〃 〃 〃 〃 ص۵۷۷ 〃 〃 〃 〃

ح۴ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مولوی جواد حسین دلیر الملک اور مسٹر جیکب کے مقدمات

نواب آسمان جاہ کے دور وزارت میں چند مقدمات دائر ہوئے جس میں مولوی جواد حسین کا مقدمہ اور دلیر الملک کا معدنیات کا مقدمہ قابل ذکر ہیں دلیر الملک کے مقدمہ میں پیروی کے لیے نواب محسن الملک کو لندن روانہ کیا گیا مسٹر جیکب کا مقدمہ الماس بھی جو حیدر آباد کی تاریخ عدلیہ میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے اس زمانہ میں پیش ہوا۔ مسٹر جیکب نے ایک بہت بڑا الماس ۲۲ یا ۲۳ لاکھ روپے میں اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے ہاتھ فروخت کیا۔ دراصل یہ الماس ایک بہت بڑی سفارش کی بنا پر خریدا گیا تھا۔ جیکب نے بڑی ہوشیاری سے الماس کو بدل دیا۔ حضور نظام نے اپنی شکایت حکومت ہند کو روانہ کی۔ حکومت ہند نے جیکب کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اس مقدمہ میں خریدار الماس کی حیثیت سے نواب میر محبوب علی خاں کا حلفیہ بیان انتہائی اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ حیدر آباد کے بعض امراً عموماً اور عوام خصوصاً اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اعلیٰ حضرت اس مقدمہ میں ایک عام گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں۔ اس خصوص میں ایک باضابطہ مہم شروع ہوئی حضور نظام نے عدالتی عظمت اور دادرسی کے ضابطوں کا لحاظ کرتے ہوئے کمیشن میں تشریف لائے اور بطور گواہ اپنا بیان قلمبند کرایا[1] بالآخر مقدمہ کا تصفیہ حضور کے موافق ہوا۔ اصلی الماس برآمد کیا گیا اور ایک کثیر رقم بطور ہرجانہ مسٹر جیکب کو ادا کرنی پڑی۔

نواب مدار المہام کے مددگار

نواب سر آسمان جاہ کے مددگار مولوی مشتاق حسین مقرر ہوئے جنھوں نے بہت جلد ریاست کے تمام کاروبار اپنی نگرانی میں لے لیا۔ انگریزی مراسلت کے لیے فریدون جی مقرر ہوئے اور مشیر قانونی کی خدمت میں پیدو جی کا تقرر عمل میں آیا[2]

---

[1] کارنامہ سروری ص۲۸۰

[2] " " ص۲۸۱

مہدی حسن فتح نواز جنگ مشتاق حسین کے شریک خدمت مقرر کیے گئے ۔ ۶۔ اگست ۱۸۸۹ء کو سر ڈنس فٹز پاٹرک بحیثیت رزیڈنٹ بن کر حیدر آباد آئے ۔ سر ڈنس پیاٹرک نے نواب آسمان جاہ کی بھرپور حمایت کی[۱] ایک نئی تحریک یہ شروع کی گئی کہ خدمت پیشکاری کو ختم کر دیا جائے ۔ کیوں کہ یہ عہدہ مدار المہام کے خیال میں محض ایک رسمی عہدہ تھا ۔ اور ریاست کو کافی بار اٹھانا پڑ رہا تھا ۔ اس زمانہ میں راجہ کشن پرشاد کو کوئی اثر و رسوخ حاصل نہ تھا ۔ وہ نواب افسر جنگ اور نواب محبوب یار جنگ کی صف میں بیٹھنا غنیمت خیال کرتے تھے تاکہ حضور سے باریابی حاصل ہو سکے[۲] آسمان جاہ کے مشیروں نے سالار جنگ کے خاندان کی اہمیت کو بھی کم کرنا چاہا[۳] لیکن برطانوی حکومت کے اثر و رسوخ کی بنا پر وہ کوئی کارروائی نہ کر سکے ۔ نواب وقار الامراء نے آسمان جاہ سے صلح صفائی کر لی تھی اور انتظام ریاست میں آہستہ آہستہ دخیل ہو کر امیدوار وزارت ہوئے[۴] بہت جلد مہدی علی خاں میر نواز جنگ ۔ محسن الملک ۔ محمد صدیق الخبیر اور سید علی بلگرامی المناب عماد جنگ نے آسمان جاہ اور ان کے مددگاروں کے خلاف صف آرائی شروع کر دی ۔ اخبارات میں طویل تنقیدی مضامین شائع کیے گئے[۵] مسٹر کوہل محسن الملک کی تائید سے مضامین لکھ رہے تھے وقت بے وقت مخالف فریق سے ملتے اور اپنا معاوضہ حاصل کیا کرتے تھے ۔

نواب محسن الملک جب انگلستان گئے تو مسٹر گلاڈسٹون سے ان کے تعلقات بہت قریبی ہو گئے ۔ اس سرگرمی کی گن بھن جب حیدر آباد تک پہنچی تو مہدی حسن خاں فتح نواز جنگ مع اپنی بیگم انگلستان روانہ ہوئے اور کسی نہ کسی طریقہ سے ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں مع اپنی بیگم صاحبہ باریابی کا

ع۱ کارنامہ سروری صفحہ ۲۸۳

ع۲ " " صفحہ ۲۸۴

ع۳ " " صفحہ ۲۸۴

ع۴ " " صفحہ ۲۸۴

ع۵ " " صفحہ ۲۸۵

موقع حاصل کرلیا۔ ادھر حیدرآباد میں مسٹر متراکا ایک کتابچہ بیگم فتح نواز جنگ کے خلاف شائع ہوا۔ رزیڈنٹ نے ان تمام واقعات پر اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ کیوں کہ کتابچہ میں مندرج واقعات کی روشنی میں ایسی بیگم کی باریابی سے ملکہ انگلستان کی توہین ہوتی تھی۔[1]

نواب سرآسمان جاہ نہایت کم گو اور ایک سنجیدہ امیر تھے۔ سوائے معاحبین خاص اور اہل خلوت کے کسی سے بے تکلفانہ گفتگو نہ کرتے تھے۔[2] جو قواعد و مراسم دربار نواب عمدۃ الملک اور مختارالملک نے قایم رکھا تھا اس کی پابندی کیا کرتے تھے۔[3] لیکن بعد میں انگریزی طور طریق کو اپنانے لگے تھے معتمدین خاص پر بے حد بھروسہ کرتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کے دور وزارت میں معتمدین کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہوگئے تھے[4] اور وہ مثل وزیر ریاست کارہائے مملکت انجام دیا کرتے تھے۔ بجز معتمدین کے کسی اور کو معاملات سرکاری میں دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔ نواب آسمان جاہ حضور نظام کے سچے بہی خواہ اور جانثار تھے۔ حضور نظام نے یہ مناسب سمجھا کہ قانون چہ مبارک یعنی دستور حکمرانی مرتب کیا جائے تاکہ مدارالمہام سے لے کر ایک معمولی اہلکار ایک طریق کار کے پابند رہیں اور اپنے اختیارات سے متجاوز کوئی کام انجام نہ دیں۔ لیکن اس تحریک کے مخالفین جن میں بدقسمتی سے نواب آسمان جاہ کے نادان مددگار پیش پیش تھے اخبارات میں طویل مضامین شائع کرائے کہ ریاست کے قدیم آئین اور عمل درآمد نئے قانون چہ کے ذریعہ تبدیل نہ کیے جائیں۔ قانون چہ مبارک کے خلاف جو لوگ صف آرا ہوئے ان میں مسٹر ڈنلاپ پیش پیش تھے۔ قانون چہ مبارک کا اجرا اس لیے بھی ضروری سمجھا گیا کہ بعض

---

[1] کارنامہ سروری ص۲۹۹ مسٹر مترا کے خلاف مقدمہ کی تفصیل

[2] 〃 〃 ص۲۸۸

[3] 〃 〃 ص۲۹۷

[4] 〃 〃 ص۲۹۷

[5] 〃 〃 ص۲۹۸

اکابرین ریاست گورنمنٹ آف انڈیا کو یہ باور کرانے لگے کہ حضور نظام امور حکمرانی میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے اور روز و شب عیش و عشرت اور شکار میں مصروف رہتے ہیں[1] بعض بہی خواہوں نے والی ریاست سے عرض کیا کہ حضور معاملات سلطنت میں بہ نفس نفیس توجہ فرمائیں تاکہ دیوان ریاست مختار کامل نہ بن جائیں۔ جب یہ افواہ گرم ہوئی کہ قانون چہ مبارک سرور الملک مرتب کریں گے تو نواب آسمان جاہ کی جانب سے نواب سرور الملک کو ایک لاکھ روپے بطور رشوت روانہ کیے گئے اور منشا یہ تھا کہ ان کے اختیارات ختم نہ کیے جائیں سرور الملک نے اس رشوت کا تذکرہ حضور نظام اور رزیڈنٹ پلاوڈن سے کر دیا[2] اس معاملہ کی تحقیقات ہوئی اور نتیجتاً مولوی مہدی (محسن الملک) شہر بدر کر دیے گئے۔ مہدی حسن فتح نواز جنگ مع اپنی میم نما بیگم صاحب لکھنؤ روانہ ہوئے اور مشتاق حسین وقار الملک کو ریاست چھوڑنا پڑا[3]۔ ایک لاکھ کی رشوت کے واقعہ کے بعد رزیڈنٹ پلاوڈن نے حضور نظام سے اصرار کیا کہ وہ سر آسمان جاہ کو وزارت سے علاحدہ کر دیں اور ان کا جانشین نواب وقار الامرا مقرر کیے جائیں۔ نواب میر محبوب علی خاں نے رزیڈنٹ سے صاف کہہ دیا کہ وقار الامرا سے کوئی بہتری کی امید نہیں ہے اور آسمان جاہ ان سے بہتر ہیں[4] لیکن رزیڈنٹ سے بالمشافہ گفتگو کے بعد حضور نظام نے وقار الامرا کے تقرر کو منظور فرمایا۔ اس تمام عرصہ میں آسمان جاہ نے خود کو سیاسی جوڑ توڑ سے دور رکھا اور ریاست کے کاموں پر توجہ دیتے رہے۔ رزیڈنٹ پلاوڈن کی مخالفت کی بنا پر آسمان جاہ نے عزت سے علاحدہ ہونا مناسب سمجھا اور حسب رواج ۶۔ جمادی الاول سنہ ۱۳۱۱ھ کو بہ عذر علالت چھ ماہ کی رخصت چاہی جو منظور کر لی گئی۔ سر وقار الملک کا اولاً تقرر منصرمانہ کیا گیا۔ لیکن رزیڈنٹ کے مسلسل تقاضے پر کافی عرصہ کے بعد انھیں مستقلاً وزارت عطا

---

1. کارنامہ سروری ص ۲۰۲ (فٹ نوٹ)
2. کارنامہ سروری مولفہ نواب سرور الملک ص ۳۱۲ و ۳۱۴
3. 〃 〃 〃 〃 ص ۳۱۹
4. 〃 〃 〃 〃 ص ۳۲۷

کیں گئی ۔

والیٔ ریاست نواب میر محبوب علی خاں کی اس خواہش کے پیش نظر کہ عہدہ دار اور مقتدر اصحاب عوام سے زیادہ سے زیادہ قریب رہیں۔ حیدر آباد کے امرا عظام سال میں ایک مرتبہ کم از کم اپنی دیوڑھی کے پرانے چوبی پھاٹک عوام کے لیے کھول دیا کرتے تھے نواب خورشید جاہ کی دیوڑھی میں ناگ پنچمی کا میلہ ہوتا تھا۔ ایوان دیوڑھی میں ہولی کا جشن منایا جاتا تھا اور سر آسمان جاہ کے بشیر باغ پیالس میں بسنت کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔

سید باقر حسین صاحب ضیا نے سر آسمان جاہ کے جشن بسنت پنچمی کے موقع پر ۱۳۰۷ھ میں ایک مثنوی کہی تھی جو مثنوی ضیا دکن کے عنوان سے مطبع برہانیہ کی جانب سے شائع کی گئی ہے ۔ اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا جاتا ہے ایک جلسہ وہیں
نہیں ایسی رونق سے ہوتا کہیں

اسی روز ہوتا ہے دربار بھی
شرف بخشی ہوتے ہیں سرکار بھی

مدارات ہوتی ہے ذی شانوں کی
ضیافت بھی کرتے ہیں مہمانوں کی

یہ معلوم ہوتا ہے ایک عید ہے
یہ جلسہ غرض قابل دید ہے

تکلف کا ہوتا ہے ہر ایک کا
کمر بند و دستار و جامہ قبا

نمک خوار دیوانی و پائیگاہ
کل اہل قلم افسران و سپاہ

دیا جاتا ہے سب کو عطر و گلاب
نہ انداز جس کا ہے کچھ نہ حساب

عطا ہوتا ہے بعض کو پاندان
الائچی ڈلی جوز پھول پان
سوا ہوتی ہے خاص کی منزلت
کہ خلعت انھیں ہوتے ہیں مرحمت
دوشالہ بہت خود کشمیر کا
یہ اکرام ہوتا ہے ان کو عطا
(ماخوز از کتاب تذکرہ معاشرت حیدر آباد)

اس زمانہ میں محلہ شاہ علی بنڈہ میں پہلے محکمہ آبرسانی کی جانب سے پانی کی سربراہی نہیں ہوتی تھی۔ نواب آسمان جاہ نے جل پلی کو تالاب سے نہر اور نل لاکر اس محلہ کو سیراب کیا اور ایک عرصہ تک اسی طرح پانی کی سربراہی جاری رہی۔ جب نیا خزانہ آب بنا تو پانی شاہ علی بنڈہ کی اونچی سطح تک پہنچنے لگا اور تالاب جل پلی کے نل بیکار ہو گئے۔ مدار المہام سر آسمان جاہ نے حکم صادر فرمایا کہ شاہ علی بنڈہ کو جن نلوں سے خزانہ جل پلی سے پانی کی سربراہی ہوتی ہے ان پر معمولی ٹیکس آب رسانی عاید کیا جائے۔ شاہ علی بنڈہ کے عوام اس مطالبہ کی عمداً تعمیل نہ کرتے تھے۔ نواب صاحب نے حکم دیا کہ شاہ علی بنڈہ کے وہ تمام نل بند کر دیے جائیں تا وقتیکہ آب رسانی کا ٹیکس ادا نہ ہو جائے۔ مدار المہام کے حکم کی تعمیل میں نل بند کر دیے گئے۔ ایک منچلے نے یہ شعر لکھ کر نواب مدار المہام کی خدمت میں روانہ کیا۔

فرات اس نے کیا بند اس نے جل پلی
امیر شام کا بیٹا بنا امیر کبیر

نواب آسمان جاہ نے اس شعر کو پڑھ کر نل کھول دینے کا حکم صادر فرمایا اس واقعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ صحافتی ذرائع کے حاصل نہ ہونے کے باوجود عوام اپنی شکایت مدار المہام تک روانہ کر سکتے تھے۔ اور مدار المہام کو "امیر شام کا بیٹا" کہنے کی جرأت بھی رکھتے تھے پھر اس احتجاج کو نظر انداز

بھی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ غلطی کی اصلاح فوراً کی جاتی تھی۔

وزارت سے علاحدگی کے بعد نواب آسمان جاہ بہادر زیادہ تر سرونگر میں مقیم رہے اور پائیگاہ آسمان جاہی کا انتظام فرماتے رہے۔ آپ کے ایک فرزند تھے جن کا نام خواجہ چشتی سے عقیدت کی بنا پر معین الدین خاں رکھا گیا جو بعد میں نواب معین الدولہ بہادر کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور شکار کے شائق اور کرکٹ کے سرپرست کی حیثیت سے کافی مشہور ہوئے۔

نواب آسمان جاہ ۲۔ محرم ۱۳۱۶ھ کو سرطان کی مرض میں مبتلا ہوئے اور ۲۶۔ صفر ۱۳۱۶ھ کو دن کے گیارہ بجے بمقام سرونگر انتقال کیا۔[1]

نواب سر وقار الامراء کا دور وزارت

۶۔ جمادی الاول سنہ ۱۳۱۱ھ م ۱۸۹۴ء کو جب آسمان جاہ بہادر نے حسب رواج چھ ماہ کی رخصت بیماری حاصل کی تو وزارت کے زیادہ مستحق یا دعویدار نواب سر وقار الامراء (اقبال الدولہ بہادر) تھے لیکن رزیڈنٹ حیدرآباد مسٹر پلاوڈن کی خاص کوشش اور سفارش سے انھیں عہدہ وزارت عطا کیا گیا سر وقار الامراء انگریز حکومت اور رزیڈنٹ حیدرآباد کے پسندیدہ امیر تھے اس لیے ان کے تقرر سے پہلے "دربار" کی جدید ترین اور آرائش ضروری تھی اس مقصد کے تحت وقار الملک، فتح نواز جنگ۔ سرور الملک۔ محسن الملک اور مسٹر مہدی حسین دربار سے اٹھا دیے گئے اور رزیڈنٹ پلاوڈن کی راست نگرانی میں نواب وقار الامراء نے قلمدان وزارت سنبھالے رکھا۔

نواب سر وقار الامراء کے رزیڈنٹ کے ساتھ قریبی تعلقات کچھ اس لیے بھی مستحکم ہوئے کہ مدار المہام وقت سر آسمان جاہ سے وقار الامراء کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ حسن آباد اور نارائن کھیڑ جو آسمان جاہ کے علاقے تھے ۱۶۔ محرم ۱۲۹۶ھ کو سر وقار الامراء کے قبضہ میں چلے گئے[2] اور اس وجہ سے ان دو امرائے اعظام کے درمیان

---

[1] دبستان آصفیہ جلد اول و دوم ص۵۶۸

[2] دبستان آصفیہ جلد دوم ص۵۶۵

جھگڑوں کا آغاز ہوا۔ سنہ ۱۳۰۸ھ میں کسی خانگی معاملے کی بنا پر نواب خورشید جاہ سے آسمان جاہ کا اختلاف بڑھ گیا[۱] لیکن ہر دو امرا نے مصلحتاً چشم پوشی کرلی اور ان کے حاشیہ نشیں ان امرا کی مخالفت کو زیادہ ہوا دینے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

نواب سر وقار الامرا۔ سر اقبال الدولہ۔ وقار الملک کا نام محمد فضل الدین خاں تھا۔ جو نواب رشید الدین خاں امیر کبیر کے چھوٹے فرزند تھے آپ بتاریخ ۱۱۔ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے[۲] اسم نویسی کی تقریب میں نواب ناصر الدولہ نے میوہ خوری کے لیے دو سو روپے ماہانہ مقرر کیے۔ ۱۵۔ ربیع الثانی ۱۲۷۷ھ کو تسمیہ خوانی کی تقریب نواب امیر کبیر شمس الامرا نے ادا کی جس میں نواب افضل الدولہ بہادر بہ نفس نفیس شریک ہوئے[۳]

جب تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو فارسی کے ساتھ انگریزی زبان کو زیادہ اہمیت دی گئی اور انگریزی تعلیم کے لیے ایک انگریز استاد مقرر کیا گیا[۴] جس کی وجہ سے نواب صاحب انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرسکے۔

لیڈی سر وقار الامرا

جب آپ کی عمر ۱۶ سال کی ہوئی تو نواب افضل الدولہ نے آپ کو اپنی صاحبزادی جہاندار النسا بیگم کے لیے منتخب فرمایا۔ ۴۔ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ کو نہایت تکلف کے ساتھ شادی رچائی گئی[۵] صاحبزادی جہاندار النسا بیگم ایک بیدار مغز خاتون تھیں انگریزی میں کافی مہارت رکھتی تھیں اور اہم سرکاری معاملات میں وہ رزیڈنٹ حیدرآباد سے بالراست گفتگو کیا کرتی تھیں۔ وہ اپنے شوہر نواب وقار الامرا کی

۱۔ دبستان آصفیہ جلد دوم ص۵۷۸

۲۔ 〃 〃 〃 ص۵۸۳

۳۔ 〃 〃 〃 〃

۴۔ 〃 〃 〃 ص۵۸۴

۵۔ 〃 〃 〃 〃

مددگار خاص اور امور حکمرانی میں مشیر با تدبیر تھیں لیڈی وقارالامرا کے حسن تدبر کے کئی واقعات حیدرآباد میں ایک مدت تک مشہور رہے۔ صاحبزادی کے بطن سے نواب وقارالامرا کو ایک فرزند پیدا ہوا جس کا نام مختارالدین خاں رکھا گیا۔ جو بعد میں نواب سلطان الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بدقسمتی سے نواب سلطان الملک ۲۷۔ جمادی الاول ۱۳۲۵ھ کو دماغی عارضہ میں مبتلا ہوئے اور علاج کے لیے امریکہ۔ انگلستان وغیرہ روانہ کیے گئے صاحبزادی جہاندارالنساء سے ایک اور فرزند تولد ہوئے جن کا نام اکرام الدین خاں رکھا گیا لیکن چند سال کی عمر پاکر انھوں نے انتقال کیا۔ سروقارالامرا کو دوسرے محل سے ایک فرزند تولد ہوئے جن کا نام ولی الدین خاں رکھا گیا جو بعد میں نواب ولی الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ نواب وقارالامرا کی ایک صاحبزادی نواب قدیر جنگ فرزند نواب قوت جنگ سے دوسری صاحبزادی نواب کلیانی سے بیاہی گئیں[۱]

جب نواب آسمان جاہ نے ۶۔ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ کو خدمت مدارالمہامی سے استعفیٰ پیش کیا تو نواب میر محبوب علی خاں نے سروقارالامرا کو کوہ مولا پر یاد فرمایا اور منصرمانہ طور پر مدارالمہامی کی خدمت آپ کے سپرد کی گئی ۴۔ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ کو آپ مستقلاً مدارالمہام بنائے گئے[۲] نواب سروقارالامرا کا دور حیدرآباد میں علمی و ادبی ترقی کے لیے ہمیشہ یاد رہے گا۔ سررشتہ علوم و فنون، کتب خانہ آصفیہ۔ سررشتہ تدوین علوم اہل بیت مدرسہ انجینئرنگ اور لا کلاس کا قیام اسی زمانہ میں ہوا[۳] سروقارالامرا نے کئی دور دراز ممالک کے سفر کیے۔ نواب صاحب کے دور وزارت میں یہ بحث کافی اہمیت حاصل کرچکی تھی کہ مدارالمہام کے غیاب میں کون منصرم مدارالمہام ہو سکتا ہے۔

۱؎ دبستان آصفیہ جلد دوم ص۵۸۶

۲؎ " " " ص۵۸۷

۳؎ " " " "

منصرم مدار المہام کے تقرر پر امرأ میں اختلاف ؎۱

وقار الامرأ کو اپنے دورِ وزارت میں تین مرتبہ بیرونِ ریاست جانا پڑا۔ منصرم مدار المہام بہ منظوری فرمان روا مقرر ہوتا تھا اور جریدہ غیر معمولی میں اس تقرر کی اشاعت عمل میں آتی تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد پیشکار اور معین المہام سلطنت تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ پیشکاری کا عہدہ مدار المہام کے بعد دوسرے مرتبہ کا رتبہ ہے اس لیے انھیں مدار المہام ہونا چاہیے۔ دوسری طرف افتخار الملک سنیر معین المہام خیال کیے جاتے تھے۔ اس بنا پر وہ اس خدمت کے دعویدار تھے۔ رزیڈنسی کی ڈنر میں کچھ اس طرح نشستوں کا انتظام ہوتا تھا کہ امرأ کے درمیان باہمی فرق کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ جہاں تک شاہی دربار میں نشستوں کی ترتیب کا سوال تھا یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ والی ریاست کی مرضی پر منصرم ہے اور کسی کو ادعا حقوق حاصل نہیں ہے۔ مدار المہام وقت (نواب سر وقار الامرأ) فخر الملک اور مہاراجہ سر کشن پرشاد کو چنداں پسند نہ کرتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے پہلے دورہ کے موقع پر نواب افتخار الملک کے لیے منصرم مدار المہام کا معروضہ پیش کیا جو منظور کیا گیا۔ اس منصرم مدار المہامی کے تقرر پر نواب فخر الملک نے شدید احتجاج کیا نواب میر محبوب علی خاں نے پہلی مرتبہ اس نزاکت کو محسوس فرمایا اور حکم ہوا کہ کسی منصرم مدار المہام کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ مدار المہام ایک مختصر مدت کے لیے دورہ پر رہیں گے۔ بعد میں جب مدار المہام گورنر جنرل سے ملنے کے لیے شملہ روانہ ہوئے تو تقرر منصرم مدار المہام کا مسئلہ پھر تازہ ہوا۔ والی ریاست نے تمام معین المہامان کے حقوق پر غور فرمایا اور قرار دیا کہ مہاراجہ کشن پرشاد بحیثیت "پیشکار سلطنت" امرأ میں برتری رکھتے ہیں اور وہی نگراں کار مدار المہام رہیں گے۔ اس تصفیہ کے بعد یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

۶۔ ربیع الثانی سنہ ۱۳۱۹ھ کو سر وقار الامرأ سفر یورپ کے لیے حیدرآباد سے

؎۱ مہاراجہ کشن پرشاد مولفہ حافظ محمد مظہر ص ۱۳۱

روانہ ہوئے۔ آپ کے اسٹاف میں شاہ پورجی ایڈل جی چینائی، مرزا رزاق علی بیگ ڈاکٹر لاڈر۔ غلام محمد مہتمم خزانہ خانگی مع شاگرد پیشہ و متعدد چوبدار شریک تھے[1] لندن کے قیام کے زمانہ میں ملکہ وکٹوریہ نے آپ کو باریاب کیا اور ہندوستان سے متعلق کئی معلومات حاصل کیں[2] جب اعلیٰ حضرت لارڈ رپن سے ملاقات کے لیے کلکتہ روانہ ہوئے تو نواب سر وقار الامرأ آپ کے ہم سفر تھے۔

نواب سر وقار الامرأ کو عمارتوں کی تعمیر کا والہانہ شوق تھا آپ کے عہد میں ایسے عظیم الشان قصر اور ایوانات تعمیر ہوئے جن پر اہل حیدرآباد بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں ان عمارتوں میں قصر فلک نما قابل ذکر ہیں ۔

قصر فلک نما

قصر فلک نما حیدرآباد شہر کے جانب مغرب ایک ایسی پہاڑی پر واقع ہے جو سطح سمندر سے دو ہزار فٹ بلند ہے۔ اسی مقام پر بانی شہر حیدرآباد سلطان محمد قلی قطب شاہ نے محل کوہ طور کے نام سے ایک محل تعمیر کیا تھا[3] قصر کوہِ طور کا تفصیلی حال تاریخ حدیقۃ السلاطین اور تاریخ ظفر میں درج ہے۔ زوالِ گولکنڈہ کے بعد دوسری قطب شاہی عمارتوں کے ساتھ یہ محل بھی مغل سرداروں نے خزانہ کی تلاش میں منہدم کر دیا۔ صرف کھنڈر باقی رہ گئے تھے۔ نواب اقبال الدولہ (نواب وقار الامرأ) نے اس پہاڑی پر محل بنانے کا منصوبہ بنایا اور ۱۳۰۱ھ م ۱۸۸۴ء میں سنگ بنیاد رکھی گئی ۔ آٹھ سال کے عرصہ میں یعنی ۱۸۹۲ء میں یہ محل تعمیر ہوا[4] اور پھر آراستہ کیا گیا۔ صرف تعمیر پر اس زمانہ میں چالیس لاکھ روپے صرف کیے گئے۔ اس محل کے ڈائننگ ہال میں پانچ سو مہمانوں کی بہ ایک وقت تواضع کی جا سکتی تھی۔

۱؎ دبستان آصفیہ جلد دوم ص۵۸۸

۲؎ " " " " "

۳؎ فرخندہ بنیاد حیدرآباد مولفہ رائے ست گرو پرشاد صاحب ص۹۹

۴؎ " " " " " " " "

عمارت کا ضروری حصّہ ۱۳۰۵ھ میں بن چکا تھا اس لیے نواب صاحب قصر فلک نما میں قیام پذیر ہو گئے۔ سنہ ۱۳۰۹ھ میں جب عمارت پورے طور پر تیار ہو گئی تو معلوم ہوا کہ اس کی تعمیر پر کس قدر روپیہ خرچ کر دیا گیا۔ نواب صاحب کے ذرائع آمدنی ایسے نہ تھے جس سے ان بھاری قرضوں کی ادائی ہو سکتی اس لیے نواب صاحب مجبوراً فلک نما کو فروخت کرنے کی فکر کرنے لگے۔ قصر فلک نما کو خریدنا کسی معمولی امیر کے بس میں نہ تھا خود وقار الامرأ ایک ایسے خریدار کی تلاش میں تھے جو قصر فلک نما کی آن بان کو قایم رکھ سکے؎۱ آپ نے کئی بار حضور میر محبوب علی خاں سے اس قصر کا تذکرہ بھی کیا۔ آخر رزیڈنٹ حیدر آباد نے میر محبوب علی خاں پر اثر ڈالا کہ وہ قصر فلک نما خرید لیں اور فلک نما کی مناسب قیمت ادا کر دیں تاکہ مدار المہام قرض سے نجات پا سکیں۔ نواب میر محبوب علی خاں بی بی کے چشمے کی زیارت کے بعد قصر فلک نما تشریف لائے تو نواب وقار الامرأ نے میزبانی کی۔ فلک نما کی عمارت حضور نظام میر محبوب علی خاں کو اس قدر پسند آئی کہ وہ ایک ہفتے تک وہاں مقیم رہے۔ آخر سر وقار الامرأ نے قصر فلک نما حضور نظام کو نذر کیا اور خود اہل خاندان کے ساتھ بیگم پیٹھ پیالس واپس آ گئے۔ نواب میر محبوب علی خاں، نواب وقار الامرأ کے کثیر قرض سے واقف تھے اس لیے انھوں نے تمام قصر فلک نما کو نذر میں قبول کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ نواب صاحب نے فلک نما کے ایک حصّہ کو نذر تصوّر کر کے باقی عمارت کی مالیت کا تعین کرایا اور حضور نظام نے تعین شدہ قیمت کئی قسطوں میں نواب صاحب کو ادا کی۔ فرمان مورخہ ۱۰۔ جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ کے مطابق فلک نما کی عمارت بیس لاکھ روپے میں خرید لی گئی۔ اور ساتھ ہی پانچ لاکھ بطور معافی اور ۱۳ لاکھ روپے بطور قرض سر وقار الامرأ کو ادا کیے گئے۔ قرض کی واپسی کے لیے حکم ہوا کہ نواب وقار الامرأ ایک لاکھ روپے سالانہ خزانۂ شاہی میں داخل کرتے رہیں؎۲ ۱۸۹۶ء تک یہ محل نواب وقار الامرأ کی ملک رہا۔ سنہ مذکور میں میر محبوب علی خاں نے اس محل کو خرید لیا اور یہ صرف خاص

؎۱ دبستان آصفیہ جلد دوم ص۵۹۱

؎۲ 〃 〃 〃 〃 〃

کی ملک قرار پایا۔ نواب سرافسر الملک اس محل کے نگراں مقرر ہوئے۔

نواب آسمان جاہ کے دور وزارت کے برخلاف آپ کے دور میں صحافت کو آزادی حاصل نہیں تھی۔ جنگ روم وروس کی خبروں کو اخبارات تفصیل سے شائع کرتے تھے لیکن مقامی اور ریاستی خبروں کی اشاعت میں کافی احتیاط کی جاتی تھی۔

نواب سروقارالامرا غربا اور حاجت مندوں کی بھرپور مالی مدد کیا کرتے تھے شرفا کو پوشیدہ طور پر مالی امداد دی جاتی تھی۔ تاکہ بات نہ پھیل جائے اور راز راز ہی رہے۔ سرآسمان جاہ بہادر سے ان کے تعلقات کشیدہ تھے۔ لیکن جب سر آسمان جاہ ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی میں شرکت کے لیے انگلستان روانہ ہوئے تو انھوں نے اپنے خانگی علاقہ جات اور پائیگاہ کا انتظام آپ کے سپرد کیا جس کا وقارالامرا نے انتہائی احتیاط کے ساتھ انتظام کیا۔ اپنی پائیگاہ کے انتظام کے لیے نواب صاحب نے مسٹر ڈنلاپ کو اپنا معتمد مقرر کیا۔

سروقارالامرا کے دور وزارت میں پہلی بار "معتمد پیشی مبارک" کا عہدہ قایم ہوا اس عہدہ دار کا فریضہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کے ملاحظہ کے لیے جو کارروائیاں پیش ہوں ان کو بعد تنقیح ملاحظہ عالی میں پیش کرے۔ رزیڈنٹ کا یہ منشا تھا کہ معتمد پیشی مبارک کے ذریعہ والی ریاست کے اختیارات پر تحدید قایم کی جاسکے اور حسب ضرورت وزرا پر معتمد پیشی کے ذریعہ دباؤ ڈالا جاسکے۔ اولاً نواب سرور الملک اس خدمت پر مقرر ہوئے۔ لیکن یہ معتمد پیشی مبارک رزیڈنٹ کے امیدوں کو پورا نہ کر سکے اور ان کی کوئی تحریک سرسبز نہ ہو سکی۔ آخر ان کو برٹش انڈیا کے اثر اور دباؤ کی بنا پر حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔

سرامین جنگ

سرور الملک کی جگہ مولوی احمد حسین صاحب (نواب امین جنگ) معتمد پیشی مبارک مقرر کیے گئے لیکن وہ بھی اپنے پیشرو نواب سرور الملک کی طرح مالک و ملک کے خیر خواہ رہے۔

نواب سرامین جنگ بڑا اعلا علمی ذوق رکھتے تھے اور ان کا خانگی کتب خانہ ہندوستان

کے خانگی کتب خانوں میں ممتاز ترین خیال کیا جاتا تھا۔ نواب صاحب کی تنخواہ اور آمدنی کا بڑا حصہ کتب کی خریدی میں صرف ہو جاتا تھا[1]

حیدرآباد میں اردو کا پہلا فری میسن لاج

نواب امین جنگ کی حوصلہ افزائی سے محمد حسین بلگرامی نے فری میسن لاج میں پڑھی جانے والی عبارتوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کے بعد اردو میں کارروائی کرنے والے لاج کے قیام کی گرانڈ لاج آف اسکاٹ لینڈ سے اجازت حاصل کرنے میں نواب صاحب نے بڑی جاں فشانی کی اور اس طرح حیدرآباد لاج کا قیام عمل میں آیا۔ جو اپنی قسم کا سارے ہندوستان میں ایک ہی لاج ہے[2]

سکندرآباد کے علاوہ حیدرآباد میں جب لاج مور لینڈ کا قیام ہوا تو اس وقت عمارت کے لیے ایک موزوں مقام جو فتح میدان سے متصل ہے حاصل کیا گیا۔ لاج کے قیام کے لیے کافی روپیہ بھی فراہم کیا گیا اور کافی قرضہ بھی لیا گیا۔ ایک عالیشان پتھر کی عمارت تعمیر کی گئی جس میں کچھ عرصہ پہلے تک ریلائنس آٹو موبائل کمپنی قایم تھی اور اب دکن ٹاور کی دس منزلہ عمارت کھڑی ہے۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں اس عمارت میں لاج کا افتتاح سر آسمان جاہ مدارالمہام وقت نے کیا۔ لیکن قرض کا بوجھ کافی بڑھ گیا تھا اور آخر کار نواب افسر جنگ کے زمانہ سپہ سالاری میں یہ عمارت فوج کو فروخت کر دی گئی جہاں فوجی میس قایم کیا گیا۔ سررشتہ فوج نے نقد رقم کے علاوہ معاوضہ میں گوشہ محل کی قطب شاہی بارہ دری بھی لاج کو دی تاکہ اس کی تقاریب وہاں جاری رہ سکیں۔

نواب منصب جنگ کے ایک بیان کے مطابق ان کے ایک عزیز جو اس وقت فوج میں کپتان تھے اکثر کہا کرتے تھے کہ جس وقت بارہ دری سے فوجی سامان

---

[1] حیدرآباد کے بڑے لوگ از سید غلام پنجتن صفحہ ۲۶
کارنامہ سرداری صفحہ ۲۴۹ (فٹ نوٹ)

[2] " " " " "

منتقل کیا جارہا تھا تو دیگر اسباب کے علاوہ اس بازہ دری سے کئی انسانی کھوپڑیاں اور انسانی ڈھانچے بھی برآمد ہوئے۔

سر امین جنگ نے کرمن گھٹ میں ایک باغ اور چھوٹا سا بنگلہ بنالیا تھا۔ جس میں وہ کبھی کبھی اپنے خاص احباب کے ساتھ تفریح کے لیے چلے آتے تھے وہ کسی محفل میں یا خانگی ملاقاتوں میں ملکی معاملات پر کبھی اظہار خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کے پاس وہ لوگ آتے تھے جو علمی وادبی ذوق رکھتے تھے[1] جب ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور حیدرآباد آئے تو امین جنگ نے انھیں اپنے پاس مدعو کیا۔ دونوں جب بغل گیر ہوئے تو دونوں بزرگوں کی داڑھیاں مل گئیں۔ مہاراجہ جو پاس ہی کھڑے تھے برجستہ شعر پڑھا ۔ع

محفل میں ہیں آج جمع دو صاحب ریش
دونوں دلشاد اور دونوں دلریش

حضرت امجد حیدرآبادی بھی موجود تھے انھوں نے رباعی کے دو مصرعے موزوں کیے ع

دونوں کی مختصر سی تعریف یہ ہے
درویش پرست ایک۔ اک ہے درویش

مدارالمہام سر وقارالامرأ ایک شاہانہ مزاج کے آدمی تھے۔ نہایت فیاض اور سخاوت میں اپنے والد ماجد امیر کبیر نواب رشید الدین خاں وقارالامرأ کی وضعداری کے پابند تھے۔ لیکن سر آسمان جاہ کی طرح وہ بھی اس امیرانہ کمزوری کے شکار تھے کہ ان کے مددگار اور ماتحت غور وفکر کیا کریں اور وہ صرف ان کی تجاویز پر منظوریاں عطا کرتے رہیں۔ ہمیشہ وابستگان اور ماتحتین کی رائے کو اہمیت دیا کرتے تھے اور خود کوئی قطعی رائے قایم نہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے پیشرو نواب آسمان جاہ کی طرح اہل غرض عہدہ داروں کے پھندے میں پھنس گئے اور حالات آسمان جاہ کے عہد سے کئی درجہ ابتر بنتے گئے۔ قانونچہ

---

[1] حیدرآباد کے بڑے لوگ از سید غلام پنجتنی ص ۱۴۸

مبارک کے نفاذ کے بعد مدارالمہام کے اختیارات کافی محدود ہو گئے تھے۔ اگر مدارالمہام کی جانب سے اختیارات سے متجاوز کوئی کارروائی انجام دی جاتی تو والی ریاست کی جانب سے نہ صرف سخت اعتراض کیا جاتا بلکہ بعض وقت جواب طلب بھی کیا جاتا تھا۔ یہ کارروائی وقارالامرا جیسے باہمت اور خوددار مدارالمہام کو گراں گزرتی تھی۔

جب وقارالامرا گورنر جنرل وائسرائے ہند سے ملاقات کے لیے شملہ جانے لگے تو انھوں نے سرکار میں معروضہ پیش کیا کہ ان کے غیاب میں کسی منصرم مدارالمہام کے تقرر کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیوں کہ ریاست کے معمولی کاروبار خود عہدہ دار متعلقہ دیکھ لیا کریں گے البتہ ضروری کارروائیوں کو ان کے پاس بھیجا جائے گا۔ نواب میر محبوب علی خاں نے اس معروضہ کو نظرانداز کر کے راجہ کشن پرشاد کو منصرم مدارالمہام مقرر فرمایا۔ نواب وقارالامرا نے کئی منصب و وظائف بلا منظوری سرکار جاری کر دیے۔ جب والی ریاست کو ان منصب و وظائف کی اطلاع ہوئی تو کافی برہم ہوئے وظائف و مناسب کے وہ احکام فوراً منسوخ کر دیے گئے۔ وقارالامرا نے ہرمزجی کے مشورہ اور رزیڈنٹ پلاڈون کی تائید سے یہ اسکیم تیار کی کہ سکہ حالی کا چلن بازار میں کم ہو گیا ہے لہٰذا سرکار عالی کے ریلوے کے حصے جو انگلستان میں بیکار پڑے ہوئے ہیں ان کو بیچ کر کے چاندی خریدی جائے اور سکہ حالی بمبئی ٹکسال میں ڈھالا جائے۔ بعد ازاں یہ سکے حیدرآباد کے بازار میں چلائے جائیں[1]۔ وقارالامرا نے اس اسکیم کی اطلاع نہ تو والی ریاست کو دی اور نہ سرکار سے کوئی اجازت حاصل کی۔ اس کے برعکس مسٹر کرائے صدر محاسب خزانہ عامرہ کو کلکتہ روانہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تاکہ گورنر جنرل وائسرائے ہند کے فینانشل ممبر سے مشورہ اور اجازت حاصل کر کے اسکیم پر عمل شروع ہو جائے۔ حضور نظام نواب میر محبوب علی خاں کو جب اس اسکیم کا علم ہوا تو راست مسٹر کائے کرائے کو احکام دے گئے کہ "وہ اگر ریلوے اسٹیشن کی جانب رخ کریں گے تو خود کو اپنی خدمت سے سبکدوش خیال کریں۔"[2] یہ راست

---

[1] کارنامہ سرداری ص ۲۴۶

[2] " " " ص ۲۴۶

حکم بلا توسط مدار المہام جاری کیا گیا تھا اس لیے مدار المہام اور رزیڈنٹ نے اس کارروائی کو اپنی سخت توہین قرار دیا۔

نواب سروقار الامرأ آصفی خاندان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ وہ نواب سکندر جاہ کے پوتے اور نواب میر محبوب علی خاں کے برادر نسبتی تھے لیکن نواب محبوب علی خاں سروقار الامرأ کی "انگریز دوست" پالیسی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ محض رزیڈنٹ اور گورنر جنرل کی خاص سعی وسفارش سے انھیں مدار المہام بنایا گیا تھا۔ لیکن بہت جلد اکبر الملک کوتوال جن کو قرب شاہی حاصل ہو گیا تھا۔ نواب وقار الامرأ کے سخت مخالف ہو گئے اور ان کے خلاف پیشی مبارک میں ریشہ دوانی کرنے لگے۔ راجہ کشن پرشاد اور نواب مدار المہام میں بھی تعلقات کشیدہ ہو گئے سرچپلی پلاڈون رزیڈنٹ نواب وقار الامرأ کے قریبی دوستوں میں سے تھے اس لیے ان کے زمانہ میں رزیڈنسی میں تبدیلی مدار المہامی کا مسئلہ زیر غور نہ آسکا۔ جب لارڈ کرزن وائسرائے ہند بنے تو رزیڈنٹ سرپلاڈون رخصت قبل از وظیفہ لے کر انگلستان چلے گئے اور ان کی جگہ سر ڈیوڈ بار نئے رزیڈنٹ بنائے گئے۔ اب رزیڈنسی میں مدار المہام کا کوئی حامی و مددگار نہ رہا۔ اس زمانہ میں دیسی ریاستوں کے تعلق سے انگریز پالیسی یہ تھی کہ تبدیلی رزیڈنٹ کے بعد اگر والی ریاست کو اپنے مدار المہام کی تبدیلی پر اصرار ہو تو اس سے اتفاق کر لیا جائے۔ اتفاق سے نئے رزیڈنٹ سر ڈیوڈ بار اور کوتوال حیدرآباد اکبر الملک قریبی دوست تھے اور یہ دوستی جنگ سندھ میں دونوں کی شرکت سے کافی مستحکم بن چکی تھی۔[1] اکبر الملک نے وقار الامرأ کے خلاف والی ریاست کی رائے سے نئے رزیڈنٹ کو واقف کیا اور انھیں مدار المہام کی علاحدگی کے لیے ہموار لیا۔ اس طرح خود اکبر الملک کا اثر ورسوخ حیدرآباد میں بڑھ گیا۔[2]

مہاراجہ سرکشن پرشاد کی مدار المہامی

مدار المہام کی تبدیلی سے پہلے حیدرآباد کے چند عہدہ دار وظیفہ پر علاحدہ

ع1 مہاراجہ کشن پرشاد ص171

ع2 " " " "

کر دیے گئے۔ یا پھر ان کا ریاست سے اخراج عمل میں آیا۔ جن عہدہ داروں کا اخراج عمل میں آیا۔ ان میں سید علی حسن ناظم بندوبست حسن بن عبداللہ۔ عماد نواز جنگ کمشنر کروڑگیری راجہ سری نواس راؤ مہتمم خزانہ عامرہ قابل ذکر ہیں[1] اس کارروائی کے بعد والی ریاست نے راجہ کشن پرشاد کے تقرر مدارالمہامی کا فیصلہ کر لیا اور رزیڈنٹ کو اپنے ارادوں سے مطلع کر دیا۔ لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے منظوری کے بعد نواب میر محبوب علی خاں نے قدیم رواج کے مطابق نواب ناصر نوازالدولہ کو وقارالامرأ کے پاس روانہ کیا[2] وقارالامرأ نے ناسازی مزاج کی بنا پر چھ ماہ کی رخصت کی درخواست پیش کر دی جو اس زمانہ میں مدارالمہامی سے سبکدوشی کا طریقہ تھا۔ سر وقارالامرأ نے دیوانی کی مہر خاص بھی واپس کر دی[3]

یہ ایک حقیقت ہے کہ نواب مختارالملک سر سالار جنگ اول کے انتقال کے بعد کئی امرأ مسند وزارت پر فائز ہوئے لیکن یہ مدارالمہام بہت جلد یا تو رزیڈنسی کی ناراضگی کی بنا پر یا پھر درباری سازشوں کی بنا پر عہدہ وزارت سے سبکدوش ہو گئے۔ ایک عرصہ کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد مدارالمہام بنائے گئے اور وہ صحیح معنوں میں نواب سر سالار جنگ کے جانشیں ثابت ہوئے۔ مہاراجہ نے ایک طویل زندگی پائی جس کا پھیلاؤ اسی سال سے کم نہ تھا۔ ان کی زندگی کا ابتدائی حصہ تعلیم و تربیت کی نذر ہوا کچھ زمانہ پیشکاری اور وزیر افواج آصفیہ کی حیثیت سے گزرا پھر وہ مدارالمہام دولت آصفیہ مقرر ہوئے۔ مدارالمہامی سے سبکدوشی کے بعد خانہ نشینی کی زندگی گزاری پھر صدر اعظم مقرر ہوئے اور سبکدوشی کے بعد باقی زندگی ہمہ گیر مصروفیات

۱۔ مہاراجہ کشن پرشاد ص ۱۴۰

۲۔ " " " ص ۱۴۱

۳۔ " " " "

دیگر تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مضمون مہاراجہ سر کشن پرشاد اخبار سیاست ۱۱ ستمبر ۸۰ء

" " " " حیدرآباد کے بڑے لوگ ص ۱۲۳

" " " " مجلہ عثمانیہ "مہاراجہ نمبر"

میں گزار دیا۔ وہ حیدرآبادی وضعداری شرافت اور مروت کا بہترین نمونہ تھے۔ نواب مہدی نواز جنگ سابق گورنر گجرات کے الفاظ میں" وہ ایک اچھے امیر سچے انسان، مفلسوں کے ہمدرد، یتیموں کے مربی۔ وضعداری میں یکتا۔ مروت میں یگانہ۔ بڑے پائے کے سخی اور پریمی تھے "۔ حیدرآباد کے ایک بزرگ قانون داں راجہ بہادر آرمدو آینگار کے الفاظ میں وہ اپنے زمانہ کے" اجات شترو تھے" یعنی وہ انسان جس کا کوئی دشمن نہ ہو۔

مدارالمہام کا سکریٹریٹ

مہاراجہ کشن پرشاد کی مدارالمہامی سے قبل، حیدرآباد میں رواج تھا کہ سابق مدارالمہام کا دفتر پیشی ان کی سبکدوشی کے بعد بھی مدارالمہام کی ڈیوڑھی پر رہا کرتا تھا اور جدید مدارالمہام بغیر اس دفتر کے کام چلاتے۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ اہم کاغذات یا تو دستیاب نہ ہوتے یا پھر گم ہو جاتے تھے مگر اس دشواری کو عموماً مروتاً اور اخلاقاً گوارا کر لیا جاتا تھا[1]۔ میر عالم، منیرالملک، سراج الملک، مختارالملک اور عمادالسلطنت کے دفتر مدارالمہامی بہ وجہ قرابت ایک جگہ محفوظ تھے۔ راجہ چندو لعل مہاراجہ نریندر پرشاد کا دفتر پیشی ان کی ڈیوڑھی میں رہا۔ اسی طرح سر آسمان جاہ اور وقارالامرأ کا دفتر ان کے پاس رہا۔ سابق مدارالمہام کی پیشی کا اہلکار، جدید مدارالمہام کے تقرر کے بعد سبکدوش ہو جاتا یا پھر کسی تحت کے محکمہ میں منتقل کر دیا جاتا معتمد پیشی کے عہدہ کا کوئی تقرر نہ ہوتا تھا بلکہ مدارالمہام اپنے کسی با اعتماد مددگار کو یہ کام سپرد کیا کرتے تھے۔

مہاراجہ کے تقرر کے وقت والی ریاست نے انھیں ہدایت کی تھی کہ لوازمہ عہدہ مدارالمہام پر زیادہ صرفہ نہ کریں گے اور سکریٹریٹ سروس فنڈ قایم کیا جائے۔ مہاراجہ نے اولاً مولوی محمد علی کو اپنا معتمد پیشی مقرر کیا[2] جو اُن کے پاس نظم جمعیت کے ناظم کی حیثیت سے کارپرداز تھے۔ اے۔ ڈی۔ سی کی خدمت پر

ع[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص۱۴۱

ع[2] " " " ص۱۴۲

میجر وزیر یاور الدولہ[1] اور کپتان پریم سنگھ مقرر کیے گئے۔ دفتر پیشی کا زائد کام اختر یار جنگ مینائی[2] سے لیا جاتا تھا۔ نواب فریدون الملک ضروری مسئلہ کی یاد دہانی کے لیے معتمد پیشی محمد علی صاحب کے پاس آیا کرتے تھے اور ضروری کارروائیوں میں محمد علی صاحب نواب فریدون الملک سے خاص نوٹ لکھوایا کرتے تھے[3] اپنے عملہ کے افراد کو مہاراجہ دیگر عہدوں پر ترقی دے کر بھیجنے کے قائل نہیں تھے مہاراجہ کے دور وزارت سے قبل معین المہام اپنی رائے یا تجویز علاحدہ کاغذ پر لکھا کرتے تھے لیکن مہاراجہ نے یہ طریقہ ختم کر دیا اور معین المہام کی تجویز یا رائے مثل ہی پر تحریر کی جاتی تھی۔ اس طریقہ سے معتمدین اور نظمائے کی من مانی کارروائیوں پر نظر رکھی جاتی تھی۔ مہاراجہ محکمہ فینانسی کی حد تک زیادہ دخل نہیں دیا کرتے تھے۔

مدار المہامی کی خدمت کا جائزہ لینے کے بعد شمس العلماء مولوی علی بلگرامی کو وظیفہ دے دیا گیا اور وہ انگلستان میں کئی سال مقیم رہے سید علی بلگرامی کی علاحدگی اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ وہ سابق مدار المہام نواب وقار الامراء کے قریبی آدمی تھے اور کوتوال شہر اکبر الملک ان کو سخت ناپسند کرتے تھے[4]

سید علی بلگرامی کی طرح فریدون ملک بھی اکبر الملک کی ناراضگی کی بناء پر سبکدوش کر دیے گئے۔ لیکن بہت جلد رزیڈنسی کی مداخلت یا سفارش کی بناء پر وہ پھر ملازمت میں آگئے[5] مہاراجہ سے ان کے تعلقات بہتر ہوتے گئے اور بہت جلد وہ مہاراجہ کے ایک بااثر مشیر بن گئے۔ فریدون الملک جہاں تک ممکن ہوتا ضابطہ، سہولت اور مصلحت کی بناء پر کارروائیوں کے طے کرنے کے قابل تھے۔ وہ ایک جانب نواب میر محبوب علی خاں، والی ریاست کے منشا کو

ع1 مہاراجہ کشن پرشاد ص142

ع2 " " " "

ع3 " " " ص143

ع4 " " " ص146

ع5 " " " "

ملحوظ رکھتے تو دوسری جانب حکومت ہند اور رزیڈنسی کا خیال بھی رکھتے تھے[۱]

وقارالامرا کے دور وزارت میں جو مجلس مالگزاری قایم کی گئی تھی وہ اعظم یار جنگ معتمد فینانس کے انتقال کے بعد برخواست کردی گئی اور مجلس مالگزاری کے اراکین نواب معتمد جنگ اور رائے مرلی دھر صوبہ داری میدک اور ورنگل پر بھیج دیے گئے[۲]

صوبہ دار میدک نواب یار والدولہ جو نواب وقارالامرا کے سمدھی تھے اور خود ایک بڑے جاگیردار تھے۔ صوبہ داری کی خدمت سے وظیفہ پر سبکدوش کر دیے گئے[۳]۔ سید امیر حسین منصرم صوبہ دار ورنگل تعلقہ داری پر واپس کر دیے گئے۔ مالگزاری اور کوتوالی اضلاع کے محکمے انگریز عہدہ داروں کے تحت رہا کرتے تھے۔ اس لیے مہاراجہ کی مدارالمہامی میں ان محکموں کو انگریز افسروں کی نگرانی میں رکھا گیا۔ مہاراجہ کی مدارالمہامی کے وقت نواب عماد جنگ اول معتمد فینانس اور مہاراج آصف نواز ونت صدر محاسب تھے۔ جب ریاست کی مالی حالت وقارالامرا کی وزارت کے زمانہ میں بہت گر چکی تو وائسرائے لارڈ کرزن کی سفارش پر پنجاب سیول سروس کے ایک تجربہ کار عہدہ دار مسٹر جی۔ سی واکر کا معتمدی فینانس پر تقرر کیا گیا[۴]۔ بعد میں لارڈ کرزن کے مشورہ سے مسٹر واکر معین المہام فینانس بنائے گئے۔ لیکن یہ بھی وضاحت کی گئی کہ ان کا تقرر محض تین سال کے لیے ہوا ہے اور وہ رکن کیبنٹ کونسل نہیں ہوں گے[۵]۔ تین سال تک کارگزار رہنے کے بعد سر جارج واکر نے آیندہ ملازمت میں رہنے کے لیے یہ شرط پیش کی کہ اکبر حیدری صاحب صدر محاسب بنائے جائیں اور مہاراج آصف نواز ونت جو اس عہدہ پر فائز تھے سبکدوش کر دیے جائیں۔ اس درخواست کو نواب میر محبوب علی خاں نے منظور فرمایا۔ اس

---

۱ مہاراجہ کشن پرشاد ص ۱۴۶

۲ " " " "

" " " "

" " " ص ۱۴۸

" " " "

طرح اکبر حیدری صاحب کو ملازمت کا موقع حاصل ہوا اور وہ آیندہ ۲۵ سال تک حیدرآباد میں اہم ترین خدمات انجام دیتے رہے۔ سنہ ۱۳۲۰ ف میں سر جارج کیسن واکر وظیفہ پر چلے گئے اور رزیڈنسی کی سفارش پر حیدری صاحب کو نظر انداز کر کے سر ریجینالڈ گلاسی کو معین المہام بنا یا گیا^۱ سر جارج واکر ایک ھندی انگریز عہدہ دار تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی ایک نظم واکر نامہ کے عنوان سے ۱۹۰۹ء میں "پیسہ" اخبار لاہور میں شائع ہوئی۔ اس ہنگامہ خیز نظم کے بعض اشعار نے حیدرآباد کے سیاسی حلقوں میں اُن دنوں کھلبلی سی ڈال دی تھی۔ اِس نظم کے شائع ہونے پر "پیسہ اخبار" کا پرچہ نایاب ہوگیا اور لوگوں کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔ یہ نظم دوسری مرتبہ ۱۳/ اگست ۱۹۰۹ء اور ۹/ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو "پیسہ اخبار" لاہور میں شائع ہوئی۔ اس نظم کا انعام مولانا ظفر علی خاں کو حیدرآباد دکن سے اخراج کی صورت میں ملا اور تقریباً تیرہ سال حیدرآباد میں رہنے کے بعد اچانک حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور کیے گئے۔ ذیل میں اُن کی وہ مشہور نظم درج کی جاتی ہے۔ یہ نظم "ابو نواس" کے فرضی نام سے شائع کی گئی تھی۔

پڑی پھرتی ہے ننگے سر نظام الملک کی دولت
نہ بنگالی سے گھبرا اور نہ مدراسی کی پروا کر
مگر سجدے میں جھٹ گر جا نظر آجائے جب واکر
عنانِ اختیار اِس ملک کی ہے اِس کے ہاتھوں میں
حکومت کر رہا ہے باہزاراں کر و فر واکر
پڑی پھرتی ہے ننگے سر نظام الملک کی دولت
اک اینگلو انڈین کے ہاتھ سے چادر اتر واکر
نہیں ہے اک فقط روح القدس ہی مہرباں اس پر
اقالیم ثلاثہ کا ہے منظورِ نظر واکر
تعلق صدر اعظم کا ہے واکر سے فقط اتنا
دعا ہیں سر کشن پرشاد اور اِس کا اثر واکر

۱۔ مہاراجہ کشن پرشاد ص ۱۵۱

جناب افتخار الملک پگڑی تھام یں اپنی
کہ ہے صولت کی کرسی پر بہ سطوت جلوہ گر واکر
نہیں ہے اس کے آگے کوئی فخر الملک کی ہستی
دکن میں ہے منیب نایب کنگ امپرر واکر
کہاں کے خانخاناں اور کہاں کی لشکر آرائی
چھپی اٹے نہتا بھی نکل آئے بدھر واکر
نہیں اس قول میں کچھ شک قطب از جا نمی جنبید
قیامت ٹل بھی جائے ٹل نہیں سکتا مگر واکر
قیامت تک نہ ہوگی ختم توسیع اس کی مدت کی
رہے گا حیدر آباد دکن میں عمر بھر واکر
ہیں جتنے معتمد خصی ہوئے سب تیرے ہاتھوں سے
رہے گا تیری جراحی کا سہرا تیرے سر واکر
دبک جاتے ہیں مسٹر حیدری مانند گیدڑ کے
گرجتا اور بھپرتا جب ہے مثل شیر نر واکر
بھلا نکلے تو کیوں کر کام ہم سے بے سہاروں کا
ادھر رکھے ہوئے ہیں حیدری گر تو اُدھر واکر
نہ یزداں سے ارادت ہے نہ اہرمن کا اندیشہ
فریدوں جنگ کو ہے مظہر خبر دار اثر واکر
سراج خستہ خاں کو پڑ رہے ہیں جان کے لالے
کہاں تک دیکھے کرتا ہے اُن سے درگزر واکر
یہ کہہ دو ماہد الدولہ سے تم تو نشر عادی ہو
پلوں میں کر دیا ہے نظم کو زیر و زبر واکر
یہ افسر جنگ فرمائیں کہ کیا کر لوگے تم اس کا
سپہ سالار بیٹے کو کرا دے کل اگر واکر
بہت خوش شیخ جی ڈنلاپ کی کرسی پہ بیٹھے ہیں

شکن ڈالے ہوئے بیٹھا ہے رُبڑ پر مگر واکر
حمید اللہ خاں کا جانشیں ہوگا کوئی دلبر
رہے گا واکر اک دن چیف جسٹس اِس کو کر واکر
اکڑتے اینڈتے پھرتے ہیں تعلیمات کے ناظم
نگلنے پر انھیں دیتا ہے کب یہ لقمہ تر واکر
عزیز مرزا صاحب باایں تدبیر و ایں دانش
اٹھا سکتے نہیں ہیں تیرے آگے اپنا سر واکر
تعلق ہو تو ایسا ہو پھٹی ہیں کان تک باچھیں
کسی کے کنج لب کا بن گیا ہے پردہ در واکر
تو مر کے پائے چھ سو جوتیاں چٹخارہا ہے تو
خدائی شان دیکھ اور دیدۂ عبرت نظر واکر
بے چارے دیسیوں سے لے کے عہدہ ذمہ داری کے
دیا ہے تو نے ہر صیغے میں انگریزوں کو بھر واکر
کیے ہیں تو نے اگر ایسے ایسے محکمے قایم
فقط انگریز جن سے ہو رہے ہیں بہرہ ور واکر
کوئی دیسی نہ پائے گا زیادہ پانچ چھ سو سے
تری یہ پالسی قایم رہی کچھ دن اگر واکر
وہ دارالضرب جب آیا تو بولی روح جعفر کی
بہ دکھن سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر واکر
تری ہر بات ہم سب کے لیے انجیل کی آیت
ہماری بات ہے تیرے لیے گوز شتر واکر
ہماری مشکلیں آسان ہوتیں لارڈ منٹو کو
تیرے اِن کارناموں کی اگر ہوتی خبر واکر
نہیں ڈرتا جو منٹو سے نہ ڈر تو جانے وہ جانے
مگر ہم بیکسوں کی آہ سوزاں سے تو ڈر واکر

ذرا تو رحم کر ہم بے کسوں کی خستہ حالی پر
تجھے بھی ایک دن کرنا ہے عقبیٰ کا سفر واکر
نظام الملک آصف جاہ لیں گر کام قوت سے
تو آئے دوسرے ہی روز لندن میں نظر واکر

منقول از " واکر نامہ " مضمون از ڈاکٹر سید نظیر حسین
زیدی۔ شائع شدہ اخبار سیاست مورخہ ۱۲ر جولائی
۱۹۸۱ء

مضمون واکر نامہ از جناب حسن الدین احمد شائع
شدہ اخبار سیاست مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۷۱ء

مہاراجہ کی مدارالمہامی کے دور میں حیدرآباد قحط کی مصیبت سے بچا رہا۔ البتہ دو مرتبہ طغیانی رود موسیٰ کی وجہ سے دارالحکومت حیدرآباد کو شدید نقصان پہنچا اور جان و مال کے شدید نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ان کے آخر دور مدارالمہامی میں طاعون کی وبا شہر میں پھیل گئی تھی ابتدائے دور مدارالمہامی میں نواب وقارالامرا اور نواب خورشید جاہ کا انتقال ہو گیا اور پائیگاہ شمس الملک اور سلطان الملک نگرانی میں رہے۔ شمس الملک کے انتقال کے بعد نواب لطف الدولہ خورشید جاہی پائیگاہ کے امیر بنے سلطان الملک دماغی علالت کی بنا پر ان کو بغرض علاج انگلستان روانہ کیا گیا اور ان کی والدہ جہاندار النساء بیگم ان کی نگراں رہیں۔ ان پائیگاہوں کی وہ عظمت باقی نہ رہی تھی۔ عمادالسلطنۃ کی وفات کے بعد اور نواب یوسف علی خاں کی کمسنی کی وجہ سے دیوان دیوڑھی کی اہمیت ختم ہو چکی تھی غرض حیدرآبادی امراء کے روایات اور اعزاز متاثر ہونے لگے۔

ہائیکورٹ کے قیام کی جدید اسکیم مہاراجہ کے اس دور وزارت میں آگے نہ بڑھ سکی اور صرف چند منصفیاں بڑھائی گئیں۔ اضلاع میں عدالتوں کے لیے نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ قانون تعزیرات آصفیہ ضابطہ دیوانی قانون فوجداری اور قانون شہادت نافذ کیے گئے۔

جامعہ کے قیام کے لیے کاغذی تیاری کا آغاز

جامعہ پنجاب نے حیدرآباد میں عربی اور فارسی کے امتحانات یونیورسٹی کمیشن کے تصفیہ کی بنا پر ختم کر دیے اور حکومت نے ایک منصوبہ بنایا کہ خود حیدرآباد میں ایک جامعہ قایم کی جائے۔ اس منصوبہ کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لیے مولانا شبلی حیدرآباد طلب کیے گئے۔ اور مولوی عبدالحکیم مددگار ناظم مقرر کیے گئے۔ بالآخر تجاویز مرتب کی گئیں اور ایک ماہرین تعلیمی کمیٹی نے جس کے صدر نشیں فخرالملک تھے ان تجاویز کا مطالعہ کیا اور کئی ترمیمات کے ساتھ اس کو منظور کیا[1]۔ لیکن جامعہ عثمانیہ کا قیام ابھی دور کی بات تھی البتہ جامعہ کے قیام کے لیے کاغذی کارروائی مہاراجہ کے دور مدارالمہامی میں شروع کر دی گئی۔

مہاراجہ کی مدارالمہامی کے دوسرے ہی سال لارڈ کرزن حیدرآباد آئے مہاراجہ کو مراسم سرکاری میں مدارالمہام اور سفیر امیر سلطنت کی حیثیت سے حصّہ لینا پڑا۔ برار اور تخفیف فوج کا معاہدہ ہوا۔ لارڈ کرزن کی واپسی کے بعد دہلی دربار میں شرکت کے لیے میر محبوب علی خاں مع ولی عہد اور مہاراجہ دہلی روانہ ہوئے۔ اعلیٰ حضرت کے اعزاز کو قایم رکھنے کے لیے مہاراجہ کو کئی اہم کام کرنے پڑے۔ میر محبوب علی خاں اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ دوسرے والیان ریاست کی طرح وائسرائے ہند کے سامنے پیش ہوں[2]۔ وہ اس بات کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ ولی عہد حیدرآباد نواب میر عثمان علی خاں حیدرآباد کی افواج کی کمان کرتے ہوئے وائسرائے کے سامنے سے گزریں[3]۔ لیکن انگریز حکومت کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ وہ بادل نخواستہ ان کارروائیوں کو انجام دینے کے لیے مجبور تھے۔ دہلی دربار سے واپسی کے بعد ۱۹۰۳ء میں حیدرآباد میں اعلیٰ حضرت کے استقبال کے لیے مہاراجہ نے

ع۱ مہاراجہ کشن پرشاد ص۱۷۳

ع۲ 〃 〃 〃 ص۱۷۷

ع۳ 〃 〃 〃 〃

شاندار انتظامات کیے۔ حیدرآباد کو بڑے سلیقہ کے ساتھ آراستہ کیا گیا اور ہر طرف چراغاں کیے گئے۔ تاکہ اعلیٰ حضرت کی ہردل عزیزی اور عوام سے محبت کی اطلاع اس طرح وائسرائے تک پہنچ سکے۔ ایک غیر مقامی پبلک جلسہ میں مہاراجہ نے سپاس نامہ پڑھا سنہ ۱۳۲۲ف میں میر محبوب علی خاں کے پچیس سالہ جوبلی منائی گئی۔[1] نواب میر محبوب علی خاں انتہائی محبت اور رعایا نوازی کے خیال سے اس تقریب میں بہ نفس نفیس شرکت فرماتے تھے۔ اس موقع پر مہاراجہ کو کئی تحائف اور خلعت عطا کی گئیں۔

جشن جوبلی کے بعد پرنس آف ویلز (جارج پنجم) اپنی اہلیہ شہزادی میری کے ساتھ ہندوستان کے دیگر علاقوں کی سیاحت کے سلسلہ میں حیدرآباد تشریف لائے اس موقع پر کئی سرکاری تقاریب منعقد کی گئیں۔ جس دن پرنس آف ویلز نے وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل کا افتتاح کیا اسی دن میر محبوب علی خاں کی صاحبزادی نظام النساء بیگم نے انتقال کیا۔[2] یہ افسوس ناک اطلاع والی ریاست کو اس وقت ہوئی جب کہ وہ پرنس آف ویلز کے ساتھ پریڈ ملاحظہ فرما رہے تھے۔ اس افسوس ناک واقعہ کے بعد شاہی ضیافت اور دیگر تقاریب منسوخ کردی گئیں اس دورہ کے کچھ دن بعد حیدرآباد میں موٹر کی سواری کا رواج شروع ہوا نواب میر محبوب علی خاں نے اس نئی سواری کو پسند فرمایا اور اس کے بعد بتدریج چوکڑے کا استعمال موقوف ہوگیا اور موٹر کی سادہ سواری کا استعمال بڑھ گیا۔[3]

طغیانی ۱۹۰۸ء

مہاراجہ کشن پرشاد کی مدارالمہام کے آخری زمانہ میں اور والی ریاست نواب میر محبوب علی خاں کے انتقال سے تین سال پیشتر حیدرآباد کو سنہ

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص۱۷۷

[2] " " " ص۱۷۸

[3] " " " ص۱۷۸

۱۹۰۸ء کی تباہ کن عظیم طغیانی کا سامنا کرنا پڑا۔

سہ شنبہ ۲۸- ستمبر ۱۹۰۸ء کی طغیانی اچانک اور غیر متوقعہ طور پر نازل ہوئی طغیانی سے ایک ہفتہ پہلے موسم معمول کے مطابق تھا۔ یکم جون تک بارش معمول سے بہت کم ہوئی تھی۔ ہفتہ کی دوپہر تک کہیں کہیں کچھ کچھ بارش ہوتی رہی البتہ چار بجے شام سے زوردار بارش ہوئی جس کا سلسلہ شام میں ساڑھے چھ بجے تک جاری رہا۔ رات میں ساڑھے گیارہ بجے سے اتوار کی صبح تک طوفانی بارش ہوئی اتوار کے دن کبھی شدید اور کبھی معمول بارش کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن رات میں اس قدر بارش ہوئی کہ جیسے بادل ہمیشہ کے لیے پھٹ پڑا ہو۔ اس قسم کی شدید بارش لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس مسلسل بارش سے کئی چھوٹے تالابوں کے پشتے ٹوٹ گئے اور شہر میں زبردست طغیانی آگئی۔ سہ شنبہ ۲۸- ستمبر ۱۹۰۸ء کو چوبیس گھنٹوں میں ۱۲.۸۰ انچ بارش ریکارڈ کی گئی۔

طغیانی سے متعلق ایک رپورٹ[1] کے بموجب ۲۷- ستمبر بروز اتوار صبح چھ بجے تک ندی میں ۴ فٹ کی سطح پر پانی بہ رہا تھا۔ دس بجے شب پانی کی سطح ۱۰ فٹ تک پہنچ گئی۔

بارہ بجے پانی کا بہاؤ موسیٰ ندی کے کناروں کو چھوڑ رہا تھا اور کولسہ واڑی کے علاقہ میں پانی کا رخ مڑ گیا۔ زیر آب علاقہ میں آہستہ آہستہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔

دوشنبہ ۲۷- ستمبر ۱۹۰۸ء کو دو بجے طغیانی کا پانی پرانے پل کے اوپر سے بہہ رہا تھا اور تین بجے پرانے پل کی فصیل جو شمشان گھاٹ کے مقابل واقع تھی پانی کے بہاؤ کو روک نہ سکی۔ پانی شہر کی جانب فی گھنٹہ ۴ فٹ کی رفتار سے بڑھ رہا تھا۔ سہ شنبہ ۲۸- ستمبر کو صبح چھ بجے ندی کا پانی افضل پل (نیا پل) کی کمان کے برابر آچکا تھا۔ کولسہ واڑی میں پانی کی گہرائی دس فٹ تک پہنچ چکی تھی۔ سات بجے پانی ندی کے دونوں کناروں کو پار کر کے نئے اور پرانے شہر کو اپنی گرفت میں لے لیا نو بجے ندی کے

An Engineering Wizard of India, by Dildar Hussain

[1] دبستان آصفیہ جلد دوم ص۸۰۸ تا ص۸۲۳

تمام پل زیر آب ہو گئے۔ دس بجے املی بن کا علاقہ مکمل طور پر زیر آب آچکا تھا۔ گیارہ بجے تک قدیم و جدید شہروں کا تین چوتھائی حصہ زیر آب آگیا تھا۔ ندی میں پانی کی گہرائی ۳۸ تا ۴۸ فٹ تھی۔ افضل پل (نیا پل) کا وہ حصہ جہاں اب عثمانیہ ہاسپٹل ابس اسٹینڈ اور رکنگ کمپنی واقع ہیں پانی سے لبالب بھر گیا تھا اور ایک چھوٹا سا سمندر معلوم ہو رہا تھا۔ اس جانب کا پل مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک طغیانی کی شدت بڑھ گئی اور ہر طرف تباہی، موت اور دہشت رقصاں تھی۔ گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر افضل پل کے پاس پانی کی سطح میں کمی محسوس کی گئی۔ پھر ہر پندرہ منٹ پر ایک فٹ پانی کی کمی ہوئی اور پانی کی سطح ندی کے کناروں کے برابر آگئی۔ ۸ بجے شام تک پانی کی سطح معمول پر آگئی۔ اس طوفانی بارش سے سنگ بستہ قدیم فصیل اور پل بہہ گئے اور فلک بوس مکانات تاش کے پتوں کی طرح آن واحد میں بہہ گئے۔ لوگوں کو سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع تک نہ ملا۔ شہر کے چار پلوں میں سب سے زیادہ افضل پل کو نقصان پہنچا۔ محلہ کولسہ واری میں دو ہزار افراد پانی میں محصور ہو گئے جو یا تو پانی میں ڈوب گئے یا پھر تیز رو کے ساتھ بہہ گئے۔ گھانس بازار کے محلے میں بھی تقریباً اسی قدر اشخاص کا یہی حشر ہوا۔ کوئی تین ہزار افراد گوشہ محل کی فصیل پر چڑھ گئے تھے تاکہ طغیانی کا نظارہ کر سکیں لیکن وہ بھی طغیانی کے نذر ہو گئے۔ کولسہ واڑی میں ایک گھنے جھاڑ پر تقریباً پچاس ہزار افراد پناہ لینے کے لیے چڑھ گئے تھے۔ یہ درخت تیز رو بہاؤ کا مقابلہ نہ کر سکا اور سب لوگ جھاڑ کے ساتھ بہتے چلے گئے۔ سہ شنبہ کو پانی کی انتہائی سطح وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل کی چھت سے دو فٹ اونچی تھی اور اس سے طغیانی کی تباہی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اموات زیادہ تر مکانات کے انہدام اور بہہ جانے سے ہوئیں۔ وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل کے تمام مریض قبل از قبل محفوظ مقامات پر منتقل کر دیے گئے اور وہ محفوظ رہے۔

ندی کے اترنے کے بعد موت اور تباہی کے دردناک آثار دیکھے نہ جاتے تھے کئی مسخ شدہ نعشیں ملبہ میں دبی ہوئی تھیں۔ کچھ کیچڑ میں آدھی دھنسی ہوئی تھیں۔ ندی کے قریب کے مکانات تقریباً بہہ گئے تھے اور جو کچھ دور تھے وہ مکمل طور پر تباہ ہو گئے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق آبادی کا ایک مربع میل علاقہ ندی

کے جانب شمال اور نصف مربع میل علاقہ جانب جنوب طغیانی کی تباہی سے مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ انیس ہزار مکانات منہدم اور تقریباً اسی ہزار افراد بے گھر ہو گئے۔ تین کروڑ روپے کا مال واسباب برباد ہو گیا۔ جانی نقصان کا اندازہ دس ہزار تا پندرہ ہزار کا تھا۔ جو لوگ موت سے بچ گئے تھے ان کے لیے زندہ رہنا بھی مشکل تھا۔ دہشت کا یہ عالم تھا کہ ۲۹۔ستمبر کو کسی نے یہ افواہ اڑادی کہ میر عالم تالاب ٹوٹ گیا ہے۔ لوگ اپنا مال واسباب بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر کچھ تو قلعہ گولکنڈہ کی طرف اور کچھ برہنہ صاحب کے درگاہ کی طرف بھاگنے لگے۔ اس حادثے سے متاثر ہو کر اردو اور تلگو کے شعراء نے کئی نظم اور گیت لکھے اور لوگ ان گیتوں کو ایک عرصہ تک گایا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۸ء کی طغیانی کی تباہ کاریوں سے متعلق کئی خوفناک واقعات قصہ اور کہانیوں کی طرح سینہ بہ سینہ عرصہ تک دہرائی جاتی رہیں۔ حیدرآباد کے ممتاز رباعی گو صوفی شاعر حضرت امجد حیدرآبادی کا مختصر مکان موسیٰ ندی کے کنارے واقع تھا۔ طغیانی میں مکان اور اہل خاندان بہہ گئے اور صرف حضرت امجد کسی نہ کسی طرح باقی رہ گئے۔ امجد کے کئی اشعار میں طغیانی کی تباہی کا ذکر ہے مثلاً

شب بھر رہے فوارے میں فوارے کے مانند
ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند

....

غم سے بھر آئی آنکھ بہنے لگے اشک
ضبط الم نے آنکھ کو ساغر بنا دیا
سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا
غرقاب محیط غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں کبھی نہ ڈوبا امجد
غیرت والے کو ایک چلو بس تھا
بہہ گیا تھا جو رود موسیٰ میں
وہی خانہ خراب ہے امجد

طغیانی کے بعد ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا۔ کمیشن کی صدارت پر سر جارج واکر حکومت ہند کے انسپکٹر جنرل آبپاشی سر مائکل تیتر سول کو مقرر کرانا چاہتے تھے لیکن نواب علی نواز جنگ اس تحریک کے حامی نہیں تھے اور آخر کار سر وشیشور ایا، کمیشن کی صدارت پر مقرر ہوئے۔ ایک انگریز عہدہ دار کے مقابل ایک حیدرآبادی عہدہ دار کی یہ پہلی کامیابی تھی۔

نواب میر محبوب علی خاں کے انتقال اور نواب میر عثمان علی خاں کے جلوس سے متعلق جریدہ غیر معمولی کے اجرا میں چند اہم غلطیاں

سنہ ۱۹۱۰ء میں شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں نئے بادشاہ انگلستان جارج پنجم نے اعلان کیا کہ وہ دہلی میں جشن تاج پوشی کے تجدید کریں گے۔ مہاراجہ مدارالمہام نے رسم تاجپوشی میں شرکت کے لیے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں اور اس بات کی کوشش بھی کی کہ برار کا مسئلہ مکرر غور کے لیے پیش کیا جائے۔ والی ریاست کو "ہر مجیسٹی" کے القاب سے مخاطب کیا جائے۔ نواب میر محبوب علی خاں اپنے گذشتہ سفر دہلی سے خوش نہیں تھے۔ ان حالات میں ۱۴۔ رمضان ۱۳۲۹ھ م ۱۹۱۱ء قصر فلک نما میں اچانک انتقال کیا۔ امرأ عظام میں سے دو امیر اس حادثہ کی اطلاع دینے کے لیے کنگ کوٹھی روانہ ہوئے۔ نعش قصر فلک نما سے چومحلہ لائی گئی ایک جانب تجہیز و تکفین کی تیاری شروع ہوئی تو دوسری جانب نئے حکمراں کے جلوس کا اعلان کرنا تھا۔ مہاراجہ کی دیوڑھی میں نواب فریدون جنگ نواب افتخار الملک معین المہام کوتوال سلطان باور جنگ کوتوال شہر بھی آ گئے۔ یہ طے پایا کہ اعلان جلوس کے لیے گورنر جنرل کی اجازت کی ضرورت نہیں[1]۔ جریدہ غیر معمولی کے مسودے مرتب ہوئے اور "حسب الحکم مدارالمہام" نافذ ہوئے[2]۔ رواج کے مطابق چارمینار اور شہر کے ہر دروازے پر ایک حکمراں کے انتقال

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص ۱۷۹

[2] " " " "

اور نئے حکمراں کے جلوس کا اعلان کیا گیا۔ چونکہ یہ تمام کاروائی بڑی عجلت میں کی گئی تھی۔ اس لیے جریدہ غیر معمولی میں شاہی خطابات کے اندراج میں تسامح ہوگیا اور بعد میں جریدہ کی اصلاح میں پیچیدگی پیدا ہوئی[1] اس جریدہ غیر معمولی میں ایک تسامح یہ بھی ہوگیا کہ نواب میر محبوب علی خاں نے حصول اقتدار ریاست کے بعد اپنے طریقہ حکمرانی اور تاج برطانیہ کے ساتھ اپنی پالیسی کا جن بلیغ الفاظ میں تذکرہ فرمایا تھا اب اس کو نظر انداز کر دیا گیا[2]

دربار تعزیت و دربار مسند نشینی

زیارت کے بعد سہ پہر میں حسب رواج قدیم، حویلی منجلی بیگم میں تعزیت کا دربار ہوا۔ دوسرے دن تہذیب محل جو محلہ پیالیس میں جلوس شاہی کا دربار ہوا۔ ان دونوں درباروں کے موقع پر کنگ کوٹھی سے پنج محلہ تک جلوس شاہی کا تمام لوازمات کے ساتھ آمد اور رفت رہی۔ جو کڑے میں نئے حکمراں میر عثمان علی خاں نے مہاراجہ مدار المہام اور نواب افسر الملک کو اپنے ساتھ بیٹھنے کا اعزاز عطا کیا[3]

نواب میر محبوب علی خاں کی ہر دلعزیزی

مرحوم والی ریاست، نواب میر محبوب علی خاں فن شہسوار، نشانہ بازی شمشیر زنی، نیزہ بازی، شاعری اور دیگر فنون میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ ٹینٹ پگنگ میں انھوں نے حیرت انگیز کمال حاصل کیا تھا۔ ایک ہی بھالے میں وہ تین تین میخیں پرولیا کرتے تھے۔ بندوق سے اتنا نازک نشانہ اڑاتے تھے کہ بڑے بڑے نشانہ باز حیران رہ جاتے۔ وہ شیر کا شکار کے بڑے شایق تھے۔ شعرا بھی اکثر شکار میں ساتھ ہوتے تھے اور شیر کے شکار کرنے پر تہنیت، تاریخیں اور قصاید لکھ لکھ کر پیش کرتے

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص۱۷۹

[2] ″ ″ ″ ایضاً

[3] ″ ″ ″ ص۱۸۰

اور انعام واکرام پاتے تھے کہا جاتا ہے کہ نواب میر محبوب علی خاں کا ایک محبوب مشغلہ راتوں کو معمولی لباس میں شہر کی گشت کر کے رعایا کی عام حالت سے واقف ہونا تھا۔ اس خصوص میں کئی دلچسپ واقعات کا آج بھی حیدرآباد کے سن رسیدہ اصحاب بڑے مخصوص انداز میں تذکرہ کیا کرتے ہیں۔ لیکن عموماً بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستان کے لیے۔"

نواب میر محبوب علی خاں کی اردو شاعری

نواب میر محبوب علی خاں اردو کے ایک پرگو شاعر تھے اور استاد داغ دہلوی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ داغ کو ایک ہزار روپے ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ خطابات اور اعزاز بھی عطا ہوئے۔ آپ کے کلام سے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:۔

انداز شوخ شوخ جو ملتے ہیں یار کے
اب ناز دیکھئے کوئی دل بے قرار کے

وعدہ کا انتظار کہاں تک کرے کوئی
ناچار ہم بھی بیٹھ رہے دل کو مار کے

ان کی نشیلی آنکھوں سے ایمان کیا بچے
دشمن یہ دونوں مست ہیں پرہیز گار کے

آصف سے ہم نے پوچھا جو مذہب تو یہ کہا
ہم ہیں غلام پنجتن و چار یار کے

......

وہ بھی کیا دن تھے ہمیں غم سے سروکار نہ تھا
دل کو ارمان نہ تھا جان کو آزار نہ تھا

وہ شب وصل بناوٹ سے بگڑنا اس کا
غصہ تھا قہر تھا اخلاص نہ تھا پیار نہ تھا

دور ہی سے وہ مجھے دیکھ کر فرماتے ہیں

نہ ہوا ہے کبھی ایسوں سے سروکار نہ تھا
لیجئے غیر سے دو دن بھی نبھائی نہ گئی
آپ کے ذہن میں آصف تو وفادار نہ تھا

تذکرہ "معاشرت حیدرآباد" کے مولف جناب ابوظفر موید الدین حسن نے نواب میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد کی غربا پروری کا حال یوں بیان کرتے ہیں:۔

"محبوب علی پاشا کا دسترخوان مشہور تھا جہاں پر تکلف پلاؤ ہر روز غربا کو کھلایا جاتا تھا روک کسی کی نہ تھی جو چاہتا جاتا اور پیٹ بھر کر کھاتا غربا کو کھلانے کا یہ سلسلہ جب شروع ہوتا تو کئی ہفتوں تک جاری رہتا۔"

دیوالی کے موقع پر والی ریاست میر محبوب علی خاں کی شاہی سواری کا جلوس

نواب میر محبوب علی خاں کو اپنی رعایا سے کافی انس تھا اور اسی جذبہ کے تحت وہ اپنی رعایا سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ عیدین اور تہواروں کے موقع پر کسی نہ کسی طرح اپنی رعایا کے درمیان پہنچ جاتے اور ان کی خوشیوں میں اضافہ کیا کرتے تھے۔ دیوالی کے موقع پر سرکار کی سواری اس طرح نکلتی تھی کہ خود بدولت ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار ہوتے اور اطراف خدمت گار شاگرد پیشہ خاصہ بردار، بھالدار، چوبداروں کا ہجوم رہتا۔ اسپ سوار مصاحبین بادشاہ کے اردگرد ہم رکاب رہتے مشعلچی چاندی کے دستے لگے ہوئے مشعل اور چاندی کی خوبصورت اور نازک کپیاں لیے آگے پیچھے تیز تیز چلتے، آگے آگے سیکڑوں عروب خامن پڑھتے ہوئے دف بجاتے ہوئے اور تلوار کے پھیر اکرتب دکھاتے ہوئے بندوقیں ہوا میں سر کرتے ہوئے چلتے تھے۔ دیوالی کی تمام ہماہمی ایک طرف رہ جاتی اور تمام رعایا اپنے محبوب

بادشاہ کے دیدار کے لیے ادھر متوجہ ہو جاتی تھی۔

ایک ایسے ہی موقع پر محبوب علی پاشا چارمینار کے مشرقی کونے کی ایک میٹھائی کی دوکان کے آگے اپنی سواری روک لی۔ حلوائی نے اپنی دوکان کو بڑے سلیقے سے سجا رکھا تھا اور خود بھی موزوں اور مناسب لباس میں اپنی خاندانی پگڑی پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ محبوب علی پاشا نے مسکرا کر کچھ روپے میٹھائی کی دوکان کی طرف پھینک دیے۔ لوگ روپے لوٹنے کے لیے اس دوکان کی طرف بے تحاشہ دوڑ پڑے اور کچھ ہی دیر میں میٹھائی کی دوکان لٹنے لگی۔

حلوائی بے بس اور پریشان تھا۔ بادشاہ مسکرا رہے تھے پھر سواری آگے روانہ ہوگئی۔ دوسرے دن حلوائی کو حویلی میں طلب کیا گیا اور انعام واکرام میں اس قدر رقم دی گئی جو اس کے نقصان سے کئی گنا زیادہ تھی۔

میر محبوب علی خاں کا جشن سالگرہ ایک قومی تہوار

نواب میر محبوب علی خاں کے عہد میں "حکمراں" کا جشن سالگرہ بڑے اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ ان کے دور کے آخری زمانہ میں جشن سالگرہ کچھ اس طرح مقبول ہوا کہ لوگ ان تقاریب کو بطور "قومی عید" منانے لگے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کی جانب سے جشن سالگرہ منایا جاتا۔ ضیافتیں اور ٹی پارٹیز بڑے تکلف اور اہتمام سے دی جاتی تھیں۔ رقص وسرور کی محفلیں منعقد ہوتیں اور روشنی و آتشبازی کا اہتمام ہوتا بچوں کے لیے اسپورٹس کے مقابلے ہوتے اور کامیاب بچوں کو انعام دیے جاتے اجتماعی جلسوں کے لیے ملک پیٹھ کا ریس کورس یا باغ عامہ کو سجایا جاتا۔ بڑے بڑے پنڈال، شامیانے اور دل بادل نصب کیے جاتے اور ان میں خوب آرائش کی جاتی تھی۔ جلسہ گاہ میں میر محبوب علی پاشا گھنٹوں دیر سے رونق افروز ہوا کرتے تھے۔ لیکن تمام امرائے دولت، وزرائے سلطنت، راجگان سمستان، جاگیر دار، منصب دار، عہدہ دار، سیٹھ ساہوکار اور معززین شہر پہروں درباری لباس میں ملبوس بادشاہ کے انتظار میں ٹھہرے رہتے اور ہر دم اپنے مرتبے، درجے اور مقام کا خیال کر کے باادب منتظر رہتے۔ جب سواری

رونق افروز ہوکر شاہی مصلا کرسی پر جلوہ افروز ہوتی تو سب سے پہلے حاضرین کا سلام لیتے پھر اس خاص تقریب کے لیے دکن کے نامی شاعروں سے ان کے قصاید اور نظمیں سماعت فرماتے۔ اڈریس پیش ہوتا اور ان کا مناسب جواب ارشاد ہوتا۔ آخر میں خود بادشاہ کی کہی ہوئی غزل پڑھی جاتی اور حاضرین موزوں اشعار پر واہ واہ، سبحان اللہ کے کلمات تحسین خلوص دل کے ساتھ ادا کرتے۔

نواب میر محبوب علی خاں جب کبھی سفر کلکتہ وغیرہ سے واپس تشریف لاتے تو اس وقت بھی سارے شہر کی آئنہ بندی کی جاتی تھی۔ دوکانیں سجائی جاتیں تھیں جن پر خوبصورت ک کے پھول پتوں کی بیل یا تورن لگائی جاتی تھیں شاہی گزرگاہ کے دونوں جانب عوام گھنٹوں انتظار میں کھڑے رہتے۔

میر محبوب علی خاں کے بعد ان کے جانشین نواب میر عثمان علی خاں کے دور میں بھی جشن سالگرہ منایا جاتا تھا۔ لیکن ان کی سادگی کے پیش نظر کئی تقاریب ختم کر دی گئیں۔ صبح میں فتح میدان کے خوبصورت چھجو دار پویلین سے (جو اب فتح میدان اسٹیڈیم اور فتح میدان کلب کی خاطر منہدم کر دیا گیا ہے) افواج کی پریڈ ملاحظہ فرماتے۔ آخر میں سپہ سالار افواج شہزادہ برار گھوڑے پر سوار روبرو حاضر ہوتے اور سلامی پیش کرتے تھے شام میں سالگرہ کا دربار ہوتا۔ معززین کو خطابات عطا کیے جاتے اور حاضرین دربار کی نذریں قبول کی جاتی تھیں۔

لنگم پلی کا میلہ

نواب میر محبوب علی خاں کے دور میں ۱۷- ماہ رجب کو عرس کوہ مولا علی کے بعد ۱۸- ماہ رجب کو لنگم پلی کا میلہ ہوا کرتا تھا۔ یہ دراصل عرس کوہ مولا علی سے واپسی کا میلہ تھا۔ میلہ کے دن نواب میر محبوب علی خاں باغ لنگم پلی میں مع محلات تشریف لاکر قیام فرماتے تھے۔ والی ریاست کی موجودگی سے میلہ میں ایک نئی جان پیدا ہو جاتی تھی۔ شاہی باغ سے کچھ فاصلہ پر مسلم جنگ کے باغ کے مقابل کوتوال شہر کا کیمپ ہوتا تھا۔ مسلم جنگ کا باغ کافی خوبصورت

تھا اور روش روش پر خوبصورت مجسمے تھے جو باغ کی رونق میں اضافہ کرتے تھے۔ والی ریاست کی موجودگی کی وجہ سے کہیں شاہی ہاتھی جھومتے تھے اور کہیں شاہی اصطبل کے گھوڑے تیار کھڑے رہتے تھے۔ عرب قہوہ اڑاتے ہوئے اپنی ڈیوٹی بجالاتے تھے شاگرد پیشہ۔ خدمت گار، چوبدار ریشمی شیروانی رنگین پگڑیوں میں اِدھر اُدھر احکام کی تعمیل میں پھرتے رہتے۔ شاہی باورچی خانہ، میز خانہ، آبدار خانہ، تبول خانہ، مشعل خانہ، توشک خانہ اور ایسے ہی کئی کارخانوں کے ملازم اپنے اپنے کاموں میں دوڑتے پھرتے تھے۔ زنانی ڈیوڑھی میں خادمائیں۔ مامائیں کامٹن مالن رنگا رنگ ساڑیاں میں پشواز اور دوپٹوں میں پھرا کرتی تھیں۔

آصف جاہی حکمراں رواجاً میت پر پرسہ کے لیے اور جلوس جنازے میں نہیں آتے تھے۔ لیکن میر محبوب علی خاں نے اس خاندانی رواج کو توڑ دیا وہ نہ صرف جلوس جنازہ میں شریک ہوتے بلکہ کندھا بھی دیا کرتے تھے۔ ۱۱۔ محرم سنہ ۱۳۲۸ مطابق ۱۹۰۱ء کو حضرت اسمٰعیل شاہ صاحب مجذوب کا انتقال ہوا۔ ان کی نماز جنازہ مکہ مسجد میں ادا کی گئی۔ نواب میر محبوب علی خاں نے مکہ مسجد کے دروازے سے چار مینار تک ازراہ عقیدت جنازہ کو کندھا دیا۔ شاہ صاحب کی تجہیز و تکفین کے لیے خزانہ صرف خاص سے دو ہزار روپے منظور کیے گئے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے دور حکومت میں شاہی لنگر خاص اہتمام سے نکالا جاتا تھا۔ یہ لنگر ہر سال ۵۔ محرم کو سرکاری تقریب کے طور پر نکالا جاتا تھا اس لنگر کے ابتدا قطب شاہی حکمراں عبداللہ قطب شاہ کے عہد سے ہوئی تھی۔ لنگر کے جلوس میں تمام افواج باقاعدہ، بے قاعدہ، پولیس، نظم جمعیت کے علاوہ صرف خاص اور پائیگاہ کی فوجیں شریک رہتی تھیں۔ یہ لنگر دراصل ریاست کی تمام افواج کا جائزہ بھی تھا اور نمائش بھی۔ لنگر کے راستے مختلف ہوتے تھے۔ یہ لنگر اور تمام افواج اولاً مدارالمہام وقت کی دیوڑھی پر سے گزرتیں جہاں مدارالمہام افواج کی سلامی لیتے۔ پھر یہ لنگر اور افواج پنج محلہ پیالیس پر سے گزرتیں اور وہاں سے حسینی علم کے عاشور

خانہ کی جانب مڑ جاتے۔ لنگر کے دن بلکہ ایک رات قبل ہی سے لوگ لنگر کی گزرگاہ پر جمع ہو جاتے۔ ملکیات۔ کوٹھے اور بنگلے یا تو کرایہ پر لیتے یا پھر اجازتاً حاصل کیے جاتے تھے۔ بعض صاحب خانہ، جن کے مکان اس گزرگاہ پر ہوتے اپنے دوست رشتہ داروں کو مدعو کرتے۔ جہاں ایسی کوئی جگہ نہ مل سکتی تو لوگ جھاڑوں پر چڑھ جاتے یا دمدمے بنا کر بیٹھ رہتے تھے۔ ملازمین فوج، پولیس اور نظم جمعیت کے جوان صبح سویرے سے لنگر کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔

....

پانچواں دور

۱۳۳۰ھ تا ۱۳۵۵ھ

یعنی ۱۹۱۱ء تا ۱۹۳۶ء

یعنی مسند نشینی سے سلور جوبلی تک چھبیس ۲۶ سالہ دورِ حکومت

۱۳۳۰ھ سے ۱۳۵۵ھ کا زمانہ نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی حکمرانی کا چھبیس سالہ زمانہ ہے نواب میر عثمان علی خاں اردو اور فارسی کے پر گو شاعر تھے اور عثمان تخلص فرماتے تھے اس پانچویں دور میں بھی حیدر آباد چوتھے دور کی طرح علم و ادب کا مرکز بنا رہا۔ والی ریاست کے علاوہ مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت کی مدار المہامی اور پھر صدر اعظمی کے زمانہ میں ادیب و شاعر اور علماً اہل حیدر آباد سے نہ صرف خراج عقیدت ہی پاتے رہے بلکہ وہ معزز اور کلیدی عہدوں پر فائز کیے گئے تاکہ معاشی پریشانیوں سے آزاد ہو کر علم و ادب کی بجا طور پر خدمت انجام دے سکیں۔ نواب معین الدولہ اور نواب مہدی جنگ نے کرکٹ کے کھیل کی بڑی سرپرستی کی۔ نواب مہدی جنگ نے اپنے صرفہ سے ایک وسیع اسٹیڈیم تعمیر کرایا جو حیدر آباد میں اسپورٹس کا پہلا اسٹیڈیم تھا۔ اس دور میں اردو شعراً کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ ادبی اجتماع اور مشاعرے اب امراً کے دیوان خانوں میں ہی نہیں بلکہ ہر محلے میں بڑے اہتمام سے منعقد کیے جاتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے

قیام کی بدولت حیدرآباد اور علم و ادب کا سب سے بڑا مرکز بن گیا مولوی وحید الدین سلیم۔ مولوی عبدالحق۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ جوش ملیح آبادی اور سر راس مسعود کی موجودگی کی بنا پر اہل حیدرآباد میں علم و ادب کا بڑا ستھرا ذوق پیدا ہوا۔
اس دور میں جو شعرا حیدرآباد آئے ان میں حسب ذیل شعرا کے نام قابل ذکر ہیں۔

مرزا ہادی رسوا۔ ناظر الحسن ہوش۔ شبیر حسن خاں جوش۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ نثار یار جنگ مزاح۔ حسرت موہانی۔ واجد حسین یگانہ۔ فرحت اللہ بیگ۔ عظمت اللہ بیگ عظمت۔ تصدق حسین جائسی اور شوکت علی خاں فانی۔
شمالی ہندوستان کے نامور شعرا حسب ذیل گزرے ہیں۔
علی سکندر جگر۔ فضل الحسن حسرت۔ سر شیخ محمد اقبال۔ نارائن پرشاد ورما مہر۔ رضا علی وحشت۔ برج موہن لعل۔ دتاتریہ کیفی۔ ابوالاثر حفیظ اور جوش ملسیانی۔

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں بڑی دھوم دھام سے رسم تسمیہ خوانی انجام دی گئی۔ جب ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا تو مولانا نور اللہ خاں فضیلت جنگ عربی اور دینی تعلیم کے لیے، نواب عماد الملک اور سید علی شوستری فارسی اور مسٹر اجرٹن انگریزی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے۔ ابتدائی تعلیم قابل اساتذہ اور اتالیق کی نگرانی میں بمقام پرانی حویلی جاری رہی۔ سواری۔ شکار اور دوسرے سپاہانہ فنون کی تربیت سر افسر الملک کے تفویض ہوئے۔ نوجوان والی ریاست نے اپنی ریاست کے کئی اضلاع کا دورہ کر کے انتظامی امور سے خود واقفیت حاصل کی۔ بمبئی۔ کلکتہ اور اجمیر کی سیر و سیاحت فرمائی۔ سنہ ۱۹۰۲ء کے دہلی دربار میں آپ نے اپنے والد ماجد میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد کی ہمراہی میں شرکت فرمائی۔
۱۹۱۱ء م ۱۳۲۹ھ میں جب آپ مسند نشیں ہوئے تو اپنی ریاست کے حالات سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ تخت نشینی سے پانچ سال قبل یعنی ۱۳۲۴ھ میں

آپ کا عقد نواب جہانگیر جنگ بہادر کی دختر سے ہوا۔ آپ کی مسند نشینی کے وقت شہزادہ اعظم جاہ اور شہزادہ معظم جاہ بہادر بہت کم عمر تھے۔

عہدہ مدار المہامی سے مہاراجہ کی سبکدوشی

نواب میر عثمان علی خاں نے اپنی مسند نشینی کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد کو خدمت مدار المہامی پر بحال رکھا۔ مہاراجہ کو شاہی تقریب حاصل ہو گیا تھا۔ اب ان پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہو گئی تھیں۔ یعنی نئے حکمراں کے منشا کو ملحوظ رکھنا اور انگریز حکومت کا اعتماد بھی قایم رکھنا اور پھر نظم ونسق ریاست کو جاری رکھنا۔ ان ذمہ داریوں کے علاوہ طاعون کی وبا کا انسداد اور دہلی دربار میں والی ریاست کی شرکت کے لیے ضروری انتظامات بھی کرنے تھے۔ دہلی دربار سے واپسی کے بعد جب شاہی سواری نے جب اورنگ آباد میں قیام کیا تو مہاراجہ شہر میں طاعون کی وبا کے انسدادی کاموں کی نگرانی کے سلسلہ میں حیدرآباد چلے آئے۔ شاہی سواری اورنگ آباد سے ورنگل روانہ ہوئی۔ بادشاہ اور مدار المہام کی دوری سے کچھ ابن الوقت لوگوں کی بن آئی اور انھوں نے سرعت کے ساتھ غلط فہمیوں کا جال بچھادیا۔ پائیگاہوں کے انتظام میں تغیر ہوا۔ سلطان یار جنگ عہدہ کوتوالی سے سبکدوش کر دیے گئے اور محمد عبدالکریم خاں کو توال مقرر کیے گئے[1] محمد عبدالکریم خاں نوجوان حکمراں کی ولی عہدی کے زمانہ میں بحیثیت امین محکمہ کوتوالی میں ملازم ہوئے اور رفتہ رفتہ انھوں نے نوجوان حکمراں کے مزاج میں کافی اثر ورسوخ پیدا کر لیا۔ نوجوان والی ریاست کے مزاج اور حیدرآباد کے حالات کا بہترین اندازہ رائے مرلی دھر "راجہ فتح نواز ونت" کے اس معروضہ یا استغفے سے ہو سکتا ہے جو رائے صاحب نے نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے ملاحظہ میں بتاریخ ۱۸۔ اگست سنہ ۱۹۱۲ء پیش کیا تھا[2] اس طویل معروضہ کا

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص۱۸۰ و ص۱۸۱

[2] اخبار سیاست مورخہ ۲۰ ردسمبر ۱۹۷۰ء

اقتباس جناب حسن الدین احمد صاحب کے ایک مضمون سے لیا گیا ہے جو اخبار سیاست مورخہ ۲۰۔ دسمبر سنہ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔

راجہ مرلی دھر فتح نواز ونت کا معروضہ

"بملاحظہ اعلیٰ حضرت حضور پر نور بندگان عالی ادباً عرض ہے کہ مجھے کمیٹی صرف خاص مبارک سے علاحدہ کر دیا جائے یا میرا استعفیٰ منظور ہو۔ میری مجال نہیں حضرت ظل اللہ کو نصیحت کروں۔ مگر ظل اللہ کا نمک جو جزو تعمیر خون و استخوان ہے وہ مجبور کر رہا ہے کہ عرض کرنا ہی نمک حلالی ہے۔

ایک راز عرض کیے دیتا ہوں ہر وقت ملحوظ رہے۔ یہ ریاست مفتوحہ نہیں مکسوبہ نہیں ہے۔ متروکہ نہیں ہے یہ ریاست ممالک محروسہ ہے۔ سنہ ۱۲۷۶ھ تک آپ صاحب سکہ و فرمان نہ تھے۔ امرا و اعزا کی وفاداری رعایا برایا کی جاں نثاریاں اور حضرت ظل اللہ کے اسلاف کے نوازشات و داد و دہش، عنایات رحم و کرم اور مختار الملک مرحوم اور ان کے خاندان کی قابل تقلید وفاداریوں اور واجب الاحترام کارناموں نے خدا کے فضل سے صاحب سکہ و فرمان کر دیا۔ اس نعمت عظمیٰ کو مثل اپنے اسلاف اور قبلہ گاہی کے قدم بہ قدم خدا کے شکر کے ساتھ نباہے چلئے ورنہ خطرناک دن دیکھنا پڑے گا۔ استحکام حکومت کے لیے امرا و اعزا کی مرفع الحالی اور رعایا کی فارغ البالی لازم و ملزوم ہے۔

جو کچھ آپ کر رہے ہیں ادباً عرض ہے کہ غلط کر رہے ہیں کوئی نمک حلال اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ خدا کے لیے تو اپنی شخصیت پر رحم کیجیے۔ کچھ کسی کو دے کر خوش ہوئیے نے کر نہ ہوئیے۔ خدا نے اپنے فضل سے آپ کو کیا نہیں دیا۔ آپ ظل اللہ ہیں بادشاہ بنا کے خوش ہوئیے بگاڑ کے کیا فائدہ اور یہ خیال کہ امرا جاگیردار صاحبزادے، مرشد زادے دشمن

ہیں بالکل غلط ہے۔ یہ سب صدیوں سے نمک خوار ہیں۔ بجز اس ریاست کی بقا کے ان کی زیست کا کہیں ذریعہ نہیں اور اگر ہے تو آپ بتلا یئے۔
بے کسوں کو پریشان کرنے سے بہتر یہ ہے کہ سارے شرفا اور امراء کو بہ یک وقت گولی کا نشانہ بنادیا جائے۔
کوئی آپ کا دشمن نہیں۔ یہ دولت بے مصرف آپ کی خطرناک دشمن ہے اس کو صرف فرمائیے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیے
ظل اللہ کی ذاتی اور شخصی قابلیت خطرناک اوقات میں سازگار نہ ہوگی۔
میں آپ کی خدمت کا اہل نہیں رہا۔ میں نے سربرآوردہ ارباب صاحب دانش کا وفادارانہ جاں نثارانہ دور دیکھا ہے میرے لیے آبرو سے ہٹ جانا ہی مناسب ہے۔
میں نے اپنا سامان آگرہ روانہ کر دیا ہے اور چند ہفتوں میں چلا جارہا ہوں یہ عریضہ راز اگر ناگوار طبع ہو جائے تو یہ میرا آخری استعفیٰ متصور رہے۔
سن وسال بھی آرام کا طالب ہے۔ اگر میرے اس عریضہ پر التفات نہ فرمایا جائے تو ظل اللہ کا سکوت اجازت تصور کروں گا۔ جو نالاں و پریشان ہیں ان کا حسب دلخواہ میں انتظام کروں گا۔ ورنہ ظل اللہ کا ظلم متصور ہوگا۔ یہ بدنامی علاقہ ہٰذا دیکھنی میرے لیے نمک حرامی ہے۔
آج تک جو شیرازہ، ابتری عمل میں آرہی ہے وہ سب ....
.. کی ناعاقبت اندیش پلید صحبت کی وجہ ہے۔
مالک!
روپیہ کوئی چیز نہیں۔ استحکام وقار حکومت کی ساکھ کا نام سکہ ہے چھ آنے کی کھوٹ چاندی سولہ آنے کی ہو جاتی ہے۔ دو کوڑی کا کاغذ ہزاروں کا ہو جاتا ہے۔ حکومت کے وقار کا نام سکہ ہے۔ ورنہ سکہ کچھ بھی نہیں۔
اللہ کے لیے اپنے طرز عمل کو جلد سے جلد تبدیل فرمائیے۔ آپ کی ذاتی

قابلیت شریف وفادار صحبت خطرناک اوقات میں سازگار نہ ہوگی۔
منصب دار، جاگیر داروں کو پریشان نہ فرمایئے۔ اور نہ کسی رعایات، مراعات وکارخانہ جات وغیرہ کو تخفیف فرمائیے کہ نظر رحم وپرورش سلاطین کے لیے لازم وملزوم ہے۔ بغیر آسودگی مرفع الحالی برعیت وفاداری جذبہ کوجاں نثاری، دماغ شرافت تدبر پیدا نہیں ہوسکتا۔ تحفظ امارت انعام واکرام، تحفظ مدارج لازم ہے۔ ورنہ امن باقی نہیں رہے گا ان باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو عافیت محال ہے۔

ادھر فدوی نے صاف عرض کر دیا ہے اس کا مطلب غور فرمائیے میرا یہ عریضہ لفظ بہ لفظ بغور ملاحظہ فرمایا جائے۔

پیر ومرشد پرمثل اعلیٰ حضرت آصف جاہ اول کے رعایا برایا۔ امرأ و اعزا کے تحفظ حقوق کی ذمہ داریاں ہیں۔ آپ اپنی ذمہ داری کو محسوس فرمائیے تاریخ ملاحظہ فرمائیے آپ کے اسلاف مثل اورنگ زیب عالم گیر کے دکن کی سلطنت پر اورنگ زیب کے جانشیں ہیں اور آپ بھی مثل سلاطین مغلیہ کی وزارت اور نیابت بادشاہی کی یادگار ہیں۔ انگریزی حکومت بھی آپ کی خوبیوں اور اہل ریاست کے امرا ٔ و اعزا کے تدبر اور شریفانہ روش اور تعلقات پر ناز کرتی ہے۔ تبدیل سکہ کے وقت جو مراسلت مختار الملک بہادر اور انگریزوں کے مابین ہوئی تھی تحقیق فرمائیے میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ لاعلم ہوں۔ مگر نواب میر یوسف علی خاں کے کتب خانہ سے ابھی حال ہی میں میں نے چند کتابیں منگوا کر دیکھا ہے آپ کے ملاحظہ سے بھی ان حالات کی یاد تازہ ہوجانا ریاست کے لیے مفید ہے۔"

نئے کوتوال صاحب حالات ریاست پر کچھ اس طرح حاوی ہوگئے کہ سنجیدہ لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔ حالات تیزی سے بدلتے گئے اور قصر کنگ کوٹھی سے حکومت کی تمام ذمہ داریاں وابستہ ہوتی چلی گئیں۔ مدار المہام کی

اہمیت اور اختیارات کم ہوتے گئے۔ مہاراجہ نے کئی معروضات پیش کیے لیکن وہ قابل توجہ نہ سمجھے گئے۔ آخر کار مہاراجہ نے رواج کے مطابق چھ ماہ کی رخصت کی درخواست پیش کی جو خدمت سے سبکدوشی کے لیے ضروری اور آخری کارروائی تھی درخواست رخصت منظور ہوئی اور نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث مدارالمہام مقرر ہوئے۔

مہاراجہ کے خدمت مدارالمہامی سے سبکدوشی کا ذکر جناب حافظ محمد مظہر صاحب اپنی کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" میں اس طرح کرتے ہیں:-[1]

"کسی مطلق العنان بادشاہ کے خواہ وہ نوشیرواں ایسا عادل یا نیرو ایسا جابر کیوں نہ ہو، دربار کو لے لیجیے۔ آپ کو بادشاہ کے دل میں وسوسے ڈالنے والے اور دوسروں کی غداریوں کے فرضی قصے بنا بنا کر موقع و محل سے بیان کرنے والے ملیں گے۔ چنانچہ ان صدیوں سے چلے آنے والے رواج کی پابندی یہاں بھی ہوئی اور ایک ایسی شخصیت جو نوجوان بادشاہ (یعنی نواب میر عثمان علی خاں) کے زمانہ ولی عہدی میں ایک امین کوتوالی کی حیثیت سے نظر میں چڑھ گئی تھی۔ کوتوال ایسے اہم اور ذمہ دار عہدہ پر پہنچ کر ایسے حرکات کی بانی ہوئی جس نے بہت سے امرا اور عہدہ داروں اور عفران مکان اور ان کے خاندان پر جان دینے والوں کو سازشوں اور بدخواہوں کا رنگ و روپ دے کر ایک ایسا فتنہ پیدا کیا جو اگر چل جاتا تو ملک کو تباہ و برباد کر کے رہتا۔ بہرحال دربار کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا اور وہ زمانہ آگیا کہ مدارالمہام بدلا جائے۔ مہاراجہ کو رواج کے مطابق درخواست رخصت داخل کرنا پڑا۔ لیکن گیارہ سال کے بعد ہی حضور نظام اور برٹش گورنمنٹ کی نظر وزین اعتبار کے قابل ایک ہی شخصیت نظر آئی اور وہ تھے مہاراجہ۔"

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص۱۸۱

مدار المہامی سے سبکدوشی کے بعد مہاراجہ کی زندگی میں کئی انقلاب آئے اب ان کی دادودہش پر اسٹیٹ کی مالی حالت کے پیش نظر تحدید لگ گئی مدار المہامی کا اعزاز الونس دس ہزار روپے ماہانہ اب بند ہوگیا پیشکاری کی تحریر چھ ہزار اور دیگر مدات سے جملہ چودہ ہزار روپے ماہانہ اسٹیٹ میں جمع ہوا کرتے تھے[1] یہ آمدنی نہ تو مہاراجہ کی دادودہش کو قایم رکھ سکتی تھی اور نہ پیشکاری کے عہدہ کا رکھ رکھاؤ مناسب انداز سے قایم رہ سکتا تھا۔ مہاراجہ کی پریشانی کی ایک اہم وجہ اپنے احباب رشتہ دار اور با اعتماد ساتھیوں کی سرد مہری بھی تھی۔ ایوان شاد میں جہاں مدار المہامی کے دور میں معززین کا ہجوم رہا کرتا تھا۔ وہاں اب لوگ مہاراجہ سے کترانے لگے بلکہ وہ مہاراجہ سے چند منٹ کی گفتگو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ انھیں خدشہ تھا کہ زمانہ مہاراجہ کے موافق نہیں ہے اور اگر وہ مہاراجہ کے ساتھ چند منٹ بھی رہیں تو مخالفین ریاست میں شمار کیے جائیں گے۔ ان حالات میں بھی مہاراجہ گوشہ نشین نہیں ہوئے وہ جب کبھی شاہی تقریب میں طلب کیے جاتے یا رزیڈنسی میں دعوت ہوتی تو وہ اپنے امیرانہ ٹھاٹ سے شریک ہوتے تھے۔ نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کی دو سالہ مدار المہامی کے بعد مہاراجہ کو ذات شاہانہ اور شاہی خانوادہ کے بعد تقدم حاصل ہوگئی۔ وہ رزیڈنسی کی تقاریب میں جب شریک ہوتے تو "امیر اعظم سلطنت" کے طور پر ان کا استقبال کیا جاتا تھا۔ سبکدوشی کے زمانہ میں مہاراجہ نے اس بات کی کوشش کی کہ ان کے اسٹیٹ کی مالی حالت درست کی جائے۔ اسٹیٹ کی آمدنی جس قدر تھی اس سے کہیں زیادہ سودی قرضوں کی ادائی اور سود میں صرف ہو جاتا تھا۔ مالی مشکلات سے تنگ آکر مہاراجہ نے اعلیٰ حضرت سے درخواست کی کہ ان کی مالی مشکلات میں سرکار تعاون کرے[2] حکومت کی جانب سے ایک کمیشن قرضوں کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا گیا۔ کمیشن کے اراکین مہاراجہ کے ساتھ نیازمندانہ تعلقات رکھتے تھے۔ انھوں نے حقیقی قرضوں اور سود کے متعلق

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد صـ۱۸۴

[2] " " صـ۱۸۸

رپورٹ پیش کی۔ محکمہ فینانس کی رائے سے حکم ہوا کہ شاہی خزانہ سے بہ وقت واحد قرضوں کی ادائی ہو جائے اور بعد میں معینہ اقساط کے ساتھ یہ رقم اسٹیٹ پیشکاری حکومت کو ادا کردے۔ اس طرح مہاراجہ کو ایک بڑی پریشانی سے نجات مل سکی۔[1]

سبکدوشی کا یہ زمانہ مہاراجہ نے سیر و سیاحت اور علمی و ادبی مشاغل میں گزارا اپنی تالیفات وہ خود اپنے صرفہ سے شائع کرتے اور کثیر تعداد میں بطور تحفہ تقسیم کیا کرتے تھے۔ کئی علماء اور شعراء ان کی سرپرستی کی وجہ سے حیدرآباد میں رہ گئے۔ ان کی صلح کل پالیسی کی وجہ سے وہ عوام کے ہر طبقہ میں ہردل عزیز تھے اور آنکھوں پر بیٹھے جاتے تھے۔ والی ریاست بھی رفتہ رفتہ ان کی وفاداری سے واقف ہوتے گئے۔ رزیڈنسی میں ان کا اپنا ایک خاص مقام تھا۔ رزیڈنٹ سر ولیم بارٹن جب ریاست کی اصلاح اور تنظیم جدید کے لیے بھیجے گئے تو انھوں نے مہاراجہ کو وزارت کے لیے موزوں ترین شخصیت قرار دیا۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد صلح کل مسلک رکھتے تھے اور حیدرآبادی خواہ کسی ذات یا مذہب کے کیوں نہ ہوں انھیں عزیز تھے۔ وہ دسہرہ دیوالی اور ہولی کا تہوار بڑے طمطراق سے مناتے تھے۔ محرم کے زمانہ میں ان کی دیوڑھی عزاداری کا مرکز بن جاتی تھی۔ شاہی لنگر ان کی دیوڑھی سے ہوکر گزرتا تھا۔ اور نعل صاحب کی سواری کے دیوڑھی پر آنے پر وہ خود ڈھیٹی پیش کیا کرتے تھے۔

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کی مدارالمہامی

مہاراجہ سرکشن پرشاد کی مدارالمہامی کے گیارہ سالہ دور کے اختتام پر نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث مدارالمہام سلطنت مقرر ہوئے۔

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص ۱۸۸

نواب میر یوسف علی خاں بتاریخ ۱۴۔ شوال سنہ ۱۳۰۶ھ م ۲۔ جون سنہ ۱۸۸۹ء بمقام پلونا پیدا ہوئے[1] وہ بمشکل ایک ماہ کے تھے کہ ان کے والد نواب لائق علی خاں سالار جنگ دوم نے بڑے پریشان کن حالات میں انتقال کیا اور وہ شفقت پدری سے محروم رہے۔ زمانے نے ان کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔ میر لائق علی خاں سالار جنگ دوم سے ناراضگی کے باعث رزیڈنسی سر سالار جنگ کے خاندان پر زیادہ مہربان نہیں تھی۔ مدار المہام وقت نواب بشیر الدولہ آسمان جاہ اس خاندان کے اعزازات کو خاندان پیشکاری کے ساتھ ختم کرنے کے خواہش مند تھے لیکن نواب میر محبوب علی خاں کی توجہ اور سرپرستی کے باعث یہ دو قدیم خاندان محفوظ رہے۔

اس مشکل زمانے میں نواب آسمان جاہ کے اثر کی وجہ سے اپنے بھی بیگانے ہو گئے۔ نواب صاحب کے ماموں سید عبد الرحمٰن ابو تراب ان کی جائیداد کا تحفظ کرتے رہے۔ جس پر بیشتر امرا للچائی نظریں رکھے ہوئے تھے۔ آغا حیدر حسن مرزا کے الفاظ میں "میر یوسف علی خاں کی وراثت کے لیے بڑی گندگیاں اچھلیں جس کسی کو اس کی تحقیق کرنی ہو وہ مثلیں ان کے مقدمہ وراثت کی الٹ کر دیکھ لیں۔"

جب یہ معاملہ میر محبوب علی خاں کے حضور میں پیش ہوا تو انھوں نے نواب میر یوسف علی خاں کو جائز وارث تسلیم کیا۔ سدی عنبر جو نواب تراب علی خاں مختار الملک کا حبشی خدمت گار تھا اور اس نے نواب میر یوسف علی خاں کی جانی اور مالی حفاظت میں پورا پورا حق نمک ادا کیا۔ جب تک سن بلوغ کو نہ پہنچے وہ اپنی والدہ کے پاس زنان خانے میں رہے۔ آپ کی والدہ زینب بیگم صاحبہ نواب منصور الدولہ کرار جنگ کے خاندان سے تھیں۔ جن کی نوابان بیگن پلی سے قرابت تھی۔ زینب بیگم صاحبہ نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی نشست

---

1. مضمون آغا حیدر حسن شائع شدہ اخبار سیاست مورخہ ۵ راگست ۶۴ء
" صورت گراں حیدر آباد ص۲۴۳
" حیدر آباد کے بڑے لوگ ص۱۷
" منظر الکرام ص۲۸

برخاست ادب وآداب جوایک امیر کے شایان شان ہوں انھوں نے زنانے
میں حاصل کیے کھانے پینے میں بہت احتیاط کی جاتی تھی کہ کہیں کوئی مدعی مخالف
زہر نہ دے دے۔"

رزیڈنسی کی جانب سے بھی ان کی دیکھ ریکھ کی جاتی تھی۔ اس کام کے لیے
ایک انگریز دایہ مسز لورین مقرر کی گئیں تھی۔ جنھوں نے بڑی جانفشانی سے
کمسن نواب کی خدمت کرتی رہیں۔ مسز لورین نے انگلستان واپس جاکر ایک مستند
کتاب تحریر کی جس میں کمسن نواب کی پرورش اور پریشانیوں کا تفصیلی تذکرہ
کیا گیا ہے۔

اسٹیٹ سالار جنگ کی آمدنی کا بیشتر عملا کی تنخواہوں اور جائیداد کی نگرانی
میں خرچ ہوجاتا تھا اور بہت کم رقمی گنجائش کمسن نواب کی تعلیم وتربیت کے
لیے رکھی جاتی تھی۔ حضور میر محبوب علی خاں کے فرمان کے بموجب اسٹیٹ کی
نگرانی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے اراکین راجہ دھرم ونت۔ نواب
عماد نواز جنگ اور کپتان پرکلیر تھے کپتان پرکلیر اس کمیٹی کے معتمد بھی مقرر ہوئے۔
کچھ زمانے کے بعد نواب بہرام الدولہ اس کمیٹی کے صدر نشیں مقرر کیے گئے۔ بارہ
دری، اصطبل اور مکانات و کارخانہ جات کا انتظام حسب سابق سدی عنبر جانساماں
کے تحت رکھا گیا۔ کمیٹی کے کارکردگی سے ناراض ہوکر نواب میر محبوب علی خاں
والی ریاست نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جس کے اراکین مسٹر اے۔ جے۔
ڈنلاپ نواب اکبر جنگ۔ نواب عماد نواز جنگ مقرر کیے گئے کمیشن کے رپورٹ
کے بموجب انتظامی کمیٹی برخاست کردی گئی۔ اور رائے للتا پرشاد کو اسٹیٹ
سالار جنگ کا ناظم مقرر کیا گیا۔

نواب میر یوسف علی خاں نے گھر کی تربیت سے فراغت پائی اور بیرونی
مخالفین کا خطرہ کم ہوا تو مدرسہ عالیہ میں داخل کیے گئے جہاں انھوں نے اپنی عمر
کے سولہ سال تعلیمی مشاغل میں صرف کیے۔ مسٹر شین پرنسپل نظام کالج آپ کی
خوبیوں کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔

۱۷۔ جمادی الاول سنہ ۱۳۲۵ھ میں ان کو خاندانی خطاب سالار جنگ سے

سرفراز کیا گیا۔ سنہ ۱۳۲۵ھ میں نواب میر عثمان علی خاں والی ریاست کے فرمان سے اسٹیٹ پر سے سرکاری نگرانی برخواست کر کے نواب سالار جنگ کو نظم و نسق کے کامل اختیارات عطا کر دیے گئے۔

۱۳۳۰ھ م ۱۹۱۲ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد کی سبکدوشی کے بعد نواب میر یوسف علی خاں کو ریاست کا مدار المہام مقرر کیا گیا۔ اس وقت نواب صاحب کی عمر بیس سال بھی نہ تھی۔ اس موقع پر ایک شاعر احسنؔ نے ایک طویل نظم کہی۔ ع

زہے قسمت، عجب تاریخ نکل آئی ہے اے احسنؔ
زلیخا بن کے دیوانی میرے یوسف کے گھر آئی[1]

(اس نظم کے چند اشعار حسب ذیل ہیں)

تھی صبح عید سے بڑھ کر کہیں وہ صبح نورانی
جس دن آئے صادق جنگ لے کر حکم سلطانی
کہی یوسف علی خاں سے کہ لو تم کو مبارک ہو
وزارت پھر اسی گھر میں لیاقت جس کی ہے مانی
دکن کے چرخ پر تاباں رہے یارب یہ دو اختر
جمال یوسف ثانی جلال دور عثمانی

نواب عماد الملک اور نواب سر فریدون الملک نواب مدار المہام کے مشیر خاص مقرر کیے گئے جو نظم و نسق کا دیرینہ تجربہ رکھتے تھے۔

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی

نواب عماد الملک کی خوبیوں کا اندازہ محض اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ نواب سر سالار جنگ مختار الملک نے حیدرآباد کے سرکاری، درباری معاملات کو سلجھانے کے لیے جن صاحبان علم و فضل کو ہندوستان کے مختلف مقامات سے طلب کر کے حیدرآباد میں اہم خدمات پر فائز کیا ان میں عماد الملک سب سے پہلے حیدرآباد

---

[1] روزنامہ سیاست مورخہ ۱۲ر نومبر ۸۱ء

آئے اور ان کے بعد ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کئی اصحاب حیدرآباد آئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو نیک نامی اعزاز اور احترام عمادالملک کو حاصل تھا وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ تھی کہ عمادالملک آخر عمر تک حیدرآباد میں رہ سکے ورنہ دیگر کئی اصحاب جو ان کے بعد آئے تھے حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور ہوئے یا پھر خارج البلد کیے گئے۔

نواب میر یوسف علی خاں کی خدمت مدارالمہامی سے سبکدوشی

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث ۱۳۳۲ھ م ۱۹۱۴ء میں مستقل مدارالمہام مقرر ہوئے۔ لیکن وہ صرف ایک سال برسر خدمت رہے نوجوان بادشاہ اور نوعمر وزیر اعلا کی حیثیت سے نہ نواب میر محبوب علی خاں اور نواب میر لایق علی خاں کا ساتھ قایم رہا اور نہ نواب میر عثمان علی خاں اپنے نوعمر اور خوددار مدارالمہام نواب یوسف علی خاں کا ساتھ دے سکے۔ نوعمر مدارالمہام نے ۱۳۳۳ھ م ۱۹۱۵ء میں انتہائی خاموشی کے ساتھ رخصت کی درخواست پیش کردی اور ان کی سبکدوشی منظور کرلی گئی۔ نواب سالارجنگ ثالث کی اس سبکدوشی کے اسباب آج تک بھی واضح نہ ہو سکے۔ لیکن میر یوسف علی خاں کے ایک قریبی رشتہ دار[1] کے بیان کے بموجب مدارالمہام کو توال وقت اور نوجوان بادشاہ کی تیز و تند طبیعت کا ساتھ نہ دے سکے اور ڈھائی سال میں "دیوانی" نے دیکھا کہ وہ جوانی کا زیادہ ساتھ نہیں دے سکتی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دیوان دیوڑھی سے رخصت ہوگئی۔ حکومتی عہدہ کی پرستش کرنے والے مداح پھر دیوان دیوڑھی میں نظر نہیں آئے۔ نواب میر یوسف علی خاں نے خود کو زمانہ کی روش پر ڈھال لیا۔ انگلستان کے سفر کے بعد انھوں نے اس خلیج کو پاٹنا چاہا جو ان کے اور عام انسان کے درمیان تھی مگر وہ پاٹ نہ سکے۔ ان پر مذہب کا رنگ بھی چڑھا اور رمضان کے پورے روزے رکھنا شروع کیا۔ ماہ عزا کا احترام سختی سے کرتے تھے۔

---

[1] نواب نادر علی خاں تبیرہ کرار جنگ منصور الدولہ

ان میں خود اعتمادی کی کمی تھی اس لیے دوسروں پر پورا پورا اعتماد کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اپنے تلخ تجربوں کی بنا پر ایک حد تک ان کا یہ طریق عمل ٹھیک بھی تھا دوران گفتگو میں وہ یکایک "دیوار ہم گوش دارد" کے خیال سے فوراً موضوع گفتگو کو بدل دیا کرتے تھے۔ ماہر نفسیات کے لیے وہ متضاد خصوصیتوں کا نمونہ تھے۔ ان میں وہ خوبیاں بھی تھیں جن سے امرا اکثر محروم رہتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنی ذاتی ضروریات کے لیے قرض نہیں لیا۔ وہ نوادر خریدتے اور بند کر کے رکھ دیتے تھے۔ جو چیز نظر میں چڑھ جاتی اس کے لیے بیتاب رہتے۔

نواب سالار جنگ کے نوادرات ع[1]

حیدر آباد کے عوام اس حقیقت سے قطعاً لاعلم تھے کہ نواب سالار جنگ سوم نے دنیا کے تقریباً ہر گوشہ سے نوادرات جمع کر رکھے تھے۔ اس بات کا علم اس وقت ہوا جب کہ چالیس ہزار ارٹ کے شاہکار ایک میوزیم کی صورت میں دیوان دیوڑھی ہی میں بڑے سلیقے کے ساتھ سجائے گئے ۱۶۔ دسمبر سنہ ۱۹۵۱ء کو جمہوریہ ہند کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک کثیر اجتماع کی موجودگی میں اس میوزیم کا افتتاح فرمایا۔ اولاً میوزیم کی ترتیب سالار جنگ کمیٹی کی نگرانی میں ہوئی جو نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ سوم کی وفات کے بعد حکومت حیدر آباد کی جانب سے مقرر کی گئی تھی۔ فن میوزیم کے ایک ممتاز ماہر ڈاکٹر کوزف کو نواب صاحب کے ذخیرہ نوادرات سے موزوں اشیا کے انتخاب کے لیے مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر کوزن نے یہ کام مسٹر جی۔ وینکٹ چلم ماہر نقاد اثار قدیمہ کی امداد اور تعاون سے انجام دیا۔ اس زمانہ میں نواب سالار جنگ کے کوئی ایک سو چودہ وارث اس دعوے کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے کہ نواب سالار جنگ کے متروکہ میں وہ حصّہ دار ہیں اور میوزیم کی تمام تر اشیا متروکہ کا جز ہونے کے باعث

ع۱ Origin and Development of Museum by Dr. D.N Verma, 'Silver Jubilee Souvenir' Page-7

ورثا میں قابل تقسیم ہیں۔ لیکن بعد میں تمام ورثا نے متفقہ طور پر حکومت ہند اور حکومت آندھرا پردیش سے مصالحت کر لی۔ آندھرا پردیش ہائیکورٹ سے ایک متروکہ کی ڈگری بتاریخ ۳۔دسمبر سنہ ۱۹۵۸ء صادر ہوئی۔ اس ڈگری کے بموجب ورثا سالار جنگ میوزیم کے تمام نوادرات سے دست بردار ہو گئے اور یہ اشیا مرکزی حکومت کی ملکیت قرار دی گئیں۔ اس طرح میوزیم کا نظم ونسق وزارت سائنٹفک ریسرچ اور تہذیبی امور (حکومت ہند) کے سپرد کر دیا گیا۔ یکم جولائی سنہ ۱۹۶۱ء کو میوزیم کا نظم ونسق سالار جنگ میوزیم بورڈ کے حوالہ کر دیا گیا جو پارلیمنٹ کے ایک قانون کی رو سے قایم کیا گیا تھا۔ بورڈ کے صدر نشین گورنر آندھرا پردیش مقرر کیے گئے اور نواب سالار جنگ مرحوم کے خاندان کے ایک فرد کو بورڈ کا رکن مقرر کیا جانے لگا۔ اس طرح بورڈ کے قایم ہونے کی تاریخ سے آج تک نواب عباس یار جنگ بہادر خلف نواب تراب یار جنگ مرحوم بورڈ کے ممبر نامزد کیے جا رہے ہیں۔ سالار جنگ کے ورثا کی جانب سے پانچ لاکھ روپے اور خطہ آراضی تقریباً پانچ ایکڑ گورنمنٹ کو بطور عطیہ دیے گئے تاکہ وہاں میوزیم کی جدید عمارت تعمیر کی جاسکے۔ بعد میں حکومت کی جانب سے مزید پانچ ایکڑ زمین خریدی گئی۔ اس طرح میوزیم کے لیے دس ایکڑ زمین فراہم کی گئی تاکہ آئندہ مزید تعمیر کے لیے کوئی دشواری پیدا نہ ہوسکے۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اس میوزیم کی جدید عمارت کا سنگ بنیاد بھی پنڈت جواہر لعل نہرو نے بتاریخ ۲۳۔جولائی سنہ ۱۹۶۳ء رکھا۔ حیدرآباد کے مشہور آرکیٹکٹ جناب حشمت رضا نے میوزیم کا نقشہ تیار کیا۔ ریاست مہاراشٹرا کے اسٹیٹ آرکیٹکٹ مسٹر جادو نے اس میں ضروری ترمیم اور اضافے کیے۔ پھر عمارت کے نقشہ کی توثیق انگلستان۔ جاپان اور امریکہ کے ماہر آرکیٹکٹ سے کرائی گئی۔ جدید عمارت تعمیر کے بعد میوزیم کی اشیا یکم جون سنہ ۱۹۶۸ء تک دیوان دیوڑھی سے جدید عمارت میں منتقل کر دی گئیں۔ البتہ میوزیم کا رسمی افتتاح ۲۴۔جولائی سنہ ۱۹۶۸ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ نے کیا۔

نواب سالار جنگ کا کتب خانہ[1]

نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کی زندگی تک بہت کم لوگ ان بے قیمتی اور نایاب کتب خانہ سے واقف تھے۔ لیکن آج اس خاندانی کتب خانہ کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ اس کتب خانہ کی سب سے قدیم ترین کتاب ایک قلمی قرآن الحکیم ہے جس پر سالار جنگ اول کے جد اعلا محمد باقر بن شیخ محمود علی کی مہر اور دستخط ثبت ہیں اس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کتب خانہ کی بنیاد شروعات سنہ ۱۰۶۷ ھ م ۱۶۵۶ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اس خاندان کے مختلف افراد نے اپنی زندگی میں اپنے ذوق و شوق کے لحاظ سے اس کتب خانہ میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا اضافہ کیا نواب سر سالار جنگ مختار الملک کے انتقال سے قبل اس کتب خانہ میں قیمتی و نایاب کتابوں کی تعداد چھ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ سالار جنگ دوم میر لائق علی خاں عماد السلطنۃ نے ان کتب و مخطوطات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ان کتب و مخطوطات کی علاحدہ علاحدہ فہرستیں ترتیب دیں۔ سالار جنگ ثالث نواب میر یوسف علی خاں نے تقریباً بارہ ہزار کتب و مخطوطات کا اضافہ کیا۔ ان کی زندگی میں کتب خانہ میں بائیس[22] ہزار انگریزی کتب کا اضافہ ہوا۔ کتب خانہ کی زیادہ تر کتابیں خریدی ہوئی رہی اور بہت کم کتابیں تحفتہً وصول ہوئی ہیں۔ سالار جنگ ثالث کے انتقال کے بعد جب متروکہ کے مقدمہ میں ورثہ سالار جنگ نے حکومت سے مصالحت کر لی تو یہ کتب خانہ میوزیم کے نوادرات کے ساتھ مرکزی حکومت کے تحویل میں دے دیا گیا۔ فی الحال اس کتب خانہ میں مطبوعہ کتابوں کی تعداد پچیس ہزار سے کم نہیں۔ یہ کتابیں سالار جنگ ثالث کی وراثت

---

[1] Salar Jung Museum Library, its origion and Development By S.M. Jawad Rizvi Silver Jubilee Souvenir at page 85

میں ملی ہوئی خوبصورت اور دیدہ زیب الماریوں میں رکھی گئی ہیں جس سے اس لائبریری کے باطنی حسن بھی پڑھنے والے کو محفوظ کرتا ہے۔ یہاں ریفرنس (REFERENCE) میں کوئی آٹھ ہزار کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ سالار جنگ ثالث کی وفات کے بعد چار ہزار کتابیں خرید کر اس شعبہ میں رکھی گئی ہیں۔ شعبہ مشرقی مطبوعات میں پندرہ ہزار عربی فارسی اردو اور ترکی کتابیں موجود ہیں۔ اس شعبہ کی قدیم ترین کتاب "تاریخ الوالقدا" (عربی) ہے جو مع فارسی ترجمے کے آج سے تقریباً ۲۵۲ سال قبل یعنی ۲۳، ۱۷ء میں چھاپی گئی تھی۔ اس طرح عربی کتاب بائیبل اور کتاب "الالفاظ الکتابیہ" ہیں جو علی الترتیب سنہ ۱۷۲۷ء اور ۱۸۴۳ء میں طباعت سے آراستہ ہوئیں۔

شعبہ مخطوطات اس کتب خانہ کا اہم ترین شعبہ ہے۔ عربی، فارسی، ترکی اور اردو کے نایاب مخطوطات یہاں ہیں۔ شائد اس قدر مخطوطات دنیا کے کسی اور کتب خانہ میں دستیاب ہو سکیں۔ یہ مخطوطات کئی رسم الخط میں لکھے ہوئے ہیں۔ کوفی، نستعلیق۔ شفیہ۔ شکستہ۔ ثلث اور ان کے انوکھے طرز مثلاً صنعت غبار۔ جلی۔ خانی۔ گلزار۔ پیچاں۔ بہار۔ طغرا۔ زلف عروس اور خط ناخن استعمال کیے گئے ہیں۔ جنھیں اپنے زمانہ کے مشہور اور چنیدہ خطاط نے تحریر کیا۔ عربی۔ فارسی اور اردو کے مخطوطات کی تعداد آٹھ ہزار ہے۔ ترکی۔ پشتو اور ہندی کی کئی قلمی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ زیادہ مخطوطات مطلا یا مہذب ہیں۔ یا پھر بہترین جلدوں میں محفوظ رکھی گئی ہیں شاہانہ صفویہ ایران۔ بخارا۔ افغانستان۔ کشمیر۔ مغلیہ۔ عادل شاہی۔ قطب شاہی آصف جاہی اور شاہانہ اودھ کے کتب خانے کسی نہ کسی طرح سالار جنگ کے خاندانی کتب خانہ میں پہنچ کر محفوظ ہو گئے ہیں۔

اس کتب خانہ کا سب سے قیمتی سرمایہ مصور نسخے ہیں جن کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ اور ان میں زائد از دو ہزار قلمی تصاویر ہیں۔ اس شعبہ کا اہم ترین نسخہ ایک نامکمل قرآن مجید ہے۔ جو تقریباً دوسری صدی ہجری میں یہ خط کوفی جھلی پر لکھا گیا۔

کتب خانہ سالار جنگ کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہاں یاقوت

کے تین قلمی نسخے موجود ہیں - یاقوت وہ مشہور خطاط ہے کہ اگر کسی کتب خانہ میں اس کا ایک بھی نمونہ مل جائے تو وہ کتب خانہ گراں مایہ سمجھا جاتا ہے - ایک ایسا قرآن شریف بھی ہے جس کے متعلق کاتب نے لکھا ہے کہ اس نے یہ نقل حضرت علی کے خود نوشتہ سے حاصل کی ہے - ایک قرآن مجید اس طرح سے لکھا گیا ہے کہ ایک صفحہ پر ایک پارہ آگیا ہے - دوسرا اس طرح نقل کیا گیا ہے سطر الف سے شروع ہوتی ہے - تیسرے نسخے میں اس بات کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے کہ پہلی اور آخری سطر ایک حرف یا الفاظ سے آغاز پائے - ایک نسخہ ایسا بھی ہے جس کو بیجاپور کے شہرہ آفاق بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے خود لکھا تھا - دو کوٹ ایسے ہیں جن پر مکمل قرآن پاک لکھا ہوا ہے - یہ کوٹ عام طور پر صرف سلاطین یا امیر کبیر استعمال کرتے تھے -

اس کتب خانہ میں وہ مشہور قصیدہ موجود ہے جو مرزا غالب نے سر سالار جنگ کو روانہ کیا تھا - میر عالم کی تحریر یہاں محفوظ ہے - فردوسی - نظامی - انوری - خاقانی - عطار - امیر خسرو - حافظ جامی - شاہ راجو قتال - عرفی - ظہوری - نظیری ناصر علی سرہندی بیدل - چندو لعل شاداں - اور کئی مشاہیر کی تحریریں یہاں موجود ہیں -

ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ "تاج الماثر" کا یہاں وہ نسخہ موجود ہے جو سنہ ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۱۶ء میں لکھا گیا تھا - عشرتی کا ترجمہ "بدمادت" احسن الحکایات کا ایک قدیم نسخہ اور جدید التواریخ جو مشہور کاتب محمد مظفر الدین خاں امیر یار جنگ نے تحریر کیا ہے یہاں موجود ہیں - کلیات محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ اس کتب خانہ کا قیمتی سرمایا ہیں - دکھنی اسکول کی آٹھ عمدہ تصاویر ہیں - جن پر شیراز اسکول کا شبہ ہوتا ہے " نورس" از جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی کا قدیم ترین نسخہ یہاں موجود ہے - موسیقی کے شعبہ میں واجد علی شاہ رائے بشیر اور خوشحال خاں کے مخطوطات قابل دید ہیں - تلاوت الوجود اور شکار نامہ نوشتہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز یہاں کے قابل الذکر نسخے ہیں -

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث نے ۲- مارچ ۱۹۴۹ء کو اچانک انتقال کیا اس عظیم شخصیت، ایک روشن خیال جاگیردار کے سوگ میں ملٹری گورنر نے ایک دن کی تعطیل کا اعلان کیا۔

سر علی امام دور آصفی کے پہلے غیر ملکی وزیر اعلیٰ

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کے استعفیٰ کے تقریباً دو سال بعد یعنی ۱۱- مہر سنہ ۱۳۲۸ھ م ۲- اگست سنہ ۱۹۱۹ء کو سر علی امام کا تقرر بہ حیثیت وزیر اعلیٰ بہ یافت سات ہزار روپے سکہ ہند اور بارہ سو روپے سکہ ہند الونس پر کیا گیا۔

سر علی امام سے قبل یوں تو کئی غیر ملکی اصحاب حیدرآباد آئے اور ریاست کے اعلا عہدوں پر فائز ہوئے لیکن وزیر اعلیٰ یعنی مدارالمہام کا عہدہ ہمیشہ اقربائے سرکار کے لیے مختص رہا۔ رکن الدولہ۔ صمصام الدولہ ارسطو جاہ۔ میر عالم۔ منیر الملک۔ مختار الملک۔ سالار جنگ ثانی عماد السلطنت۔ آسمان جاہ۔ وقار الامرا۔ وغیرہ وہ امرا تھے جن کے اجداد نواب آصف جاہ اول کے ہم رکاب دہلی سے دکن آئے تھے۔ خاندان پیشکاری بھی چوں کہ آصف جاہ اول کے ساتھ دکن آیا تھا اس لیے اس خاندان کے چند امرا مثلاً راجہ پورن چند راجہ چندو لعل راجہ رام بخش راجہ نریندر بہادر اور مہاراجہ کشن پرشاد وہ ہندو امرا تھے جنھیں مسند مدارالمہامی عطا کی گئی۔ لیکن دور آصفی میں سر علی امام وہ پہلے غیر ملکی وزیر اعلیٰ ہیں جن کا وائسرائے ہند نے "بہبودی سلطنت کی خاطر" خدمت وزارت اعظمیٰ پر تقرر کے لیے سفارش کی تھی بعد میں چل کر یہ رسم بن گئی کہ انتخاب وزارت اعظمیٰ بہ ایمائے وائسرائے بہادر ہوا کرے۔ سر علی امام کے تقرر کے بعد نظام حیدرآباد کا وہ اختیار، جس کی بنا پر وہ اپنا وزیر اعظم خود منتخب کر سکتے تھے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

حیدرآباد میں سر علی امام نے سب سے پہلے جس کام کی جانب توجہ کی وہ باب حکومت (سکریٹریٹ) کی تشکیل اور جدید دستور العمل کا نفاذ ہے۔

باب حکومت کی افتتاحی رسم کنگ کوٹھی میں عمل میں آئی۔ جریدہ غیر معمولی مورخہ ۱۶۔ دسمبر سنہ ۱۳۲۹ اف کی رو سے "صدر نشین باب حکومت" صدر اعظم باب حکومت قرار پائے۔ اس سے قبل وزیر اعلا کے لیے "مدار المہام" کی اصطلاح مروج تھی۔

اسکیم انتزاع اختیارات عدالتی کا نفاذ

سنہ ۱۳۲۹ اف م ۱۹۲۰ء میں سر علی امام کو "موید الملک" کا خطاب عطا ہوا۔ سر علی امام کے دورِ وزارت کا اہم واقعہ جو حیدرآباد کی دستوری تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا وہ نفاذ اسکیم انتزاع اختیارات عدالتی ہے۔ ابتداً سلطنت مغلیہ کی طرح مملکت آصفیہ میں عدالتی امور قضاۃ کے سپرد تھے۔ من بعد جب محکمہ کوتوالی ٹپہ، کروڑگیری اور مال قایم ہوئے تو ان محکمہ جات سے متعلق عدالتی تنازعات کے اختیارات بھی ان محکمہ جات کے سپرد کر دیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام محکمے اپنے اپنے مقام پر کافی اختیارات کے حامل بن گئے۔ خصوصاً محکمہ مال کے عہدہ دار جن کے اولین فرائض مالگزاری اور تنظیم جمع بندی تھا عدالتی اختیارات حاصل ہونے کے بعد تحصیل۔ تعلقہ دار صوبہ داری میں تمام سیاہ و سفید کے مختار بن گئے اس پر طرہ یہ کہ دیوانی اختیارات کے ساتھ ساتھ فوجداری اختیارات بھی انھیں حاصل تھے۔ صوبہ دار، سشن جج کے اختیارات استعمال کرتے تھے اور اول تعلقہ دار نظماً فوجداری ضلع (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) ہوا کرتے تھے دوم اور سوم تعلقہ دار اور تحصیل داروں کو فوجداری اختیارات حاصل تھے۔ اس طریقہ کار کا ایک نقصان یہ تھا کہ عہدہ داران مال۔ جنھیں اپنے اولین فرائض مال سے فرصت نہ ملتی تھی۔ وہ عدالتی تنازعات کا بر وقت تصفیہ نہ کر سکتے تھے۔ عہدہ داران مال کے دورن کے پیش نظر مقدمات کی پیشی ضلع کے مستقر سے دور دراز مقامات پر رکھی جاتی تھیں۔ فریقین اور گواہوں کو اپنے کام کاج چھوڑ کر تلاش انصاف میں گاؤں گاؤں پھرنا پڑتا تھا۔ ایک اور ستم یہ تھا کہ اول تعلقہ دار جو ایک طرف تو ناظم کوتوالی اور دوسری طرف عدالت ضلع کے اختیارات رکھتے

تھے۔ وہ صبح، ناظم کوتوالی بن کر جس ملزم کو چالان کا حکم صادر کرتے دوپہر کو مجسٹریٹ بن کر اسی ملزم کے مقدمہ کی خود ہی تحقیقات کرتے اور سزا تجویز کرتے تھے۔ سنہ ۱۳۲۲ف میں جب کہ نواب سر نظامت جنگ جو ہائیکورٹ کے چیف جسٹس (میر مجلس) تھے تحریر کی کہ جب تک عہدہ داران مال سے عدالتی اختیارات نہ لے لیے جائیں اور جدید منصف مامور نہ ہوں عدالتی کام میں اصلاح ناممکن ہے۔" سر نظامت جنگ کی اس تحریک پر" بارگاہ خسروی سے حکم ہوا کہ صوبہ ورنگل (میدک) کے لیے دو سشن جج مقرر ہوں۔

سر علی امام کے سفر حیدرآباد کا ایک واقعہ

اس عدالتی خلفشار اور سراسیمگی کے ماحول میں جب سر علی امام نے صدر اعظم کی خدمت کا جائزہ حاصل کیا تو انھیں اپنے سفر حیدرآباد کا ایک مشہور واقعہ[1] خوب یاد تھا۔ وہ حیدرآباد ہائیکورٹ میں پیروی کے سلسلہ میں پٹنہ سے حیدرآباد ریل میں سفر کر رہے تھے۔ حیدرآباد سے چند میل دور جب ریل گاڑی ایک تعلقہ کے چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تو سر علی امام نے دیکھا کہ اسٹیشن پر گاؤں کے لوگوں کا بڑا ہجوم ہے۔ جب ریل گاڑی اسٹیشن پر رکی تو انھوں نے دیکھا کہ ایک پستہ قد کمزور اور لاغر نواب (جن کا نام زین العابدین عرف چنو میاں تھا)، اس ہجوم کے ساتھ سر علی امام کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف پھولوں میں لدے پھندے بڑھ رہے ہیں۔ کمپارٹمنٹ میں سوار ہونے سے پہلے گاؤں والوں نے ان کی گلپوشی کی اور بازوؤں پر امام ضامن باندھے۔ نواب صاحب کافی اسباب کے ساتھ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے گاؤں کے عہدہ دار کمپارٹمنٹ میں ان کا سامان قرینہ سے لگا رہے تھے اور سر علی امام سے کہہ رہے تھے کہ وہ راستہ میں تحصیل دار صاحب

---

[1] ہستی وکلا کا ایک ورق از ستنارائن ڈگے (ایڈوکیٹ)
ذکر یار چلے (مرزا ظفر الحسن عثمانی بکڈپو) ص۲۴۶

کے آرام کا خیال رکھیں۔ جب ریل اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو نواب تحصیل دار صاحب نے بہ انداز حاکمانہ اپنے ہم سفر سے دریافت کیا۔

"تم کہاں جارہے ہو؟"

"سر علی امام نے کہا" حیدرآباد جارہا ہوں" نواب صاحب نے پھر دریافت فرمایا" کیا کام کرتے ہو" سر علی امام نے جواب دیا" وکالت کرتا ہوں" نواب صاحب نے ایک حقارت بھری نظر ڈالی اور خاموش ہو گئے۔ سر علی امام نے رسماً دریافت کیا آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں" نواب صاحب نے بڑے روکھے انداز میں جواب دیا" میں حیدرآباد جارہا ہوں" سر علی امام کو بڑی حیرت ہوئی اور پوچھا" اس قدر مختصر سفر کے لیے اس قدر لوگوں کو آپ نے تکلیف کیوں دی اور پھر یہ گلپوشی اور امام ضامن!! نواب صاحب نے بڑی متانت کے ساتھ کہا۔" میں اس تعلقہ کا تحصیل دار ہوں۔ مجھے مال اور عدالت کے پورے اختیارات حاصل ہیں۔ اگر گاؤں والے اس طرح اسٹیشن پر حاضر نہ ہوتے تو میں انھیں جیل بھیج دیتا" دوران سفر میں جب کھانے کا وقت آیا تو نواب صاحب نے اپنے ہم سفر سے کہا" میرے ساتھ شریک ہو جائیے میرے ساتھ کافی توشہ ان لوگوں نے رکھا ہے"۔ پھر لوازمات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا" یہ سب وکالت میں کہاں ملتے ہوں گے" راستہ میں سر علی امام نے آئندہ ملاقات کے لیے نواب صاحب کا نام اور پتہ نوٹ کرلیا۔ یہ واقعہ سر علی امام کے ذہن میں نقش کر گیا اور وزارت اعظمیٰ پر تقرر کے بعد انھوں نے ارادہ کرلیا کہ عدالتی اختیارات کی تقسیم ان کا پہلا کام ہوگا۔"

سر علی امام اپنی اس کوشش میں بہت جلد کامیاب ہو گئے۔ حیدرآباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس نواب مرزا یار جنگ نے ۱۳۲۷ ف م ۱۹۱۸ء میں اپنی

سب سے پہلی رپورٹ میں سرکار کو "انتزاع اختیارات" کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی تھی اور پھر کئی سال تک مسلسل جدوجہد کرتے رہے لیکن سر علی امام کے وزارت سنبھالنے کے بعد یہ کام آسان ہوگیا۔

بتاریخ ۲۹- شعبان سنہ ۱۳۳۹ھ م ۳- تیر سنہ ۱۳۳۰ف م ۱۹۲۱ء حضرت بندگان عالی کا فرمان شرف صدور لایا۔ اس تاریخی فرمان کو اس خیال سے یہاں نقل کیا جارہا ہے کہ جدید حیدرآباد کے اصحاب فرمان کی شان اور بانکپن سے واقف ہوسکیں۔

کنگ کوٹھی

فرمان[1]

کچھ عرصہ سے میری توجہ اس مسئلہ کی طرف مبذول ہوئی ہے کہ نظم و نسق ممالک محروسہ میں اختیارات کو انتظامی عہدہ داروں سے علاحدہ کرلیا جائے۔

اس مسئلہ پر کافی غور کرنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ انتظام میں یہ اصلاح کردی جائے کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ اس سے کام بھی عمدگی سے چل سکے گا اور یہ طریقہ میری عزیز رعایا کے لیے زیادہ تر موجب آسایش و اطمینان ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ فرائض مذکورالصدر کی علاحدگی کے لیے جو تجویز عمل میں آئے اس میں یہ امر ملحوظ ہے کہ عہدہ داراں صیغہ انتظامی ان تمام فرایض سے سبکدوش کیے جائیں جو کلیتاً عدالتی تصور کیے جاتے ہیں۔ بجز ان فرایض کے جو بروئے قوانین مالگزاری ان سے

---

[1] تاریخ عدالت آصفی از میر باسط علی خاں ص۱۶۹

متعلق ہوں یا جو قوانین تعزیری کے ضمن میں بغرض تحفظ امن عامہ خاص اور اہم انسدادی صورتوں کے لیے ان کے سپرد کیے گئے ہوں۔

صدر اعظم باب حکومت میعار کیے جاتے ہیں کہ حسب ہدایت صدر علاحدگی کا انتظام بلا تاخیر عمل میں لائیں اور ذیلی امور کے متعلق مناسب احکام صادر کریں۔

میرا یہ حکم جریدہ غیر معمولی میں شائع کیا جائے۔

شرح دستخط مبارک
اعلیٰ حضرت بندگان عالی

۲۹۔ شعبان سنہ ۱۳۲۹ھ

شرح دستخط امین جنگ
صدر المہام پیشی مبارک

شرح دستخط مہدی یار جنگ
معتمد سیاسیات

یہ اسکیم یکم خورداد سنہ ۱۳۳۱ف م ۱۹۲۲ء سے نافذ کی گئی۔ آٹھ سال تک یہ اسکیم نافذ رہنے کے بعد گورنمنٹ نے ایک کمیشن اس بات کی تحقیق کے لیے مقرر کیا کہ "کس حد تک یہ اسکیم کامیاب رہی" اس کمیشن کے ایک رکن مسٹر ٹی۔ جے۔ ٹاسکر آئی۔ سی۔ ایس صدر المہام بھی تھے۔ کمیشن نے رائے دی کہ کوئی وجوہ نہیں پائے جاتے کہ اس طریقہ کو منسوخ کر کے سابقہ طریقہ پر غور کیا جائے۔" اس طرح سر علی امام کی اس اسکیم پر گورنمنٹ کی مہر توثیق ہو گئی۔

نواب مرزا یار جنگ (مرزا سمیع اللہ بیگ)

انتزاع اختیارات کی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے میں، ہائیکورٹ حیدرآباد کے چیف جسٹس نواب مرزا یار جنگ نے بہت اہم رول

ادا کیا۔

نواب مرزا[1] یار جنگ بہادر نے جب سنہ ۱۳۲۷ف م ۱۹۱۸ء میں میر مجلس کی حیثیت سے جائزہ حاصل کیا تو انھوں نے اپنی سب سے پہلی رپورٹ میں حکومت کو انتزاع اختیارات کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی پھر کئی سال تک آپ اس تحریک کے لیے مسلسل جد و جہد فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ کی یہ تحریک بارآور ہو گئی اور اسکیم انتزاع اختیارات کی نسبت بتاریخ ۲۹۔ شعبان سنہ ۱۳۳۹ھ م ۳۔ تیر سنہ ۱۳۳۰ف م ۱۹۲۱ء حضور نظام کا فرمان صادر ہوا۔

وزارت اعظمیٰ سے سر علی امام کی سبکدوشی

سر علی امام ایک ترقی پسند صدر اعظم تھے۔ اس کی ترقی پسندی۔ انگریز سامراج کے لیے ایک نئے خطرہ کا نقطۂ آغاز بن سکتی تھی" باد مخالف" سر علی امام کے نظم و نسق میں ٹھہراؤ پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ آبان سنہ ۱۳۳۱ف م سنہ ۱۹۲۲ء میں سر امام خدمت سے مستعفی ہو کر پٹنہ چلے گئے اور حسب سابق وکالت کرنے لگے لیکن پٹنہ ہائیکورٹ میں سر سلطان احمد پوری طرح چھا گئے تھے۔ اس لیے سر علی امام قومی اور سیاسی امور کی جانب متوجہ ہوئے اور بہت کچھ کیا۔ سر امام ہندو اور مسلم طبقوں میں مساوی طور پر ہر دل عزیز تھے۔ چنانچہ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔ ع

علی امام بھی ہیں ہندوں سے میل بھی ہے
خدا کی یاد بھی اور بتوں سے کھیل بھی ہے

نواب سر موید الملک علی امام بحیثیت صدر اعظم دو سال دس ماہ اور اٹھارہ یوم

---

[1] تاریخ عدالت آصفی صفحہ ۲۴
" منظر الکرام صفحہ ۱۲۸
" وقائع مرزا یار جنگ از سید منظر علی مطبوعہ ۱۳۴۲ف

برسرکار رہے۔

نواب سر فریدون الملک کی وزارت

سر علی امام کے استعفے کے بعد نواب سر فریدون الملک بتاریخ ۱۲۔ محرم ۱۳۴۱ھ کو صدر المہام مقرر کیے گئے۔ لیکن وہ بہ مشکل ایک سال اس خدمت پر فائز رہے۔ اور بتاریخ ۲۵۔ شعبان ۱۳۴۲ھ اس خدمت سے سبکدوش ہوئے اور قلم دان وزارت ولی الدولہ کے حوالہ کیا گیا۔

فریدون جی جمشید جی سر فریدون الملک بہادر۔ ڈاکٹر جمشید جی کے فرزند تھے۔ جو ماہ ستمبر سنہ ۱۸۴۹ء کو ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم علاقہ جالنہ میں حاصل کی پھر ابتدائی عمر ہی میں سررشتہ طباعت میں ملازمت اختیار کی۔ کچھ زمانہ محکمہ مال گزاری کی مختلف خدمتوں میں گزارا پھر وہ ضلع اورنگ آباد کے پہلے مہتمم بندوبست مقرر کیے گئے۔ مہتمم بندوبست کی اہم ذمہ داری کے لیے آپ کا انتخاب نواب محسن الملک نے کیا تھا۔ نواب سر سالار جنگ اول کے دور وزارت میں آپ نے صوبہ بمبئی کے اساس پر کارہائے بندوبست کا آغاز ضلع اورنگ آباد سے شروع کیا۔ ۱۲۹۴ ھ م ۱۲۸۷ ف میں آپ کو تمام ضلع اورنگ آباد کے جدید بندوبست کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اس کام میں آپ کو معتمد مال گزاری و ناظم بندوبست نواب محسن الملک کا پورا اعتماد اور تعاون حاصل ہوا۔ نواب فریدون جی کی مستعدی کا حال جب مدار المہام نواب سر سالار جنگ کو ہوا تو انھوں نے بہ نظر حوصلہ افزائی ایک طلائی گھڑی مع توڑا عنایت فرمائی آپ کی مزید حوصلہ افزائی کے لیے ملحقہ اضلاع بیڑ و پربھنی، جن کا رقبہ کم و بیش پندرہ ہزار مربع میل تھا جدید بندوبست قایم کرنے کے لیے آپ کو تفویض کیا گیا۔ فریدون جی نے بہ مشکل کام نو سال کے طویل عرصہ میں انجام دیا۔ علاقہ کی خوشحالی اور ریاست کی آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا۔ اس حسن خدمت کے صلہ میں ۱۸۸۳ء میں آپ کو ضلع اورنگ آباد کا اول تعلقدار مقرر کیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں فریدون جی کو ناظم بندوبست مقرر کیا گیا۔

۱۔ منتظر الکرام صفحہ ۱۹

تین ماہ کے بعد جدید مدارالمہام نواب میر لایق علی خاں سالار جنگ ثانی نے پرائیوٹ سکریٹری مدارالمہام کی اہم اور نازک خدمت کے لیے آپ کا تقرر فرمایا۔ معتمد خاص مدارالمہام کی خدمت آپ نے اس حسن خوبی کے ساتھ انجام دی کہ بعد کے مدارالمہام نواب سر آسمان جاہ نواب وقارالامرا۔ مہاراجہ کشن پرشاد اور نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث نے آپ کو اس خدمت پر قایم رکھنا ضروری سمجھا۔ سر مہاراجہ کشن پرشاد کے زمانہ وزارت میں آپ کی ذمہ داریوں میں دوگنا اضافہ ہوگیا۔ آپ مدارالمہام کے معتمد خاص کے علاوہ سرکار نظام کے پولیٹکل سکریٹری کے اہم فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

سر سالار جنگ ثالث کی سبکدوشی کے بعد جب ماہ نومبر سنہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک جب کہ میر عثمان علی خاں آصف سابع نے بہ نفس نفیس مدارالمہام کی ذمہ داری خود سنبھالی تو آپ حضور نظام کے پرائیوٹ سکریٹری رہے تحت فرمان شاہی آپ کے اختیارات میں توسیع کی گئی اور آپ عملی طور پر مدارالمہام کارگزار رہے۔ آپ کو مدارالمہام سیاسیات مقرر کیا گیا اور آپ اپنے وظیفہ تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔

سر علی امام کی صدارت میں جب باب حکومت کی تشکیل عمل میں آئی تو فریدون جی کو بحیثیت رکن باب حکومت (صدرالمہام) یعنی منسٹر مقرر کیا گیا سر علی امام کی یورپ کو روانگی کے بعد آپ کو منصرم صدر اعظم مقرر کیا گیا جب سر علی امام نے خدمت سے سبکدوشی حاصل کی تو حسب فرمان مورخہ ۱۲۔ محرم سنہ ۱۳۴۱ھ آپ کو صدر اعظم باب حکومت مقرر کیا گیا۔ آپ اس عہدہ پر سنہ ۱۳۴۲ھ تک فائز رہے۔

نواب سر فریدون الملک تقریباً چالیس سال تک ریاست حیدرآباد کی اہم خدمات پر مسلسل فائز رہے۔ ریاست حیدرآباد کے پہلے پارسی صدر اعظم ہونے کا اعزاز صرف نواب فریدون الملک ہی کو حاصل ہوا۔ نواب فریدون ملک کے تدبر اور فراست کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سر سالار جنگ اول آپ کو ابتدائی خدمت سے درجہ بہ درجہ ترقی دیتے رہے اور بہت جلد ریاست کی ذمہ دارانہ خدمت آپ کے حوالے کی گئیں۔ نواب سر سالار جنگ اول کے بعد کئی وزارتی طوفان آئے اور رزیڈنسی سے کئی تموج اٹھے۔ اس طوفان اور باد مخالف میں حیدرآباد کے کئی امرا اور عمایدین سوکھے پتوں کی طرح ادھر ادھر ہوگئے لیکن صرف تین شخصیتیں کسی نہ کسی طرح اپنے

وجود کو قایم رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔ یعنی نواب عماد الملک۔ کرنل سر افسر جنگ اور نواب فریدون الملک حضور نظام، نواب فریدون الملک کی دیانت داری راست بازی اور وفاداری کے متعرف تھے اور دوسری طرف رزیڈنسی اور گورنر جنرل اس بات سے مطمین تھے کہ حیدرآباد میں ایک مستعد شخص ان اہم خدمات پر فائز ہے وزارتوں کے اس بدلتے ہوئے دور میں، تمام حلقوں میں یکساں ہر دل عزیز ہونا اور سازشی گروہوں سے خود کو بچائے رکھنا ایک بہت مشکل کام تھا۔ آپ کے بنگلہ میں جو ایٹ ہوم دیے جاتے تھے وہ اس لیے خاص اہمیت رکھتے تھے کہ حیدرآباد کے مختلف فرقوں اور طبقوں کے لوگ یوروپین عہدہ دار ریاستی امرا اور عمایدین کے ساتھ مساویانہ طور پر ایک جگہ مل بیٹھتے تھے اور سب کے لیے دوستی اور خیرسگالی کے استوار کرنے کا یہ بہترین موقع ہوا کرتا تھا۔

نواب ولی الدولہ کی وزارت

نواب محمد ولی الدین خاں، نواب ولی الدولہ نواب سر وقار الامرا کے دوسرے فرزند تھے ۲۵ - شعبان سنہ ۱۳۴۲ھ کو نواب فریدون ملک سے آپ نے عہدہ صدر اعظمی کا جائزہ لیا۔ لیکن تین سال بعد ۱۷ - جمادی الاول سنہ ۱۳۴۵ھ م ۱۹۲۷ء کو اس عہدے کا جائزہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو دے دیا۔

نواب ولی الدولہ[۲] بتاریخ ۵ - ربیع الاول سنہ ۱۲۹۵ھ م ۱۸۷۸ء کو بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے خاندانی رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم قابل ہندوستانی اور یوروپین اساتذہ سے دیوڑھی پر دلوائی گئی۔ جب ان کی عمر گیارہ سال کی ہوئی تو ۸ - ذی قعدہ سنہ ۱۳۰۶ھ م ۱۸۸۹ء کو ماہر تعلیم ڈاکٹر لارڈ کے ہمراہ انگلستان روانہ کیا گیا۔ آپ ۱۳۱۸ھ تک اٹن میں تعلیم پاتے رہے۔ اس بارہ سالہ عرصہ میں آپ صرف ایک مرتبہ اپنے والدین سے ملاقات کے لیے حیدرآباد تشریف لائے۔ انگلستان میں قیام کے

---

۱ تاریخ عدالت آصفی صفحہ ۲۱۱

۲ سنہ الکرام ص ۲۳

دوران سروقار الامرا کے سیاسی رتبہ اور عزت کی بنا پر آپ کو انگلستان کی اعلا سوسائٹی سے ملنے جلنے کا کافی موقع ملا جو عموماً ہندوستانیوں کو ان دنوں میں حاصل نہ تھا۔ تعلیم کے بعد جب آپ وطن واپس ہوئے تو آپ کے حسب خواہش افواج سرکاری میں کمیشن دیا گیا۔ لارڈ کرزن گورنر جنرل کی خواہش پر آپ ڈیرہ ڈون کے فوجی کالج میں شریک ہوئے۔ نواب ولی الدولہ بہادر ہندوستان کے ان چار امیر زادوں میں شامل تھے جنھیں لارڈ کرزن کی سفارش پر دہرہ دون کے ملٹری کالج میں بحیثیت کمیشن یاب عہدہ داروں کے شریک کیا گیا تھا[1] اسی حیثیت سے آپ نے لارڈ کرزن کے طلب کردہ دہلی دربار میں شرکت کی۔

چار سال کے بعد آپ حیدرآباد تشریف لائے تو اولاً کمانڈر افواج سکندرآباد کے اسٹاف میں متعین کیا گیا۔ ماہ جمادی الاول ۱۳۲۵ھ میں آپ رسالہ دوم حیدرآباد امپیریل سروس کے کمانڈنگ افسر مقرر ہوئے[2]

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے دور حکومت میں بتاریخ ۲۹۔ شوال سنہ ۱۳۲۹ھ م ۲۳۔ آبان سنہ ۱۳۲۳ف آپ کو معین المہام افواج سرکار آصفیہ مقرر کیا گیا[3] اس عہدہ پر آپ ۱۲۔ مہر سنہ ۱۳۲۷ف تک فائز رہے۔ نواب فخر الملک بہادر کی سبکدوشی کے بعد آپ معین المہام عدالت کے عہدہ پر فائز کیے گئے۔ باب حکومت کی تشکیل کے بعد آپ رکن باب حکومت (یعنی منسٹر) صدر المہام عدالت مقرر کیے گئے۔ موسم گرما سنہ ۱۳۴۱ھ م ۱۳۳۲ف میں صدر اعظم نواب فریدون الملک نے طویل رخصت حاصل کی تو نواب صاحب کو نایب صدر اعظم کے منصب پر فائز کیا گیا۔ لیکن جب نواب فریدون الملک شعبان ۱۳۴۲ھ میں اپنی خدمت سے سبکدوش ہوئے تو نواب ولی الدولہ بہادر صدر اعظم باب حکومت مقرر ہوئے[4] آصف جاہ سابع

---

[1] منظر الکرام ص۲۴۲

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍

[3] ؍؍ ؍؍ ؍؍

[4] ؍؍ ؍؍ ؍؍

آپ پر ہمیشہ مہربان رہا کرتے تھے اور اپنی خوشنودی ظاہر کرنے کے لیے اکثر تلوار، چھڑیاں اور دیگر بیش قیمت اشیاء آپ کو عنایت فرماتے تھے۔ اولاً ولایت جنگ کا خطاب سنہ ۱۳۲۷ھ میں اور پھر ولی الدولہ کا خطاب ۱۳۴۱ھ میں عطا کیا گیا[1]

نواب ولی الدولہ جس زمانہ میں معین المہام افواج آصفیہ مقرر ہوئے اتفاقاً اس زمانہ میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس زمانہ میں آپ نے برٹش گورنمنٹ کے تحفظ کے لیے کئی فوجی انتظامات کیے۔ جب آپ صدر المہام عدالت مقرر ہوئے تو عدالتی نظام میں کئی دور رس تبدیلیاں کی گئیں۔ حکمانِ عدالت کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ اور ان کی تنخواہوں پر نظر ثانی کی گئی۔ اقتدار عاملانہ و عدالتی کی تفریق کی گئی[2] اور ان کا تعین کیا گیا۔ آپ ہی کے دور میں ٹپہ خانہ میں سیونگ بینک اور وی۔ پی اور منی آرڈر کا طریقہ رائج ہوا۔ محکمہ پولیس میں مفید اصلاحات کی گئیں اور تفتیش کے طریقہ میں آسانیاں پیدا کی گئیں جن سے جرائم کی روک تھام ہوئی۔

ملک کے تعلیمی نظام سے آپ کو ہمیشہ دلچسپی رہی۔ آپ کے دور وزارت میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی کوشش کی گئی۔ آپ یونیورسٹی کے چانسلر بنائے گئے۔ سنہ ۱۳۴۲ھ میں جب جامعہ عثمانیہ کی جانب سے نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کو سلطان العلوم ڈگری دیے جانے کا تصفیہ ہوا تو آپ نے یہ فریضہ بحیثیت امیر جامعہ انجام دیا[3] اس یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے پہلے کانوکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) بابتہ ۱۳۳۴ ف م ۱۳۴۴ھ کی صدارت کی۔

نواب ولی الدولہ کے دور وزارت میں برار کا مسئلہ

نواب ولی الدولہ کے دور وزارت میں مسئلہ برار کے تعلق سے حکومت نظام

---

[1] منظر الکرام ص۲۴

[2] " " ص۲۵

[3] " ص۲۵

اور وائسرائے گورنرجنرل کے درمیان جو مراسلت جاری رہی وہ اپنی دشوار سیاسی نوعیت کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب حالات پرسکون ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے بتاریخ ۲۵- اکتوبر ۱۹۲۳ء کو لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے نام ایک طویل خط لکھا جس میں دستاویزی شہادت کے حوالہ سے برار کی دستوری نوعیت اور حیدرآباد کے دعوے کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔ وائسرائے ہند نے کوئی ڈیڑھ سال تک اس خط کا کوئی جواب روانہ نہیں کیا شدید اصرار اور توجہ دہانی کے بعد وائسرائے نے جواب دیا کہ" سنہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے والی ریاست حیدرآباد سے جو معاہدہ طے کیا تھا اس کے بعد اب اس مسئلہ پر دوبارہ غور نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا برار کی تفویض دائمی ہے اور برطانوی حکومت کے خیال میں استرداد برار کا آیندہ کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔"

اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع نے ۲۰- ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء کو اس مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ" برطانوی حکومت اور سرکار نظام کی دو حلیف " کی ہے۔ اس لیے کسی ایک فریق کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ گفت وشنید کے دوران کسی مسئلہ کے متعلق قطعی فیصلہ کر سکے۔ حیدرآباد کے حکمراں اپنی ریاست کے داخلی امور میں ویسے ہی خود مختار ہیں جیسے کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں ہے۔ برار کا مسئلہ" دو حکومتوں" کے درمیان متنازعہ مسئلہ ہے اور ہر دو حکومت مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ جن میں کوئی کسی کا تابع نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت نے تجویز پیش کی کہ مسئلہ برار کو ایک کمیشن کے سپرد کیا جائے تاکہ وہ بعد تحقیقات رپورٹ پیش کر سکے اس کمیشن کا صدر کوئی ماہر قانون انگریز ہو جسے وزیر ہند نامزد کریں۔ اس کمیشن کے چھ اراکین ہوں۔ دو حکومت ہند کے دو حکومت نظام کے اور دو اہل برار کی جانب سے نامزد کیے جائیں۔ اس کمیشن کا پورا خرچ حکومت نظام کے ذمہ رہے گا۔

۲۷- مارچ سنہ ۱۹۲۶ء کو لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے اس خط کا جواب روانہ کیا کہ تاج برطانیہ کی سیادت ہندوستان میں سب سے برتر ہے اور اس بنا

پر کوئی والی ریاست برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مساویانہ طریق پر گفت وشنید کرنے کا دعوا کرنے میں حق بجانب نہیں ہے۔ تاج برطانیہ کی بالا دستی معاہدات اور تہہ نامہ جات ہی پر مبنی نہیں بلکہ وہ ان سے بے نیاز ہو کر بھی قایم ہے۔

۱۸۶۲ء میں دیگر والیان ریاست کی طرح فرمانروائے حیدرآباد کو بھی ایک سند دی گئی تھی جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ ان کے خاندان اور ان کی حفاظت کی بقا کی خواہش مند ہے۔ بہ شرطیکہ وہ تاج برطانیہ کے وفادار رہیں اور یہ کہ "مسند حیدرآباد" پر کسی کی جانشینی اس وقت تک جائز نہیں تصور کی جائے گی۔ تاوقتیکہ ہز مجسیٹی کی گورنمنٹ اس کو منظور نہ کرے۔ دیسی ریاستوں کے معاملات میں برٹش گورنمنٹ کا "حق مداخلت" بھی ایک مثال ہے جس سے تاج کی بالا دستی کا اظہار ہوتا ہے۔ ریاستوں میں داخلی اختیارات جس سے والیان ریاست فیض یاب ہو رہے ہیں۔ وہ بھی تاج برطانیہ کی محافظت اور قوت کے باعث انھیں حاصل ہے۔ حضور نظام کو جو یار وفادار کا خطاب حاصل ہے اس کا یہ اثر نہیں ہو سکتا کہ تاج برطانیہ کی سیادت میں جو دوسری ریاستیں ہیں ان کے مقابلہ میں نظام حیدرآباد کی حکومت کو کوئی جداگانہ حیثیت حاصل ہو۔

لارڈ ریڈینگ وائسرائے گورنر جنرل کے اس مراسلہ پر بابِ حکومت میں غور کیا گیا اور طے پایا کہ یہ تقاضائے مصلحت فی الحال اس مسئلہ پر "خاموشی" اختیار کی جائے تاآنکہ دوبارہ خط وکتابت کے لیے کوئی مناسب حالات پیدا نہ ہو جائیں۔

۱۰۔ شعبان سنہ ۱۳۵۲ھ م دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء کو وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن مع لیڈی صاحبہ وارد حیدرآباد ہوئے اور شاہی ضیافت کے موقعہ پر انھوں نے برار کے مسئلہ کے متعلق اطمینان بخش اعلان کیا۔ تیسرے دن حضور نظام نے ایک فرمان جاری کیا جو جریدہ غیر معمولی میں شائع کیا گیا۔

> "ہز اکسیلنسی وائسرائے بہادر نے اسٹیٹ بنکوٹ کے موقع پر جو اعلان فرمایا ہے، میں اس جدید انتظام سے متعلق اپنا اطمینان ظاہر کرتا ہوں جو سرکار عظمت مدار کے ساتھ حالیہ گفت وشنید کے نتیجہ کے طور پر ہندوستان میں وفاقی دستور قایم ہونے پر میرے ملک برار کا نظم و

نسق اس خطہ ملک معظم کے ساتھ جو بنام ممالک متوسط موسوم ہے
بہ شمل ایک صوبہ واحد کے ہوگا۔ جس کا نام ممالک متوسط برار رہے گا۔
برٹش گورنمنٹ اور میری گورنمنٹ دونوں کو امید ہے کہ ہندوستان
کا دستوری نشوونما بہ عجلت ممکنہ اعلان مذکور کی اجازت دے گا۔ تاکہ
معاہدہ طے شدہ سے مجھے جو اطمینان ہوا ہے اس میں رعایا بھی شریک
ہو سکے۔"

۱۹۳۶ء میں اعلیٰ حضرت دہلی تشریف لے گئے اور وائسرائے ہند سے اہم سیاسی امور پر بالمشافہ گفتگو کی اعلیٰ حضرت اور ہز مجسٹی ملک معظم کے مابین برار کے تعلق سے ایک معاہدہ ۲۴۔ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء کو طے پایا جس کی رو سے علاقہ برار پر اعلیٰ حضرت کے "شاہانہ حقوق" کو برطانوی حکومت نے تسلیم کر لیا۔[1]

خطاب

"ہز ہائی نس پرنس آف برار" کے اعلان کے لیے خریطہ دربار

۱۹۳۶ء م ۱۳۴۶ ف میں چو محلہ پیالس میں "خریطہ دربار" منعقد ہوا جس میں ملک معظم کی جانب سے ولی عہد حکومت نظام کے لیے "ہز ہائی نس پرنس آف برار" کے خطاب کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد آنریبل رزیڈنٹ نے بارگاہ خسروی میں خریطہ پیش کیا جس کو نواب مہدی یار جنگ نے دربار میں پڑھ کر سنایا۔

امیر النسأ بیگم (لیڈی ولی الدولہ)

نواب ولی الدولہ کی رفیقہ حیات امیر النسأ بیگم صاحبہ اپنی سوجھ بوجھ، دانش مندی اور سلیقہ شعاری کی بنا پر حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں خاص مقام رکھتی تھیں۔ امیر النسأ بیگم صاحبہ مولوی سید محمد یوسف الدین سابق صوبہ دار گلبرگہ کی صاحبزادی

ع[1] جشن کمیٹی نمبر رہبر دکن ۱۳۵۵ھ ص ۲۳

ع[2] مشیر عالم ڈائرکٹری مولفہ صمصام شیرازی ۱۳۴۹ف ص ۲۴۵

تھیں۔ آپ نے اردو فارسی اور انگریزی میں تعلیم حاصل کر کے ان زبانوں پر کافی مہارت حاصل کی۔ اپنی قابلیت کی بنا پر وہ سیاسی امور سے خاص دلچسپی رکھتی تھیں۔ حیدرآباد میں طبقہ نسواں کو جہالت سے نجات دلانے اور انھیں سوسائٹی میں ایک باوقار مقام دلانے کے لیے بیگم صاحبہ نے سرگرم حصّہ لیا۔ وہ اپنے شوہر کے اسٹیٹ سے متعلق کافی باخبر رہتی تھیں۔ اور بہ وقت ضرورت ایک مدبر مشیر کی حیثیت سے ان کی مدد فرماتی تھیں۔ وہ ایک جانب ریاست کے امور میں دلچسپی لے کر رزیڈنسی سے حکومتی تعلقات کو مستحکم بنانے کی کوشش کرتی تھیں تو دوسری طرف وہ ان غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کرتی تھیں جو غرض مند حاضرین دربار اپنے فائدہ کے لیے رزیڈنسی میں عملاً پھیلایا کرتے تھے۔ اس طرح لیڈی ولی الدولہ نے ریاست کے دشوار ترین حالات میں اہم خدمات انجام دیں۔ وہ طبقہ نسواں کے کئی اداروں کی صدر اور مشیر تھیں اور ان خدمات کے صلہ میں ۱۲۔ مئی ۱۹۲۷ء کو آپ کو برٹش میڈل عطا کیا گیا۔ آپ گورنمنٹ کے اعلا عہدوں پر فائز ہو سکتی تھیں۔ لیکن کچھ زمانہ کے رواج کے باعث اور پردہ کی پابندی نے آپ کو ہمیشہ مجبور رکھا لیڈی ولی الدولہ فن خطابت میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ آپ کی تقاریر اور خطبے جو آپ نے کئی تہذیبی اور علمی اداروں میں پڑھے تھے۔ آج بھی دعوت فکر دیتے ہیں: بلاشبہ لیڈی ولی الدولہ کا شمار اس وقت کی ان معزز خواتین میں کیا جاسکتا ہے جنھوں نے ہندوستانی عورتوں کی بیداری کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔
نواب ولی الدولہ بہادر کو آپ سے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئے۔
والی ریاست میر عثمان علی خاں ان صاحبزادوں اور صاحبزادیوں پر مہربان تھے اور ان کی تعلیم و تربیت کا بطور خاص خیال رکھتے تھے۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد کا دور وزارت اعظمیٰ

مہاراجہ سر کشن پرشاد نے بتاریخ ۲۰۔ جمادی الاول ۱۳۴۵ھ م نومبر سنہ ۱۹۲۶ء کو وزارت اعظمیٰ کی خدمت کا جائزہ حاصل کیا[1] مہاراجہ نے اس سے قبل خدمت

۱؎ مہاراجہ کشن پرشاد ص۱۹۱ و ص۲۵

مدار المہامی کا جائزہ نواب وقار الامرا سے حاصل کیا تھا اور کئی سال کے بعد صدارت اعظمی کا جائزہ بھی انھیں کے فرزند نواب ولی الدولہ سے حاصل کیا۔ مہاراجہ کا تقرر سہ سالہ مدت کے لیے کیا گیا تھا لیکن وہ ۲۹ ۔ ذالحجہ ۱۳۵۵ھ تک اس عہدہ پر فائز رہے[1]

۱۷۔ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء کو آپ نے معتمد پیشی کی حیثیت سے نواب مہدی نواز جنگ کو مامور کیا[2]

مہاراجہ کے دور وزارت میں حیدرآباد کے سیاسی حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں میں تحریک آزادی عروج پر تھی اور حیدرآباد کی پر سکون زندگی اس جدید طوفان کے اثرات سے بچ نہ سکی۔ مہاراجہ نے خود کو زمانہ کے مطابق بنا لیا۔ "انفرادی ذمہ داری" کے بجائے اجتماعی ذمہ داری باب حکومت پر عاید ہو گئی تھی۔ مجلس بلدیہ کا قیام عمل میں آیا۔ حیدرآباد میں سیمنٹ کی سڑکیں بنائی گئیں۔ سررشتہ امداد باہمی کی تنظیم کی گئی۔ ریلوے لائینوں کی توسیع کی گئی۔ ریلوے بس اور فضائی حمل و نقل کا طریقہ رائج ہوا۔ برار کا نیا معاہدہ ہوا۔ رزیڈنسی کا استرداد عمل میں آیا اور اس علاقہ کو سلطان بازار کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اسٹیٹ بنک کے قیام کی کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ گاؤں سدھار تحریک کی سرکاری محکموں کی جانب سے حوصلہ افزائی کی گئی۔ عہدہ صدر الصدور پر کوئی تقرر نہیں کیا گیا اور عہدہ مفتی کو ختم کر دیا گیا۔ شروط الخدمت جاگیری مواضعات شریک خالصہ کیے گئے۔ سرکاری ملازمین کے لیے کم سے کم امتحان میٹرک کی کامیابی کا لزوم عاید کیا گیا۔ توشہ خانہ عامرہ اور خیرات و میراث کا تعلق راست پیشی خسروی سے تھا برخواست کر کے محکمہ زر سے متعلق کر دیا گیا۔ سرکاری افواج کی تنظیم جدید کی گئی اور وظیفہ یاب ملازمین کی بیواؤں اور پسماندگان کے لیے وظیفہ کا طریقہ رایج کیا گیا۔ بڑے منصب داروں کو جو قرضوں کی وجہ سے پریشان تھے خوش حال ہو گئے۔ یہ اور ایسے کئی کارنامے ہیں جو مہاراجہ کے دور صدارت اعظمی میں انجام دیے گئے۔

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص۱۹۱

[2] " " " "

نواب مہدی نواز جنگ

مہاراجہ کشن پرشاد کے دور مدار المہامی میں مولوی سید عباس صاحب ان کے معتمد کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ جب مہاراجہ کا تقرر صدر اعظم کی حیثیت سے عمل میں آیا تو مہاراجہ نے اپنے سابق معتمد مولوی سید عباس صاحب کے فرزند جناب محمد مہدی صاحب (نواب مہدی نواز جنگ) کو معتمد باب حکومت کے اہم اور ذمہ دارانہ عہدہ پر مقرر کیا۔ نواب صاحب کا تعلق حیدرآباد کے بلند پایہ اور عالی مرتبہ خاندان سے تھا۔ آپ کے جد امجد سید محمد خاں موسوی الہ تھے جو آصف جاہ اول کے عہد میں سلطنت کے اکثر گراں قدر خدمات پر فائز تھے۔ منصب دار ہونے کے علاوہ ایک جرار سپاہی۔ اہل قلم اور عالی مقام شاعر تھے۔ جن کی تحریرات کے چند نسخے برٹش میوزیم، انڈیا آفس کی لائبریریوں میں موجود ہیں[1]

عہدہ صدارت اعظمی سے مہاراجہ کی سبکدوشی

مہاراجہ یمین السلطنت ۲۹۔ ذلحجہ ۱۳۵۵ھ م اپریل ۱۹۳۷ء صدارت اعظمی سے سبکدوش ہوئے مہاراجہ پیرانہ سالی کی بنا پر تھک گئے تھے۔ برٹش گورنمنٹ اور رزیڈنٹ کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد سر اکبر حیدری صدارت اعظمی کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہو جائیں اس لیے ۱۹۳۶ء میں جشن سلور جوبلی کے اختتام کے بعد مہاراجہ نے ضروری سمجھا کہ اس عہدہ سے سبکدوش ہو جائیں۔ لیکن اعزازی عہدہ پیشکاری مع لوازمات انھیں بدستور حاصل رہے۔

مہاراجہ کا اسٹیٹ زر و جواہرات کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اجداد کے جمع کردہ جواہرات راجہ نریندر پرشاد کے زمانہ میں تقسیم کر دیے گئے تھے[2]۔

---

[1] مشیر عالم ڈائرکٹری مولفہ صمصام شیرازی ص۳۰۴

[2] مہاراجہ کشن پرشاد ص۱۹۰

اپنی فیاضی اور علم پروری کی بنا پر مہاراجہ نے کبھی زر و جواہرات کا خیال نہ کیا۔ اور نہ اپنے خاندانی ذخیرہ میں اپنی جانب سے کچھ اضافہ کیا۔ انھیں تصاویر کا بڑا شوق تھا۔ سرکاری تقاریب کی تصاویر اور خود اپنی تصاویر مختلف لباس میں اتروایا کرتے تھے۔ اسی طرح مونوگرام کندہ کرانے کا انھیں بے حد شوق تھا۔ اپنے خطوط کے لیے نئے نئے مونوگرام چھپوایا کرتے تھے کرسمس کے موقعہ پر وہ انگریز اور ہندوستانی احباب کو خوبصورت کارڈس روانہ کرتے اور لفافہ پر مکتوب الیہ کا نام اور پتہ خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا کرتے تھے۔ مہاراجہ کو فونٹن پن جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اور اپنی خوشنودی کے اظہار کے لیے فونٹن پن اپنے دوست احباب کو بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔ آخری زمانہ میں رعشہ کی بنا پر وہ ایک بہت وزنی سیاہ فونٹن پن استعمال کیا کرتے تھے ابتداً سینما یا تھیٹر کا انھیں شوق نہیں تھا لیکن وزارت اعظمیٰ کے زمانہ میں جب انھیں اپنے محلات اور اولاد کا غم سہنا پڑا تو وہ وقت گزاری کے لیے رات گئے سینما یا تھیٹر جانے لگے۔ شب بیداری کو سہنے کے لیے انھوں نے مشاعروں کا طریقہ بھی ایوان شاہی میں رائج کیا۔ جو بڑی رات گئے تک جاری رہا کرتے تھے۔ شادی بیاہ میں شرکت کرنا ضروری سمجھتے تھے اور اس بات کا خیال نہ کرتے تھے کہ میزبان کی پوزیشن سوسائٹی میں کیا ہے۔ ایسے مواقع پر کوئی قیمتی تحفہ اپنی جانب سے ضرور بھیج دیا کرتے تھے۔ جب احباب کی مالی حالت کمزور ہوتی تو ان کی اعانت اس طرح کرتے کہ وہ شخص شرمندہ نہ ہو جائے۔ اہل غرض اور سائل کے اصرار پر وہ ناراض نہ ہوتے تھے۔ لیکن اکثر ناراضگی اپنے خانگی ملازمین پر ظاہر کیا کرتے تھے جو بعد میں بخشش و انعام سے سرفراز ہوتا تھا۔ خاص اصحاب اور احباب کے ساتھ وہ شطرنج چوسر اور تاش کھیلا کرتے تھے۔ آخری زمانہ میں برج بھی کھیل لیا کرتے تھے۔ تہوار خاص اہتمام سے مناتے اور ہولی کے موقعہ پر زیادہ بے تکلف رہا کرتے تھے لیکن آداب کا خیال وہ خود رکھتے اور شرکائے مجلس پر بھی نظر رکھا کرتے تھے۔ وہ تاسف ماضی، فکر امروز اور اندیشہ فردا سے بے نیاز تھے۔ انتقال سے کچھ دن قبل ان کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی پھر بائیں ہاتھ

میں درد شروع ہوا۔ مونڈھے کے جوڑ میں شدید تکلیف شروع ہوئی رفتہ رفتہ بخار شروع ہوا جو بڑھتے ہوئے ایک سو پانچ تک پہنچ گیا۔ ہچکیاں شروع ہوگئیں اور تنفس بڑھ چلا۔ ۸۔ تیر ۱۳۴۹ ف م ۳۔ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء روز دوشنبہ دن کے چار بجکر پانچ منٹ شام مہاراجہ نے انتقال کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۷ سال تھی۔ حضور نظام میر عثمان علی خاں انتقال کی اطلاع پاکر ایوان شاد تشریف لائے اور حسرت سے کہا:-

"افسوس پرانی بساط کا آخری مہرہ بھی اٹھ گیا۔"

مہاراجہ کی پہلی برسی کے موقع پر ان کے جانشین صدر اعظم سر اکبر حیدری نے دکن ریڈیو حیدرآباد سے قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:-

"وہ اپنے دل پذیر اخلاق اور قدیم آداب کی وجہ سے نہ صرف حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان میں ایک بے مثل شخصیت کے مالک تھے اور ــ آج حیدرآباد میں سب سے زیادہ جو کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہاں کی صحبتوں اور یہاں کی تقریبوں میں گذشتہ روایات کی زندہ کرنے والی اس ہستی کی غیر موجودگی ہے۔" [1]

جامعہ عثمانیہ کے سپوت اور اردو کے ممتاز شاعر سکندر علی وجد نے مہاراجہ کے انتقال پر کہا:-

قوم کہتی ہے تجھے غازی تفریق شکن"

مہاراجہ کشن پرشاد کی شاعری

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ ایک پرگو شاعر تھے۔ اپنی زندگی میں انھوں نے اپنے کلام کی کئی مجموعے شائع کیے جنھیں رباعیات شاد۔ خمکدہ رحمت موسوم بہ

---

[1] رسالہ "اطلاعات" شائع کردہ محکمہ اطلاعات حکومت حیدرآباد

[2] مرقع سخن شائع کردہ ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد
مہاراجہ کشن پرشاد ضمیمہ سوم شعر و سخن صہ ۳۴۹

ہدیۂ شاد۔ ترانۂ شاد۔ ضلع جگت۔ چند قابل ذکر کتابیں ہیں۔ ۱۳۲۷ھ میں حضور نظام میر محبوب علی خاں کی جانب سے شمشیر سپہ سالارگی عطا ہونے پر آپ نے عرض کیا۔

وہ صاحب دکن جو صاحب جوہر ہے
شوکت میں جم اقبال میں سکندر ہے
کی شاد کو شمشیر عطا ازرہ لطف
واللہ یہ شمشیر ظفر پیکر ہے

جب نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ نے آم بطور تحفہ روانہ فرمایا تو یہ رباعی عرض کی:۔

آموں سے سرفراز ہوا خانہ زاد
پھولو پھلو اے شاہ رہو تم آباد
سرسبز رہے یہ باغ آصف جاہی
اور شاہ کو ملتی ہے منھ مانگی مراد

جب نواب میر محبوب علی خاں نے دو گھڑیاں مرحمت فرمائیں تو یہ رباعی پیش کی:۔

گھڑیاں ہیں یہ وہ جن پہ دل جاں نثار ہے
ہے عمر کی گھڑیوں کا انہی پر تو مدار
آتی ہے گھڑی گھڑی زباں پہ یہ دعا
پل پل کی دیکھیں خوشی کی گھڑیاں سرکار

کلام کی شوخی اور بانکپن کا اظہار ذیل کے چند اشعار سے ہو سکتا ہے:۔

کیا خوب لطف ہو جو ہو موسم شراب کا
دلبر ہو بر میں ہاتھ میں ساغر شراب کا
اس وقت کوئی غیر نہیں ہے شب وصال
باقی کہاں ہے وصل میں موقع حجاب
وہ ولولہ نہیں وہ طبیعت نہیں رہی
پیری میں یاد آتا ہے عالم شباب کا

قیامت یوں بپا کی ہے انھوں نے آج محفل میں
میرے پہلو سے اٹھ کر متصل دشمن کے بیٹھے ہیں
کسی کی شامت آئے گی کسی کی جان جائے گی
بنا کر صبح سے زلفوں کو وہ بن ٹھن کے بیٹھے ہیں
اشارے غیر سے کرتے ہوئے چتون کے بیٹھے ہیں
تنی ہے تیغ ابرو قتل پر وہ تن کے بیٹھے ہیں

پھر دیا ہے اس نے آنے کا فریب
پھر امید زیست پیدا ہو گئی
آ گئی پیری - گیا عہد شباب
زندگی کیا چیز تھی کیا ہو گئی

اُٹھ گیا شیوۂ انسانیت انسانوں سے
لاکھ انسانوں میں بھی ایک نہ انسان نکلا
شادؔ کہتے ہیں جسے سب وہ ہے صوفی لامذہب
نہ وہ ہندو ہی رہا وہ نہ مسلماں نکلا

دیکھ کر حیرت کریں گے سب مسلماں شادؔ کو
جام ہو گا ہاتھ میں حوض کوثر سامنے

سر اکبر حیدری کا دور وزارت اعظمیٰ

سنہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۷ء تک نواب میر عثمان علی خاں ایک مقتدر اعلا اور مطلق العنان حکمراں کی حیثیت سے فرمارواں رہے۔ مطلق العنانی کے اس دور میں نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث۔ نواب ولی الدولہ اور مہاراجہ کشن پرشاد

بہ حیثیت مدارالمہام برسرخدمت رہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع نے بڑے اہتمام اور طمطراق کے ساتھ اپنے پچیس سالہ عہد کی سلور جوبلی (جشن سیمین) منایا۔ اس جشن کے ایک سال بعد ۱۹۳۷ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت نے انگریز حکومت کے حسب الحکم استعفیٰ پیش کیا اور سراکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ نے صدارت عظمیٰ کا جائزہ حاصل کیا۔ سراکبر حیدری ایک ماہر نظم و نسق تھے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۰ء کے عرصہ کے لیے ان کی خدمات حکومت نظام کے تحت دی گئیں۔ نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم نے آپ کا تقرر بحیثیت صدر محاسب حیدرآباد فرمایا۔ دو سال صدر محاسب کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد آپ معتمد زر بنا دیے گئے۔ اور اس عہدہ پر سنہ ۱۹۱۱ء تک فائز رہے اس کے بعد وہ سرکار عالی کے معتمد محکمہ جات عدالت۔ تعلیمات۔ کوتوالی۔ امور مذہبی مقرر ہوئے آٹھ سال بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں کچھ عرصہ انھوں نے صدر ناظم اور معتمد محکمہ صنعت و تجارت کی حیثیت سے کام کیا اس کے بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں بمبئی کے صدر محاسب کی حیثیت سے برطانوی ہند واپس ہوگئے لیکن یہ وقفہ مختصر رہا اور سنہ ۱۹۲۱ء میں وہ پھر حیدرآباد آئے اور بحیثیت مدارالمہام (وزیر مالیات و ریلوے سر ریجینالڈ گلینسی کے جانشین ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں قرضہ امداد باہمی اور معدنیات کے قلم دان وزارت بھی ان کے تفویض کر دیے گئے اور سترہ سال سے زیادہ مدت تک وہ اس عہدہ پر نمایاں کامیابی کے ساتھ فائز رہے۔ اپریل سنہ ۱۹۳۷ء میں سر مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت کی سبکدوشی کے بعد باب حکومت کی صدارت اعظمیٰ کے جلیل القدر خدمت پر فائز ہوئے۔ اگست سنہ ۱۹۴۱ء میں گورنر جنرل ہندوستان کی مجلس عاملہ میں بحیثیت وزیر اطلاعات نامزد کیے گئے اور اس طور پر یہ چھتیس سال تک ریاست کے مختلف عہدوں پر کارگزار رہنے کے بعد حیدرآباد سے رخصت ہوئے۔ سراکبر حیدری کو الوداع کہنے کے لیے باب حکومت کی جانب سے جو ڈنر ترتیب دیا گیا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے نواب مہدی یار جنگ جو اُس وقت صدرالمہام (وزیر) مالیات و تعلیمات کے

حیثیت سے کارگزار تھے فرمایا :-

"حیدرآباد آج جو کچھ ہے وہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے غیر معمولی قابلیت کا انحصار ایک حصہ فطری ذہانت پر اور تین حصے ذاتی مشقت پر ہے اور سر اکبر سخت محنت کرنے اور صبر کے ساتھ تفصیلات کا مطالعہ کرنے میں دوسروں کے لیے ہمیشہ ایک قابل تقلید مثال پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ ایک مدبر کے تخیل اور تخلیقی قوت کے بھی حامل ہیں اور انھیں اوصاف کا نتیجہ ہے کہ ان کی بدولت اس ملک کی ترقی میں اس قدر مدد ملی کہ آج حیدرآباد کو ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔"

حیدرآبادی طلباء کو وظائف عطا کرنے کے طریقہ کی تنظیم اور حیدرآباد سول سروس کی تشکیل میں سر اکبر حیدری کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ یہ دونوں تجاویز سر اکبر نے حیدرآباد آنے کے چند ہی روز بعد پیش کی تھیں۔ بہ حیثیت معتمد محکمہ جات عدالت وامور عامہ انھوں نے وہ یادداشت تیار کی جس کے مطابق جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کو سر اکبر نے حکومت سے منظور کرایا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام

نواب میر محبوب علی خاں کے ابتدائی دور میں قیام یونیورسٹی کی تجویز اولاً اس جلسہ میں پیش کی گئی تھی جس کی صدارت نواب سر سالار جنگ اول کر رہے تھے۔ حاضرین نے تجویز پیش کی کہ "نظام یونیورسٹی" کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ لیکن یہ جوش وخروش جلسہ کے اختتام کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔

سر وقارالامرا نے اپنے دور وزارت میں نظام یونیورسٹی کی تجویز ایک ایسے جلسہ میں دہرائی جس کی صدارت نواب میر محبوب علی خاں کر رہے تھے۔ مگر اس تجویز کو کسی نے قابل غور تصور نہ کیا۔

نواب میر عثمان علی خاں کے دور میں ایک بار سر اکبر حیدری اورنگ آباد آئے

مولوی عبدالحق نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سر اکبر حیدری کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کیا اور خود "مروجہ تعلیم اور طریقہ تعلیم" کے عنوان پر تقریر کی سر اکبر حیدری اس تقریر سے بے حد متاثر ہوئے۔ سر اکبر نے جلسہ میں کہا کہ قیام یونیورسٹی کی تجویز وہ خود پیش نہیں کر سکتے۔ البتہ ان کے سامنے یہ تحریک پیش ہو تو وہ کارروائی کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مولوی حمید الدین پرنسپل دارالعلوم کے توسط سے قیام یونیورسٹی کی ایک تجویز سر اکبر حیدری کے پاس روانہ کی گئی جو وزیر تعلیمات بھی تھے۔ یہ عرض داشت اعلیٰ حضرت کے ملاحظہ میں پیش کی گئی۔ اس عرض داشت پر آصف جاہ سابع کا ایک فرمان جاری ہوا کہ

" ممالک محروسہ کے لیے حیدرآباد میں یونیورسٹی قایم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام عثمانیہ یونیورسٹی رکھا جائے۔"

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس یونیورسٹی کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ لیکن وہ جائزہ لینے کے لیے حیدرآباد آنے سے قبل انتقال کر گئے۔ عارضی طور پر سر راس مسعود (نواب مسعود جنگ) اور نواب مہدی یار جنگ نے صدارت کے فرائض کچھ عرصہ تک انجام دیے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی دو سال تک صدر رہے۔ بعد ازاں پروفیسر عبدالرحمٰن خان نے صدارت کا جائزہ حاصل کیا۔ قاضی محمد حسین جامعہ عثمانیہ کے سب سے ہر دل عزیز وائس چانسلر ہوئے ہیں۔ آپ کا ایک جملہ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور طالب علم کسی اچھے شعر کی طرح ہمیشہ دہرایا کرتے تھے۔

یعنی :۔" علم سرزمین جامعہ عثمانیہ پر آزاد ہوا ــــ عام ہوا" سر اکبر حیدری نے محکمہ آثار قدیمہ کے قیام اور ریاست کی تاریخی یادگاروں بالخصوص ایلورہ اور اجنتا کے تحفظ میں بھی نمایاں دلچسپی لی۔ چنانچہ والیان ریاست کے چانسلر ہز ہائی نس جام صاحب نا ونگر نے سر اکبر کے ان دونوں کارناموں کی اہمیت پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ دونوں کام حیدرآباد میں سر اکبر کی خدمات کی دائمی یادگار رہیں گے۔ آپ کے دور وزارت میں قحط جیسے مسائل کو حل کرنے کے لیے بڑی بڑی رقموں کے" مدات محفوظ" قایم کیے گئے اور ریاست میں صنعتی جدوجہد کی سرپرستی کے لیے ایک کروڑ روپے سے ایک انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ

قایم کیا گیا نظام اسٹیٹ ریلوے کی خریدی سے تیرہ ہزار میل مجموعی طول کی ریلوے جو کہ ایک کمپنی کی ملکیت تھی سرکار عالی کے قبضہ میں آگئی اور یہ خریدی ، ریلوے کے مد محفوظ میں معقول رقم جمع ہونے کے علاوہ سرکاری آمدنی کا بھی ایک کامیاب ذریعہ ثابت ہوئی ۔ ریلوے کے انتظام میں نمایاں اصلاح و ترقی ہوئی اور اسے شارعی نقل و حمل اور طیارہ رانی سے مربوط کر دیا گیا ۔ علاقہ رزیڈنسی کی واپسی اور سنہ ۱۹۳۶ء میں عہد نامہ برار کی ترتیب میں انھوں نے کافی حصہ لیا ۔ ریاست میں دستوری اصلاحات کی اسکیم سر اکبر حیدری کے دورِ وزارت میں پیش ہوئی ۔ حیدرآباد میں اسٹیٹ بینک کے قیام کی تجویز بھی سر اکبر حیدری نے پیش کی تھی ۔ سنہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء کے تین سال عرصہ میں لندن میں گول میز کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے ان اجلاسوں میں ریاست حیدرآباد کی جانب سے سر اکبر حیدری کو حضور نظام نے اپنا نمایندہ نامزد کیا ۔ سر امین جنگ اور نواب مہدی یار جنگ سر اکبر حیدری کے مشیر مقرر کیے گئے ۔

حیدرآباد میں " سیاسی " بے چینی کی ابتدا

بحیثیت مجموعی سر اکبر حیدری کا زمانۂ صدارت عظمیٰ ۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد کے عہد وزارت کی طرح پر امن نہیں تھا ۔ سیاسی افق پر چند جماعتیں جن میں آریہ سماج ، اسٹیٹ کانگریس اور مجلس اتحاد المسلمین قابل ذکر ہیں ۔ اپنا اپنا مقام پیدا کر رہی تھیں ۔ ملکی اور غیر ملکی احساسات تیز ہو رہے تھے ۔ اور اسکیم اصلاحات پر عام بے چینی پیدا ہوگئی تھی ۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں بندے ماترم اسٹرائک شروع ہوئی اور ہندو طلبا کی اکثریت نے یونیورسٹی کو چھوڑ دیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کے بچے کچے طلبا نے ریلوے انتظامیہ کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کیا ۔ اور صدر اعظم کے سرکاری قیام گاہ دلکشا پر حملہ کیا ۔ سر صدر اعظم کے ڈائننگ ہال تک پہنچ گئے ۔ ایوان وزارت پر حملہ کا یہ پہلا واقعہ تھا جس سے وقارِ حکومت مجروح ہوا ۔ سر اکبر حیدری کے دور وزارت میں ملکی اصحاب خود کو حکومتی سرگرمیوں سے غیر متعلق خیال کرتے تھے ۔ سر اکبر حیدری عام طور پر انگریز حکمرانوں کے بڑے

طرفدار و حامی خیال کیے جاتے تھے۔ ان کے اطراف عموماً غیر ملکی انگریزی داں اصحاب نظر آتے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ سر اکبر اپنے ایوان وزارت میں عہدہ داروں کی "حاضری" اور "دربارداری" کے متمنی رہا کرتے تھے۔ حیدرآبادی عہدہ دار اس حاضری اور دربارداری کو اپنی خودداری کے منافی خیال کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حیدرآبادی عہدہ دار صدر اعظم سے دور ہوتے گئے ان کی ترقی رک گئی اور ملکی عہدہ داروں کے اثرات کمزور پڑ گئے ان عہدہ داروں میں قابل ذکر جناب سید محمد اعظم بھی ہیں جو ایک طویل عرصہ تک انٹرمیڈیٹ کالج (سٹی کالج) کے پرنسپل رہے سر اکبر حیدری کے زمانہ میں انھیں کوئی ترقی نہ مل سکی۔ سر اکبر حیدری کی سبکدوشی کے فوری بعد سید محمد اعظم ناظم تعلیمات پھر وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد نہ صرف وزیر تعلیمات بنائے گئے بلکہ "اعظم جنگ" کے خطاب سے بھی سرفراز کیے گئے۔ یہ وہ حالات تھی جن کی بنا پر ملکی اصحاب میں بددلی پیدا ہوگئی تھی۔

ملکی تحریک

دکن میں ملکی اور غیر ملکی کے تنازعات کا سلسلہ بہمنی دور سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ وزیر سلطنت محمود گاوان کا قتل بھی اسی سازش کا نتیجہ تھا۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی، سلطنت بہمنی کے زوال کے اسباب یوں بیان کرتے ہیں:۔

> "ملک کی آبادی دو مخالف فرقوں میں بٹ گئی تھی جو دکنی اور غیر دکنی کہلاتے تھے اول الذکر تو سلطنت بہمنی کے معمار "امرائے صدہ" کی اولاد تھے جو اپنے کو دکن کا حقیقی وارث سمجھتے تھے کیوں کہ انھیں کے آباؤاجداد نے دکن کو اپنا گھر بنایا اور بہمنی سلطنت کو سنوارا تھا۔ آخرالذکر طبقہ ترک و ایرانی افراد کا تھا جو نووارد تھے اور جو حکومت کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھاکر چپکے چپکے سلطنت پر چھا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں طبقوں میں رقابت پیدا ہوگئی جو بالآخر بہت شدید ہوگئی اس سے ملک

۱۔ تاریخ گولکنڈہ از پروفیسر عبدالمجید صدیقی ص۱۱

کو بہت نقصان پہنچنے لگا۔ اس کش مکش کا پہلا منظر علاؤالدین ثانی کے عہد میں اور دوسرا منظر محمد شاہ لشکر کے عہد میں سامنے آیا۔ جب کہ خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ خلف حسن بصری اور محمود گاوان اسی کش مکش کے شکار ہوئے۔"

(تاریخ گولکنڈہ ص۱۱)

اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں قطب شاہی سلطنت بھی قایم ہوئی۔ بانی سلطنت سلطان قلی کو نوواردوں کے ساتھ خاص ہمدردی اور اہل ملک کے ساتھ رقابت نہ تھی۔[1]

چنانچہ قطب شاہی دور میں بھی مسلمان دو طبقوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک تاجر پیشہ طبقہ تھا جو اندرون ملک اور بندرگاہوں میں مغربی اقوام کے ساتھ تجارت کرتا تھا۔ یہ طبقہ بہت خوشحال اور مالدار تھا۔ یہ تاجر عموماً ایرانی تھے جو سود پر روپیہ کا لین دین بھی کرتے تھے۔[2] مسلمانوں کا دوسرا طبقہ سرکاری نوکری پر گزر بسر کرتا تھا ان کا ذریعہ معاش ناپائیدار تھا۔ ہندو آبادی میں ملازم پیشہ و تاجر دونوں شامل تھے۔ سلطنت کی مقامی حکومت اور دیہی نظم و نسق سب انھیں کے ہاتھ میں تھا اضلاع کے کلکٹر اور تمام تاجر جو اضلاع ٹھیکے پر لیتے تھے اور مالگزاری ادا کرتے تھے۔ سب ہندو تھے۔[3] تاجر اور کان کنی کے پیشے بھی ہندوؤں کے سپرد تھے اور حکومت کی جانب سے معدنوں کی نگرانی کے فرائض بھی وہ انجام دیتے تھے۔ ذیلی طبقے کے کاشتکار اور مزدور بے حد مفلس تھے اور اکثر دیہات ویران ہو گئے تھے۔[4]

قطب شاہی دور کے آخری زمانہ میں ملکی اور غیر ملکی کے اختلافات نقطۂ عروج پر پہنچ چکے تھے جس سے آخر کار گولکنڈہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

آصف جاہی عہد میں ابتداً یہ اثرات زور پکڑ نہ سکے۔ کیوں کہ آصف جاہ سلطنت

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو گولکنڈے کے تعلقات ص۸۰

[2] تاریخ گولکنڈہ ص۳۷۷

[3] " " ص۳۷۸

[4] " " ص۲۷۸

مغلیہ کے وارث اور نمایندے خیال کیے جاتے تھے۔ لیکن سر سالار جنگ کے عہد میں یہ احساسات شدت اختیار کر گئے۔ اس زمانہ میں غیر ملکیوں کو محکمہ عدالت وتعلیمات۔ طباعت اور عام نظم ونسق کے شعبوں میں دلچسپی تھی اور وہ ان شعبوں میں اپنا اور اپنے لواحقین کا تقرر چاہتے تھے۔ انھیں یہاں کی زراعت اور تجارت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دکن میں اورنگ آباد۔ گلبرگہ اور حیدرآباد میں پارچہ بانی کے کارخانے تھے لیکن غیر ملکیوں کو ان کارخانوں یا صنعتوں سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح سنگاریتی کے کوئلہ کی کان میں غیر ملکی کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر غیر ملکی حیدرآباد میں اپنی آمد کے بعد نہ صرف خود کو ملکی ثابت کرتا رہا بلکہ دوسرے تازہ واردوں کو غیر ملکی کہنے میں ہمیشہ پیش پیش رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ جو شخص حیدرآباد آیا ملکی بن گیا۔ کوئی غیر ملکی نہ رہا۔ حیدرآباد کو اپنا مسکن بنایا اور حیدرآبادی تہذیب وتکلفات کا رسیا بن گیا۔ ہر دور میں ملکی اور غیر ملکی رقابتیں محض سیاسی توڑ جوڑ کے لیے اہمیت پاتی رہیں۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حیدرآباد میں سر سالار جنگ اول جو بحیثیت مدارالمہام (دیوان) ریاست کے تمام سیاہ وسفید کے مقتدر سمجھے جاتے تھے اس بات کے خواہش مند تھے کہ جدید اصلاحات کے ذریعہ ریاست کے نظم ونسق کو جدید معیار کے بموجب ترتیب دیں۔ حیدرآباد میں تعلیم یافتہ افراد اور طبقہ امرأ کے اراکین سرکاری ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے اور سرکاری ملازمت کو اپنی "پوزیشن" کے منافی خیال کرتے تھے۔ اس لیے سرکاری عہدوں پر تقرر کے لیے مناسب افراد دستیاب نہیں ہو رہے تھے۔ ایسی صورت میں سر سالار جنگ نے کوشش کی کہ باہر کے افراد، خصوصاً یوپی اور صوبہ جات متحدہ (مدھیہ پردیش) کے افراد کو حیدرآباد میں ملازم رکھا جائے۔ ابتداً یہ خیال کیا گیا کہ باہر کے افراد کا تقرر عارضی رہے گا اور باہر کے ہر عہدہ دار کو صریحاً ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے عین ماتحت ملکی عہدہ دار کو اس طرح تربیت دیں اور تیار کریں کہ ان کی سبکدوشی، وظیفہ یا اور طور پر علاحدگی کے بعد اس ملکی عہدہ دار کو ان کا جانشین مقرر کیا جا سکے۔ لیکن سر سالار جنگ کی اس ہدایت پر فی الوقت عمل نہ ہو سکا۔ ملکی افراد کو عمداً نظر انداز کیا گیا اور کچھ ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ بیرونی افراد کے تقرر میں دن بہ دن اضافہ

ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ یہ ایک رواج بن گیا کہ ہر اعلا عہدہ پر صرف غیر ملکی فرد ہی کا انتخاب کیا جائے۔

حیدرآبادی عوام روزگار کی تلاش میں شمالی ہند یا جنوبی ہند کا سفر نہ کرتے تھے۔ ان کے سفر کی غرض صرف بنارس یا رامیشورم کی یاترا۔ علی گڈھ یا بنارس یونیورسٹی میں تعلیم یا پھر ہندوستان میں مقیم اپنے رشتہ داروں سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔

" ملکی تحریک" ابتداً ایک معاشی مسئلہ کے طور پر ابھری لیکن جلد ہی اس تحریک نے خودداری اور علاقائی وقار کی صورت اختیار کر لی۔ ملکیوں کا مطالبہ تھا کہ اس خاک وطن کی خدمت کا حق صرف ان کو حاصل ہے۔ حضور نظام اپنی رعایا پر "بالراست" حکومت کریں اور غیر ملکیوں کے توسط سے ان پر" بالواسطہ" حکومت نہ کریں۔ حضور نظام کے بہی خواہ ملکی عہدہ دار ہی ہو سکتے ہیں اس لیے حضور نظام غیر ملکیوں پر امور حکومت کو منحصر نہ رکھیں۔ جن کی وفاداری ملکیوں کی طرح غیر متزلزل نہیں ہے۔ ملکی اس بات کے مدعی تھے کہ امور حکومت میں سربرائے مملکت کو مشورہ دیں اور تعاون کریں۔ اس لیے حکومت کے اعلا سے ادنیٰ عہدوں پر صرف ملکی عہدہ دار مقرر کیے جائیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹس اور پھر بیرونی اسکالرشپس پر تعلیم پائے ہوئے دکنی اصحاب کی واپسی سے ملکی تحریک میں شدت پیدا ہوگئی۔

دکن کے ہندو مسلم طبقات اس تحریک میں متحد تھے۔ یہ تحریک ملکیوں کے مفاد کے لیے ضروری تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ کسی کے خلاف نہیں تھی۔ ملکی تحریک کے ذریعہ حضور نظام کو ریاست کا سربراہ تسلیم کیا گیا تھا اس لیے کسی خاص فرقے یا جماعت کی حکمرانی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ تحریک چوں کہ پائیگاہ، سمستان اور جاگیرات کے خلاف نہیں تھی اس لیے اس تحریک کو عام اور خاص کی تائید حاصل ہوتی رہی۔

جمعیت رعایا نظام

یہ وہ حالات تھے جن کے تحت جمعیت رعایا نظام کا قیام عمل میں آیا۔ اس جمعیت کے سرگرم اراکین کماری پدمجا نائیڈو۔ مولوی ابوالحسن سید علی شری بی

رام کشن راؤ ۔ بی ۔ بی شرما ۔ سید عابد حسین اور نواب بہادر یار جنگ تھے ۔اس جمعیت کے صدر نواب سر نظامت جنگ منتخب کیے گئے ۔

جمعیت کا پیش کردہ مجوزہ دستور حیدرآباد

جمعیت رعایائے نظام کی جانب سے حیدرآباد کا ایک دستوری منصوبہ پیش کیا گیا اس منصوبہ کے تحت نظام حیدرآباد، ریاست کے سربراہ مملکت قرار دیے گئے ۔ نظام اپنے اختیارات مجلس مقننہ کو اس تحفظ کے ساتھ سپرد کریں گے کہ انھیں VETO حاصل رہے گا ۔ لیکن " حق تنسیخ " سے عام طور پر استفادہ نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ حالات کی بنا پر وہ ناگزیر نہ ہو جائے ۔ ایوان بالا جو " کونسل آف اسٹیٹ " کے نام سے موسوم ہوگا اس کے اراکین کی تعداد پچاس رہے گی اور ایوان زیریں کے ایک سو اراکین ہوں گے ۔

طریق کار ۔ اختیارات اور فرائض

" ایوان بالا " کے صدر نشین صدر اعظم باب حکومت ہوں گے ۔ اور " ایوان زیریں " کی صدارت صدر المہام سیاسیات کے ذمہ رہے گی ۔ اراکین کا ہر پانچ سال کے بعد انتخاب کیا جائے گا ۔ جو عموماً ماہ امرداد (ماہ جون) میں ہوا کریں گے ۔ موازنہ (بجٹ) ماہ مہر (ماہ اگست) میں پیش اور منظور کیا جائے گا ایوان کا دوسرا اجلاس ماہ فروردی (فروری) میں منعقد ہوگا ۔ جس میں قوانین کے مسودات پر غور کیا جائے گا ۔ ایوان بالا اور ایوان زیریں کے اختیارات اور فرائض وہی ہوں گے جو برطانیہ کی پارلیمان میں رائج ہیں ۔ ایوان زیریں کو تمام امور پر غور کرنے کا حق ہوگا ۔ مجلس مقننہ کا شعبہ صدر المہام (وزیر) سیاسیات کے تحت کام کرے گا ۔ ایوان بالا کا معتمد لازمی طور پر معتمد سیاسیات ہوگا ۔ جو ایوان بالا کا رکن بھی ہوگا ۔ اسی طرح ایوان زیریں کا معتمد محکمہ سیاسیات کا انڈر سکریٹری ہوگا جو اس ایوان کا رکن بھی رہے گا ۔ دونوں ایوانات میں صحافت کو شرکت کا حق رہے گا ۔ موازنہ کو تمام مدات پر بجز حضور نظام کو اداشدنی پیش کش کی رقم کے ہر دو ایوان میں غور کیا جائے گا ۔ ان تمام امور کے

متعلق جن کا تعلق جاگیرداروں سے ہو، یا دو اکثریتی فرقوں سے ہو اس وقت تک قطعی طور پر طے نہ پاسکیں گے۔ جب تک کہ انھیں فرقوں کے اراکین کی دو تہائی اکثریت اس تصفیہ کی حمایت نہ کرے اور جس کی فرمان مبارک کے ذریعہ توثیق نہ کی جائے۔

دیہات میں مسلمان چوں کہ پسماندہ حالت میں ہیں اس لیے باہمی طور پر طے کیا گیا کہ ۴۵ نشستیں مسلمانوں کے لیے مختص رہے گی۔ یہ الفاظ دیگر منجملہ ۳۶ دیہی اراکین کے اگر ۱۶ اراکین اس طور پر منتخب ہو جائیں کہ ہر ضلع سے ایک مسلم رکن منتخب ہو سکے تو وہ اس قاعدہ کی پابندی کے لیے کافی ہوگا۔ جمعیت کی رائے میں دیہی مسلم اراکین کے لیے یہ تحفظ تحریری طور پر دیا جانا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بطور "رواج" اس عمل کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

ملکی تحریک اور جمعیت کے متعلق اعتراضات

ملکی تحریک کے خلاف عموماً جمعیت رعایا نظام کے خلاف خصوصاً یہ اعتراضات کیے گئے کہ (۱) یہ تحریک تنگ نظری پر مبنی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کردیا جائے۔ (۲) دراصل یہ تحریک برطانوی حکومت کے خلاف تھی۔ (۳) اس تحریک کا منشا اور مقصد صرف یہ ہے کہ ریاست میں عہدہ اور ملازمت حاصل کی جائے (۴) یہ تحریک حضور نظام کے ایک فرمان کی بنا پر جاری کی گئی ہے جس کے ذریعہ ایک تقریر پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا تھا۔ اگر وہ فرمان حضور نظام منسوخ کر دیں تو یہ تحریک خود بہ خود ختم ہو جائے گی۔ (۵) یہ تحریک ہندو مہا سبھا کی جاری کردہ ہے جس کے ذریعہ ریاست میں اکثریتی طبقہ کی حکمرانی قایم ہو سکتی ہے یا پھر یہ تحریک ان انتہا پسند مسلم ملکیوں کی ہے جو اپنے مفادات کو ریاست میں زیادہ سے زیادہ مستحکم بنانا چاہتے ہیں۔ (۶) اس تحریک کے روح رواں وہ کنٹراکٹر اور راجارہ دار ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر غیر ملکیوں کو ریاست میں مفلوج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ (۷) یہ تحریک ایک غیر مناسب وقت پر شروع کی گئی ہے۔ ایسے زمانہ میں جب کہ ہندوستان میں مقامی طرز حکومت

کورائج کرنے کی کوشش جاری ہے۔حیدرآباد کے ملکی شتر مرغ کی طرح اپنی گردن کو زمین میں چھپائے ہوئے ہیں۔اور اس خیال میں مگن ہیں کہ وہی اس علاقے کے مالک ہیں۔(۸) اگر اس تحریک کو پھیلایا گیا تو اس کے مضر اثرات سے پورا ملک متاثر ہوگا۔(۹) اس تحریک کے ایک دو لیڈر اگر سرکاری عہدوں پر فائز کر دیے جائیں تو یہ تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔

ملکی تحریک کے حامیوں کی وضاحت

اِن تمام اعتراضات کے جواب میں ملکی تحریک کے حامیوں کا خیال تھا کہ وفاقی ہندوستان کی تشکیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر علاقے کے عوام کو مساوی طور پر زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے مواقع حاصل رہیں۔ہندوستان میں ہر صوبہ کی خود مختاری کے لیے تحریکیں چل رہی ہیں اس لیے دکنیوں کو اس حق سے کیوں محروم رکھا جائے۔ملکیوں کو اس تحریک کے ذریعہ اس بات کا موقع ملے گا کہ وہ اپنے معیار کو ہند کے دیگر باشندوں کے برابر ترقی دیں۔جس سے نئے وفاق کو زیادہ استحکام حاصل ہوگا۔ان کے خیال میں ملکی تحریک کے مخالف ہند کی نئی وفاقی حکومت کے خیر خواہ نہیں ہیں حکومت ہند میں کئی کمیشنوں کی سفارش پر ملازمین کو علاقائی اساس پر محفوظ کرنے کے اقدامات کیے ہیں۔ تو پھر حیدرآباد کو اس اصول سے کیوں خارج کیا جائے۔میسور اور دوسری ریاستوں میں علاقائی ملازمت کا تحفظ اچھے نتائج کا باعث ہوا ہے۔ ایک "نعمت" ایک کے حق میں نعمت اور دوسرے کے حق میں زہر کیسے بن سکتی ہے ملکی تحریک حیدرآبادی عوام کے مفادات کے لیے ہے اس لیے یہ کہنا کہ یہ تحریک انگریز حکومت کے خلاف ہے۔دوسرے معنوں میں یہ مفہوم رکھتا ہے کہ انگریز حکومت حیدرآبادیوں کے خلاف ہے۔یہ ایک بدترین الزام ہے جو انگریز حکومت کے خلاف عائد کیا جا سکتا ہے۔انگریز قوم قانون اور دستور کی پابند ہوا کرتی ہے۔ اس لیے ان پر ایسی تہمت لگانا صریحاً زیادتی ہوگی۔یہ تحریک چند قائدین کی جانب سے شروع نہیں ہوئی بلکہ اس تحریک نے قائدین کو بنایا ہے۔اس لیے

اس تحریک کے ختم ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ملکی تحریک" عوام کی بے چینی اور معاشی عدم استحکام کی بنا پر شروع ہوئی ہے اس لیے یہ تحریک اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ عوام کی بے چینی دور نہ ہو جائے چند کارکنوں کو ملازمت میں شریک کرنے یا نظر بند کرنے سے یہ تحریک ختم نہ ہوگی بلکہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ وہ مقاصد حاصل نہ ہو جائیں جس کے لیے عوام خود فکرمند اور بے چین ہیں۔

نواب سر نظامت جنگ۔ نواب بہادر یار جنگ۔ کماری پدمجا نائیڈو اور مولوی ابوالحسن سید علی وغیرہ کی یہ کوشش کچھ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکی۔ بہت جلد" فرقہ واری احساسات" دکنی قومیت پر حاوی ہو گئے اور ملکیوں کا اتحاد ختم ہو گیا۔

انجمن ترقی و اتحاد کا قیام

سنہ ۱۹۲۶ء میں حیدرآباد کے انتظامی انتشار کو مدنظر رکھ کر مرکزی حکومت نے ریاستی نظم و نسق پر اپنی گرفت اور مضبوط کر لی۔ حیدرآباد کے اہم انتظامی شعبہ جات یعنی مال۔ پولیس اور مصنوعات کے عہدوں پر برٹش آفسروں کو مقرر کیا گیا اور انگریز کو صدرالمہام (وزیر) کی حیثیت سے نظام کی اگزیکیوٹیو کونسل میں شریک کیا گیا۔ اس انتظام کے بعد نظام حیدرآباد کے بس میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ اپنی کونسل کے تصفیوں کو نظر انداز کر جائیں۔ یہاں تک کہ صدرالمہام کے تقرر کے لیے برٹش رزیڈنٹ کی پیشگی منظوری ضروری تھی۔ ان قابل افسوس شرائط پر حیدرآباد کے طلبا جو انگلستان میں مقیم تھے کافی برہم ہوئے۔ انھوں نے تصفیہ کیا کہ حیدرآباد واپس ہونے کے بعد رائے عامہ کو جمہوری نظام کے لیے تیار کیا جائے۔ چنانچہ کماری پدمجا نائیڈو۔ نواب اکبر علی خاں۔ باقر علی خاں، ایم نرسنگ راؤ بی۔ رام کشن راؤ۔ علی یاور جنگ۔ ماڈاپتی ہنمنت راؤ۔ ایم۔ ایچ۔ جعفری۔ فضل الرحمٰن وغیرہ نے" انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے ایک سیاسی ادارہ قایم کیا۔ یہ انجمن ذمہ دارانہ حکومت کی موید تھی اور

فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے اشخاص کو اس انجمن میں شرکت کی اجازت نہ تھی۔" انجمن اتحاد و ترقی" چند دنوں کی سرگرمی کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

دراصل حیدرآباد کے مسلم، اس زمانہ میں سیاست سے تقریباً بے تعلق تھے۔ البتہ ہندو طبقہ سیاست سے کچھ دلچسپی رکھتا تھا۔ چنانچہ وامن نائک ہندو طبقہ میں ایک گرم جوش سیاسی لیڈر تھے۔

حیدرآباد کے عوام یوں بھی سیاست سے دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ البتہ ملکی غیر ملکی تحریک میں ان کا " جوش " اور " جذبہ خودداری " بڑھ جاتا تھا انگریز حکومت کے زیر اثر کچھ بیرونی دباؤ کی وجہ سے ملکیوں کا اتحاد زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکا۔ اور فرقہ وارانہ تحریک و رجحانات کا آغاز ہوا۔ انہیں دستوری اصلاحات سے عام شکوک و شبہات بڑھ گئے اور ایک قابل افسوس فرقہ وارانہ فساد (فساد دھول پیٹھ) رونما ہوا۔ جس نے حیدرآباد کے روایتی ہندو مسلم اتحاد کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہندو مہاسبھا اسٹیٹ کانگریس اور آریہ سماج کی جانب سے ستیا گرہ شروع کی گئی لیکن مہاتما گاندھی کی ہدایت پر اسٹیٹ کانگریس نے اپنی تحریک سنہ ۱۹۳۹ء میں واپس لے لی۔ البتہ ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج کی تحریکیں ایک عرصہ تک جاری رہیں۔ ان تحریکوں کی وجہ سے ایک طرف تو ہندو قیادت تھک تھک کر کمزور ہوتی گئی اور دوسری طرف ریاست کا نظم و نسق درہم برہم ہوتا رہا۔ البتہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت مجلس اتحاد المسلمین آئندہ طوفان کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

آریہ پرتی ندھی سبھا کا قیام اغراض و مقاصد

حیدرآباد میں پہلی مرتبہ سیاسی سرگرمی آریہ سماج کی جانب سے شروع ہوئی۔ ایک تنظیم " آریہ پرتی ندھی سبھا نظام راجیہ " قایم کی گئی جس کا صدر دفتر بمقام اودگیر قایم کیا گیا اور اس کی شاخیں ریاست کے مختلف اضلاع میں قایم کی گئیں۔ شہر حیدرآباد کے مختلف محلوں میں اٹھارہ شاخیں قائم کی گئی تھیں۔ ہولی اور دسہرہ کے موقع پر آریہ سماج کے زبردست جلوس نکالے جاتے تھے۔ یہ جلوس اب بھی نکالے جا رہے ہیں۔ مختلف مواقع پر پنڈت رام چندر جی دہلوی۔ سوامی چیدانند جی۔ پنڈت

سوہن لعل جی کی تقاریر ہوا کرتی تھیں جس میں کثیر اجتماع ہوا کرتا تھا پنڈت نریندر جی کے اردگرد کئی نوجوان شب و روز سماج کے پرچار میں لگے رہتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک مشہور بیرسٹر شری ونایک راؤ ودیالنکار۔ آریہ سماج کی سرگرمیوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ آریہ سماج کی یہ سرگرمیاں کسی مذہبی مقصد کے لیے نہیں تھیں بلکہ ان کا منشا اور مقصد ریاست میں "ذمہ دارانہ حکومت" کا قیام تھا۔ تاکہ شاہی اختیارات اور اقتدار محدود ہو سکے۔ آریہ سماج کی جانب سے مختلف زبانوں میں کئی کتابیں شائع کی گئیں لیکن حکومت وقت کی جانب سے "امن و انتظام" کی خاطر ان کتابوں کی اشاعت پر پابندی لگادی گئی اور شائع شدہ کتابیں "بحق سرکار" ضبط کر لی گئیں۔

آریہ پرتی ندھی سبھا کی سرگرمیوں سے جو سیاسی فضا حیدرآباد میں پیدا ہو گئی تھی اس نے ہندو مہا سبھا اور بعد میں اسٹیٹ کانگریس کے قیام کے لیے راہیں ہموار کر دیں۔ کئی سیاسی اختلافات کے باوجود یہ ادارے حیدرآباد میں ذمہ دارانہ حکومت کے زبردست موئید و معاون بن گئے۔

حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس[1]

ریاست حیدرآباد کے جمہوریت پسند عوام، ہندوستانی علاقوں میں سیاسی بیداری اور جدوجہد آزادی کی تحریکوں سے برابر متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کے نام سے ایک سیاسی پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ۸۔ مہر سنہ ۱۳۴۷ ف کو اخبارات میں اسٹیٹ کانگریس کی جانب سے جو اعلان شائع ہوا تھا اس میں صریحاً کہا گیا تھا کہ "حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کا مقصد رعایاً ملک کا اعلیٰ حضرت بندگان عالی اور خانوادہ آصفی کے سایہ عاطفت میں ذمہ دارانہ حکومت حاصل کرنا ہے۔"

---

[1] تفصیلی واقعات کے لیے ملاحظہ فرمائیں
حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کی تاریخ
مرتبہ پنڈت جی۔ راما چاری (ایڈوکیٹ)

۲۔ "اس مقصد کے حصول کے لیے پرامن اور جائز طریقہ کار کو استعمال میں لایا جائے گا۔"

۳۔ عوام الناس میں قومی اتحاد اور خدمت قوم کا دلولہ پیدا کر کے انھیں، اخلاقی۔ اقتصادی اور ملک کے صنعتی ذرائع کو ترقی دینے اور ان کو منظم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کے قیام کے بعد لوگ بڑی تعداد میں اس کے ممبر بننے لگے۔ تقریباً سو یا سوا سو مسلم اراکین ممبر بن چکے تھے مقتدر عہدہ داروں نے اس جماعت کے تیزی کے ساتھ بڑھنے اور عوام میں بڑی قوت بن جانے کا رجحان دیکھا۔ ۶۔ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء صدر اعظم سر اکبر حیدری نے اپنی کونسل کے اراکین کے ساتھ اسٹیٹ کانگریس کے ذمہ دار کارکنوں سے گفتگو کی۔ دوسرے ہی دن یعنی ۷۔ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء کو تحت دفعہ ۱۳ دستورالعمل تحفظ امن عامہ اس جماعت کو فرقہ واری قرار دے کر انھیں خلاف قانون قرار دیا گیا۔ اس تعلق سے ایک اعلان حکومت کے جریدۂ غیر معمولی میں شائع کیا گیا۔ حکومت کی اس کارروائی کے خلاف اظہار ناراضگی کے طور پر عارضی کمیٹی نے ستیا گرہ کا اعلان کیا۔ ۲۴۔ستمبر ۱۹۳۸ء کو پنڈت گوبند راؤ نانل وکیل کی قیادت میں مسٹر جنار دھن راؤ ڈیسائی۔ شری رام کشن دھوت مسٹر آرنارائن ریڈی اور مسٹر سرینواس راؤ بورکیر نے ستیا گرہ کی اور ممنوعہ ادارہ کے قیام کا اعلان کیا۔ یہ ستیاگراہی گرفتار کیے گئے۔

اتفاقاً اسی زمانہ میں ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج کی جانب سے علاحدہ علاحدہ ستیاگرہ چل رہی تھی۔ مہاتما گاندھی نے ان فرقہ وارانہ جماعتوں کے ساتھ کانگریس کی جانب سے ستیاگرہ کو پسند نہیں کیا۔ اس لیے کانگریس کی جانب سے ستیاگرہ ملتوی کر دی گئی۔ لیکن کانگریسی ستیاگراہی ایک عرصہ تک جیلوں میں رہے حکومت نے آخر کار ۶۔خورداد سنہ ۱۳۴۸ف کو غیر مشروط طور پر کانگریسی ستیاگراہوں کو رہا کر دیا۔ لیکن حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس پر پابندی قایم رہی۔ حکومت نے پابندی اٹھانے کے لیے اولاً جماعت کے نام کی تبدیلی پر زور دیا۔ آخر کانگریسیوں نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اور جماعت کے لیے نیا نام ـــــــ "حیدرآباد نیشنل کانفرنس"

تجویز کیا۔ لیکن ارباب اقتدار نے چند مزید شرائط عائد کیں۔ یعنی یہ کہ

۱۔ اس ادارہ کے نام میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے مشابہت نہیں ہونی چاہیے۔

۲۔ جماعت کا الحاق بیرونی ملک کے کسی ادارہ سے نہ ہونا چاہیے۔

۳۔ جماعت کا عہدہ دار کوئی غیر ملکی نہ بنے۔

۴۔ جماعت ملک کے حکمراں سے شخصی اطاعت اور وفاداری رکھے۔

۵۔ جماعت کی رکنیت صرف ملکی اشخاص تک محدود رہے۔

۶۔ جماعت کی سرگرمیاں کلیتاً دستوری رہیں گی۔

شرائط اول و دوم کانگریس کے لیے قابل قبول نہ تھے۔ اس لیے حکومت سے طویل عرصہ تک مراسلت جاری رہی۔ دوسری عالمی جنگ کے چھڑ جانے کی بنا پر تنازعہ ختم نہ ہوا اور نواب چھتاری کے دور وزارت میں بھی جاری رہا۔ مسجد ڈچپلی کے سلسلہ میں جب مارچ سنہ ۱۹۴۲ء میں "شاہ منزل" پر حملہ ہوا تو حکومت، مجلس اتحاد المسلمین کی قیادت سے خائف ہو گئی ان حالات میں وہ ایک متوازی سیاسی جماعت کے وجود کو اپنے لیے مفید خیال کرنے لگے۔ ان حالات میں آٹھ سال کے طویل عرصہ کے بعد ماہ اپریل ۱۹۴۶ء کو حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس اور اس کی مجلس عمل پر سے پابندی اٹھا دی گئی۔

حیدرآباد کی اس بدلتی ہوئی فضا سے مسلمان بھی غیر متعلق نہ رہ سکے مسلمان عام طور پر جاگیری آمدنی سے سرشار اور منصب کے اعزاز میں مگن تھے صنعت و حرفت، زراعت اور دیگر آزاد پیشوں سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہ تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت سرکاری ملازمت میں مصروف تھی اور ان کا دائرہ فکر تنخواہ، گریڈ، سینیارٹی، دفتری مسائل، دفتری سازشوں اور حصول الاؤنس (ٹی۔اے) تک محدود تھا۔ لیکن جوں جوں ہندوستان میں خصوصاً اور پھر حیدرآباد میں عموماً سیاسی فکر اور مسائل پیدا ہوتے تو مسلمانوں نے سیاست اور قیادت کی جانب توجہ کی۔

مجلس اتحاد المسلمین

سب سے پہلے مولوی محمود نواز خاں نائب قلعدار۔ مولانا بندہ حسین مولوی حکیم مقصود علی اور مولانا صابر حسینی نے مسلمانوں کو ایک سیاسی مرکز پر متحد کرنے کی سعی کی۔ ۷۔ دے سنہ ۱۳۳۷ف کو مولوی محمود نواز خاں صاحب کے مکان واقع چوک اسپان میں مسلمانوں کا ایک جلسہ منعقد کیا گیا اور اس جلسہ میں "اتحاد بین المسلمین" کے نام سے ایک ادارہ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا[۲] ایک سال کے بعد ۹۔ دے سنہ ۱۳۳۸ف کے جلسہ میں لفظ "بین" کو حذف کر دیا گیا۔ اور ادارہ کا نام "مجلس اتحاد المسلمین" رکھا گیا[۳] اس ادارے کے مقاصد میں مسلمانوں کو بغرض تحفظ اسلام متحد متفق کرنا تعلیمی مقاصد کا فروغ اور تحفظ، قانون مروجہ کے احترام کے ساتھ ملک و مالک سے وفاداری چند اہم مقاصد تھے۔ مجلس کا افتتاحی اجلاس ۴۔ بہمن سنہ ۱۳۳۸ف بہ مقام توحید منزل بہ صدارت نواب صدر یار جنگ منعقد ہوا۔ اس کے بعد کئی اجلاس ہوئے جس میں انجمن کا دستور مرتب کیا گیا اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق قایم کرنے کے لیے ایک مہم شروع کی گئی۔ قانون سنہ ۱۹۳۵ء کے تحت برطانوی ہندوستان میں اکثریتی جماعت کی حکومتیں تشکیل دی گئیں۔ ۱۷۔ آبان سنہ ۱۳۴۶ف کو صدر اعظم باب حکومت نے مجلس وضع قوانین میں ایک تقریر کی جس سے یہ منشاء اخذ کیا گیا کہ حکومت اس آئین حکمرانی میں جو مدت دراز سے اس ریاست میں جاری تھا۔ مناسب تبدیلی کرنے کی خواہاں ہے۔ نواب سر اکبر حیدری صدر اعظم نے مشہور وکیل دیوان بہادر آرمدو آئینگار کی صدارت میں ایک اصلاحات کمیٹی کے

ع۱ دیگر تفصیلات کے لیے دیکھو

تاریخ اتحاد المسلمین مملکت اسلامیہ آصفیہ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۴۰ء

دار الاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین

ع۲ تاریخ اتحاد المسلمین ص۳۵

ع۳ 〃 〃 〃 〃

قیام کا اعلان بھی کیا۔ کمیٹی کے دیگر اراکین غلام محمود قریشی، پروفیسر قادر حسینی، کاشی ناتھ راؤ ویدیہ اور میر اکبر علی خاں تھے۔ اتحاد المسلمین کے قیادت کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ ہندوستانی ریاستوں کی طرح حیدرآباد میں بھی اکثریتی جماعت کی حکومت قایم کی جائے گی۔ ۱۲۔ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۶ھ کو مسلمانوں کا ایک جلسہ مولانا عبدالقدیر صدیقی (جو اس وقت صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ تھے) منعقد ہوا۔ مجلس کے دستور میں ترمیم کی گئی اور اغراض و مقاصد کے ضمن میں حسب ذیل سیاسی مسلک کا اضافہ کیا گیا۔

"مسلمانان مملکت آصفیہ کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہے کہ فرماں روائے ملک کی ذات اور تخت ان ہی کی جماعت کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے۔ اس بنا پر مملکت کی ہر دستوری ترمیم میں فرماں روا کے اقتدار شاہانہ کی بقا اور احترام مقدم رہے۔"[1]

مجلس اتحاد المسلمین کے قیام سے کوئی تو سال تک مولوی محمود نواز خاں مجلس کے معتمد رہے۔ دستور اور مقاصد میں ترمیم کے بعد خواجہ ابوالبیان خواجہ بہاء الدین صاحب معتمد اور نواب بہادر یار جنگ شریک معتمد مقرر کیے گئے۔ خواجہ بہاء الدین صاحب اپنی تجارتی مصروفیتوں کی وجہ سے مجلس کے کاروبار میں زیادہ وقت صرف نہ کر سکے۔ اس لیے شریک معتمد نواب بہادر یار جنگ نے سرگرمی کے ساتھ مجلس کے کاروبار اپنی نگرانی میں لے لیے۔ اضلاع کے دورے کیے گئے اور مجلس کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔ مجلس نے ہر جگہ دارالمطالعہ اور درسگاہیں اور چھوٹی چھوٹی تجارتی دوکانیں قایم کر کے اپنی شاخوں کا قیام عمل میں لایا۔ ان کو اور سرگرم عمل بنا دیا۔

دوسری جانب آریہ سماج و ہندو مہاسبھا اور اسٹیٹ کانگریس نے ریاست میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے مطالبہ میں شدت پیدا کر دی۔ عمل اور رد عمل کے اس دو طرفہ اشتعال انگریزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۳۴۸ ف

---

[1] تاریخ اتحاد المسلمین مملکت آصفیہ اسلامیہ ص۱۵

میں شہر حیدرآباد کے چند محلوں میں خطرناک فسادات پھوٹ پڑے ۔ یہ آگ گلبرگہ۔ اودگیر چٹگوپہ ۔ ہوپلہ ۔ کلیانی ۔ عثمان آباد ۔ نظام آباد اور پربھنی کے علاقوں میں بھی پھیل گئی فسادات کے بعد مجلس کے جانب سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے اراکین مولوی ابوالحسن سید علی ایڈوکیٹ اور نواب معین یار جنگ مقرر ہوئے ۔ جنھوں نے اپنے فرقہ کے نقصانات کی تفصیل تیار کی ۔ ان افسوس ناک حالات میں بتاریخ ۲۔ شوال سنہ ۱۳۵۷ھ مجلس کا ایک جلسہ مولوی ابوالحسن سید علی کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں نواب بہادر یار جنگ مجلس کے صدر اور مولوی ابوالحسن سید علی معتمد منتخب ہوئے ۔[1]

اس تنظیم جدید کے بعد مجلس کے عہدہ داروں نے اس بات کی کوشش کی کہ حیدرآبادی سیاست سے ہندوستانی مسلمانوں کو واقف کرایا جائے ۔ اس غرض سے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں نواب بہادر یار جنگ اور مولوی عبداللہ المسوری نے شرکت کی ۔ مولوی سید فضل حسین ایڈوکیٹ ورکن مجلس عامہ کی سرکردگی میں ایک وفد شمالی ہندوستان کے دورہ پر روانہ ہوا تاکہ وہاں مسلم اداروں کو حیدرآباد کے سیاسی حالات سے واقف کرا سکیں ۔

کانگریسی قایدین سے گفتگو مفاہمت کی ناکامی کے بعد مجلس کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا کہ مسلم جماعت کسی آئینی ردوبدل کی حامی اور پارلیمنٹری طریقہ حکمرانی کی موئید نہیں ہوسکتی مگر نظم ونسق کی اصلاح ضروری ہے ۔ کیوں کہ مقصود بذات "اچھی حکومت" ہے اس لیے ضروری ہے کہ عامہ رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لیے اور حکومت تک ان کی آواز موثر طریقہ پر پہنچانے کے لیے صوبہ داروں کی صدارت میں سالانہ کانفرنس منعقد کی جائیں اور صدارالمہام کے ساتھ غیر سرکاری اراکین کی کمیٹیاں مقرر کردی جائیں تاکہ وہ تمام سررشتہ جات کے نظم ونسق میں عوام کی مرضی کے مطابق صدرالمہامون کو صلاح مشورہ دے سکیں ۔

اس تجویز میں اس بات کا اعتراف تھا کہ حکومت میں عوام کی نمایندگی بہرحال

---

[1] تاریخ اتحاد المسلمین ص۴۵

ضروری ہے لیکن "ذمہ دارانہ حکومت" کی بجائے "اچھی حکومت" کی لچک دار اصطلاح کا سہارا لیا گیا۔ حیدرآبادی سیاست میں مسلم طبقہ کے مسلمہ قاید نواب بہادر یار جنگ تھے، جو اپنی زندگی تک مجلس اتحادالمسلمین کے صدر نشین رہے۔

کمیٹی اصلاحات

۲۲۔ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء کو اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع نے مجلس وضع قوانین کے نام ایک فرمان جاری فرمایا جسے صدر اعظم سر اکبر حیدری نے مجلس میں پڑھ کر سنایا۔اس فرمان کے بموجب ایوان بہادر راجہ آمد و آئینگار کی صدارت میں حکومت سرکار عالی نے کمیٹی اصلاحات قایم کرنے کا اعلان کیا۔اس کمیٹی کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا کہ ریاست کے مختلف طبقات اور حکومت کے مابین زیادہ اشتراک عمل کے لیے تجاویز پیش کرے جو اس ریاست کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے موزوں ہو سکے[1]

اسکیم اصلاحات

۳۱۔اگست سنہ ۱۹۳۸ء آئینگار کمیٹی نے اپنی رپورٹ محکمہ امور دستوری میں پیش کردی اور حکومت نے اس رپورٹ کی سفارش کی روشنی میں جدید اصلاحات منظور کیں۔آئینگار کمیشن کی سفارشات کے بموجب ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا کوئی اعلان نہیں تھا لیکن ان اصلاحات کو ذمہ دارانہ حکومت کی جانب "پہلا قدم" تصور کیا جانے لگا۔اصلاحات کے اہم قد و خال حسب ذیل تھے :۔

۱۔ موازنہ حکومت پر بحث و مباحث۔تنقید اور ضمنی سوالات کی دستوری اجازت عوام کو دی گئی۔

۲۔ اقتدار اعلا کو جو فرماں روا کی ذات میں مرتکز تھا عوام کے حق میں منتقل

---

[1] پیام مقتدرہ اعلی حضرت مورخہ ۱۶ رجب المرجب ۱۳۵۶ھ م ۲۲ ستمبر ۱۹۳۷ء

کیا گیا اور بادشاہ کو عوامی اقتدار کا نمایندہ قرار دیا گیا۔

۳۔ حلقۂ انتخاب مخلوط اور پیشہ واری اساس پر قایم کیے گئے۔

۴۔ مجلس مقننہ کی ہئیت ترکیبی حسب ذیل قرار دی گئی۔[1]

معزز اراکین باب حکومت یعنی

(ریاستی کابینہ) ...	۷ اراکین
اراکین صرف خاص ...	۳ اراکین
نامزد اراکین ...	۲۸
اراکین علاقہ جات ...	۵
اراکین منتخب شدہ ...	۴۲
جملہ تعداد اراکین	۸۵

(۱) تفصیل اراکین منتخب شدہ :۔

والیان سمستان و جاگیرات ...	۴
زراعت پیشہ ...	۱۸
بشمول معاشداران ...	۲
پٹہ داران ...	۸
کاشتکاران ...	۸
کاشتکاران ...	۴
صنعت و حرفت ...	۲
بینکاری ...	۲
پیشہ طباعت ...	۲
مجلس بلدیہ ...	۲
مسلمہ مجالس ...	۲

---

[1] جریدہ غیر معمولی جلد ۷، نمبر ۴ مورخہ ۱۲ شہریور ۱۳۴۸ ف ص۷

" تاریخ اتحاد المسلمین ص۷۸ و ص۸۰

معاشداران	...	۲
پیشہ داران	...	۴
مزدور پیشہ	...	۲
تجارت	...	۲
پیشہ وکالت	...	۲
طیلمانیں	...	۲
اضلاع کی مجالس	...	۲
جملہ		۴۲ اراکین

(۲) تفصیل نامزد اراکین

اراکین سرکاری ۱۴
بشمول ایک رکن مجلس رفقاء جامعہ عثمانیہ

غیر سرکاری اراکین ۱۴
جملہ ۲۸ اراکین

ہندو اراکین بشمول ہریجن	۵
عیسائی	۲
خواتین	۲
لنگایت	۱
پارسی	۱
متفرق بشمول صحافت گنتہ دار وغیرہ	۳

(۳) تفصیل اراکین علاقہ جات

ہر سہ پائیگاہ	۳	علاقہ پیشکاری	۱
علاقہ سالار جنگ	۱		

جملہ ۵ اراکین

ان دستور اصلاحات میں اشتراک عمل کے لیے جس اصول نمایندگی کو اختیار کیا گیا تھا وہ پورے ہندوستان کے لیے ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ یہ مفاداتی نمایندگی کا اصول تھا یعنی مختلف علاقوں سے نمایندگی کے بجائے مختلف پیشوں سے متعلق افراد کو اپنے نمایندے منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔[1]

اصلاحات سے متعلق مجلس کی ناراضگی اور ترمیمات

اصلاحات کے اعلان کے بعد مجلس اتحاد المسلمین کے صدر دفتر دارالسلام میں مجلس کے عاملہ اور شوریٰ کے کئی جلسے ہوئے۔ بالآخر مجلس کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا کہ

"ان اصلاحات کو مجلس اتحاد المسلمین ملک کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً مضر اور غیر اطمینان بخش تصور کرتی ہے۔"[2]

اس ناراضگی کے ساتھ مجلس کی جانب سے چند ضروری ترمیمات پیش کی گئیں اور ایک مقررہ تاریخ تک حکومت کو یہ ترمیمات قبول کرنے کا مطالبہ کیا گیا بصورت دیگر راست اقدام کے شروع کرنے کا اعلان کیا۔ اس عرصہ میں مسٹر محمد علی جناح صدر مسلم لیگ کو حیدرآباد مدعو کیا گیا۔ مسٹر جناح حیدرآباد میں چند روز مقیم رہے مجلس کے اراکین اور حکومت کے ارباب حل و عقد سے مشاورت کی اور بالآخر حکومت نے وہ ترمیمات منظور کر لیں۔ جن سے مسلمانوں کے حقوق اور تحفظات یقینی ہو گئے۔[3]

مجلس کی جانب سے تین شرائط پیش کی گئیں۔

---

[1] دیگر تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ" دستوری اصلاحات"، شائع کردہ حیدرآباد پیپلز کنونشن کمیٹی۔ مطبوعہ دکن لار پورٹ مشین پریس۔ جام باغ حیدرآباد۔

[2] تاریخ اتحاد المسلمین ص ۸۶

[3] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ص ۸۷

۱۔ ریاست کو ریاست "اسلامیہ" قرار دیا جائے۔
۲۔ مشترکہ حلقہ انتخاب ختم کیے جائیں اور ان کے بجائے علاحدہ علاحدہ انتخابی حلقے قایم کیے جائیں۔
۳۔ صرف خاص کی جانب سے تین مسلم اراکین نامزد کیے جائیں۔

اولاً حکومت نے ان مطالبات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ بعد ازآں مسٹر جناح کے اصرار کی بنا پر ان مطالبات پر غور کیا اور اس حد تک پیش رفت ہوئی کہ ریاست کو "ریاست اسلامیہ" کہا جا سکتا ہے لیکن اس بات کی صراحت کے ساتھ کہ یہ تمام فرقوں کا ناقابل تقسیم اثاثہ ہے" دوسرے مطالبہ کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہندو مسلم امیدوار کی کامیابی کے لیے اس حلقہ میں رہنے والے اسی فرقہ کے ۱۴ ٪ رائے دہندگان کے ووٹ حاصل کرنا لازمی ہوگا۔ حکومت نے علاحدہ حلقہ انتخاب اور صرف خاص کی مسلم نمایندگی کی تحریکوں کو مسترد کر دیا۔ مجلس کی جانب سے راست اقدام کی دھمکی دی گئی۔ حکومت ہند نے ریاستی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ اصلاحات کی کارروائی کو تیزی کے ساتھ روبہ عمل نہ لائے کیوں کہ مرکزی حکومت دوسری جنگِ عظیم کی پریشانیوں میں سخت مبتلا تھی۔ حضور نظام نے مسٹر جناح کو اصلاحات کے متعلق گفتگو کے لیے طلب کیا۔ مسٹر جناح دو دن اور ایک رات حیدرآباد کے راک لینڈ گیسٹ ہاؤس میں مقیم رہے (جو اب آل انڈیا ریڈیو کا دفتر بن گیا ہے) مسٹر جناح نے مجلس کے مطالبات کی پُر زور تائید کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ جلد سے جلد ان مطالبات کو روبہ عمل لائے۔ اس واقعہ کے چند ہی دنوں بعد سر اکبر حیدری کی وزارت نے دم توڑ دیا۔ اور اتحادی مطالبات کی جو شخصیتیں مخالفت کر رہی تھیں وہ بساط سے ہٹا دی گئیں۔ مسٹر جناح کی روانگی سے قبل ہی انھیں مطمئن کرایا گیا کہ صرف خاص کی نمایندگی صرف مسلم اراکین کو دی جائیں گی اور کسی امیدوار کے منتخب ہونے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ اپنے ہی فرقہ کے ۱۰ ٪ ووٹ حاصل کرے۔ ایوانات شاہی اور باب حکومت میں یہ سب ہو رہا تھا۔ ادھر عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا نے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی تحریک شروع کر دی۔ کچھ گرفتاریاں عمل میں آئیں جس کے ردعمل کے طور پر

یونیورسٹی کے طلبا نے نواب صدر اعظم کی سرکاری قیام گاہ "دلکشا" پر ہلہ بول دیا۔ انسپکٹر جنرل کے سر پر ضربات پہنچائے اور کئی پولیس کانسٹبل زخمی ہوئے۔ طلبا سر اکبر حیدری کے باورچی خانہ میں گھس گئے اور جو کچھ مال غنیمت ملا چٹ کر گئے۔

ریاستی حکومت نے کانگریسی لیڈرس سے اصرار کیا کہ وہ اپنی تنظیم کا نام بدل دیں اور کانگریسی لیڈر بھی اس بات کے لیے اما دہ ہو گئے۔ لیکن ان کی آمدگی تعطل کو توڑنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ رہبر دکن نے اپنے ایڈیٹوریل نوٹس میں اس بات پر اصرار کیا کہ نام بدلنے سے مقاصد نہیں بدل سکتے اس لیے ضروری ہے کہ نام کے ساتھ مقاصد کی تبدیلی کا یقین دلایا جائے۔ کانگریسی لیڈروں کے لیے ایک مشکل مسئلہ تھا اور سر اکبر حیدری کے دور وزارت میں اس کا کوئی حل دریافت نہ ہو سکا۔

سر اکبر حیدری وائسرائے کی مجلس عاملہ میں وزیر اطلاعات مقرر ہوئے اس طرح ۲۸۔ اگست سنہ ۱۹۴۱ء کو شام میں ساڑھے تین بجے رائٹ آنرایبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ نے نایب صدر اعظم باب حکومت سر عقیل جنگ بہادر کو اپنے منصب جلیلہ کا جائزہ دے دیا۔ جائزہ کی یہ رسم بیک وقت سادہ اور اثر انگیز تھی۔ سادہ اس لیے کہ ظاہرہ تکلفات سے مبرا تھی اور اثر انگیز اس لیے کہ ایک ایسے رشتے کے منقطع ہو جانے کی علامت تھی جو چھتیس (۳۶) سال سے قایم ہوا تھا۔

نواب صاحب چھتاری کا دورِ وزارت

لفٹیننٹ کرنل محمد احمد سعید خاں نواب صاحب چھتاری نے یکم ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء کو صدر اعظم باب حکومت، حکومت سرکار عالی کی حیثیت سے اپنے عہدہ کا جائزہ حاصل کیا۔ نواب صاحب بحیثیت سیاست داں، ماہر تعلیم اور ماہر نظم و نسق، برطانوی ہند میں تیس سال سے زیادہ مدت تک عملی حصّہ لینے کے بعد حیدرآباد تشریف لائے۔ نواب صاحب چھتاری کو نسبتاً ایک سازگار ماحول میں وزارت عظمیٰ عطا ہوئی تھی۔ دوسری عالمی جنگ اتحادیوں کی فتح پر ختم ہو رہی تھی انگریز حکومت ہندوستان کو نو آبادیاتی درجہ دینے پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔

نواب صاحب چھتاری کا تعلق بلند شہر کے مشہور راجپوت خاندان لال خانی سے ہے[1] اور آپ صوبجات متحدہ آگرہ اوراودھ کے سربرآوردہ طبقہ اعیان کے رکن ہیں۔ ۱۲۔ دسمبر سنہ ۱۸۸۸ ء کو صوبہ پنجاب کے ضلع رہتک میں بمقام کلانور پیدا ہوئے اور علی گڑھ کے سابق ایم۔ اے او کالج میں تعلیم پائی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں آپ قومی زندگی میں داخل ہوئے اور معاشری، تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگے۔ اس سال اپنے مقام پیدائش کلانور میں مسلم راجپوت ہائی اسکول کی بنا ڈالی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں آپ مسلم راجپوت کانفرنس منعقدہ کلانور کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ بلند شہر کے مسلم حلقہ رائے دہی سے بلا مقابلہ مقننہ کے رکن منتخب ہوئے۔ تین سال کے بعد وزیر صنعت وزارعت مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں صوبہ جات متحدہ کے وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔ نواب صاحب دومرتبہ صوبہ جات متحدہ کے منصرم گورنر رہے۔ پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۲۸ء میں گورنر سرالگزینڈر موڈیمن کی ناگہانی موت کے باعث اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۳۳ء میں سر مالکم ہیلی کی غیر موجودگی کے زمانہ میں آٹھ ماہ گورنر رہے۔ گورنری سے قبل وائسرائے ہند کی اگزیکٹو کونسل میں دو ماہ تک وزیر تعلیم کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۲ء میں لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں بھی شریک رہے۔ نواب صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ اور روزٹینگ بورڈ کے بھی رکن ہیں۔

نواب صاحب نے اپنی سوانح حیات "یادایام" بڑے دلکش انداز میں لکھی ہے جس میں انگریز شہنشاہیت کے زمانہ سے ہندوستان کی آزادی تک کے واقعات تفصیلاً مندرج ہیں۔ سیلمن کمیشن کی مخالفت کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

> "ایک روز تعلقداران اودھ نے سایمن کمیشن کو قیصر باغ میں ایٹ ہوم دیا۔ پارٹی کے روز مظاہرہ کرنے والوں کی طرف سے

---

[1] تفصیلی حالات زندگی کے لیے ملاحظہ فرمائیں
یادایام خود نوشتہ سوانح نواب چھتاری

ایک جدت دکھائی گئی مظاہرہ کی یہ ترکیب صرف اہالیان لکھنؤ کے ذہن میں آسکتی تھی۔ ہوا کا رخ دیکھ کر مختلف مقامات سے پتنگیں اڑائی گئیں جن پر جلی قلم سے انگریزی میں لکھا تھا" سایمن واپس جاؤ" ان پتنگوں کو غوطہ دے کر دھاگے اس طرح توڑا کہ ٹھیک وہاں آکر گرتے جہاں سایمن کمیشن کا ایٹ ہوم ہو رہا ہے پولیس کے لوگ دوڑ دوڑ کر انھیں پکڑ رہے تھے۔ اراکین پولیس کی خفت اور خفگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن ہم میں سے بہتروں نے لکھنؤ والوں کی اس جدت طرازی پر جی کھول کر داد دی برسوں اس کا پتہ نہ چلا کہ اس جدت کا سہرا کس کے سر تھا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن دہلی آیا تو حیدر آباد کی طرف سے میں سر والٹر مونکٹن کے ہمراہ دہلی آیا۔ ایک روز چودھری خلیق الزماں کو میں نے شب کے کھانے پر دعوت دی۔ دوران گفتگو میں خلیق صاحب سے معلوم ہوا کہ راجہ محمود آباد کے مکان میں یہ مشورہ ہوا تھا ۱۸ سال کے بعد میں نے اس لطیفہ کی داد خلیق صاحب کو دی"

نواب صاحب چھتاری ٹینس کے بڑے شاطر کھلاڑی تھے۔ لیکن حیدر آبادی میدان سیاست میں وہ ایک نوسکھ کرکٹ کھلاڑی کی طرح "ٹھہرے رہو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر کاربند رہے۔

عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد حکومت ہند کی پالیسی کے تحت کمیونسٹوں کو عام چھوٹ دے دی گئی اور وہ نلگنڈہ میں اپنی تنظیم کو طاقتور بنانے میں مصروف ہو گئے۔ ریاستی حکومت سر اسٹافارڈ کرپس اور کیبنٹ مشن کی تجاویز کے معائنہ میں مصروف رہی۔ ادھر مجلس اتحاد المسلمین نے برار، دوآبہ اور شمالی سرکار کی واپسی کے لیے اپنا مطالبہ شروع کیا۔ اس سیاسی ہیجان میں کسی نے اس بات پر مطلق غور نہ کیا کہ نلگنڈہ اور کھم میں ایک نئی تحریک پورے زور و شور سے ابھر رہی ہے۔ نواب بہادر یار جنگ کے انتقال کی وجہ سے وہ لوگ بے لگام ہو گئے جو نواب صاحب کی شخصیت اور اثر کی بنا پر زبان نہ کھولتے تھے۔ عبدالرحمن رئیس اور ایسے ہی کئی لیڈروں نے مجلس کی صدارت یا کرسی اقتدار حاصل کرنے کے

یے اشتعال انگیز تقاریر کا سہارا لیا۔ اسی زمانہ میں مسجد ڈچپلی کا واقعہ پیش آیا۔ ۱۵۔ مارچ ۱۹۴۶ء کو زمرد محل ٹاکیز میں ایک جلسہ عام ہوا اور عبد الرحمٰن رئیس کی اپیل پر زمرد محل سے ایک جلوس کئی میل کی مسافت طے کر کے شاہ منزل (موجودہ راج بھون) پہنچا اور صدر اعظم اس کی سرکاری قیام گاہ کو آگ لگا دی۔ پھر یہ جلوس سٹر گریکسن وزیر پولیس کی قیام گاہ کی طرف بڑھا اور اسے بھی آگ لگا دی۔ افسوس تو یہ ہے کہ حیدر آباد کے قبائل سے متعلق جو ضخیم غیر مطبوعہ مقالہ ان کے پاس تھا وہ بھی ان کی لائبریری کی دیگر کتابوں کے ساتھ نذر آتش ہو گیا۔ پولیس نے جلوسیوں کی مزاحمت نہیں کی اس واقعہ کے بعد نواب چھتاری نے یہ جان لیا کہ وہ سر اکبر حیدری کی طرح حیدر آباد میں زیادہ دن نہیں رہ سکتے۔

نلگنڈہ اور کھمم میں سرخ تحریک زور پکڑ رہی تھی اور مسجد ڈچپلی کے واقعہ کے بعد حکومت ان جماعتوں سے خائف ہو گئی اور اپنے بچاؤ اور ایک مخالف فریق کو میدان سیاست میں چھوڑنے کی خاطر حکومت نے حیدر آباد اسٹیٹ کانگریس پر سے پابندی ہٹالی۔

نواب صاحب چھتاری کے پہلے دور وزارت میں مجلس اتحاد المسلمین ایک نئی فرقہ وارانہ قوت کی حیثیت سے ابھر رہی تھی۔ حیدر آباد کے بڑے جاگیردار اور امرا اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن درمیانی درجہ کے جاگیردار اور منصب دار اس تحریک کے حامی تھے۔

سید محمد قاسم رضوی

سید محمد قاسم رضوی صاحب نے سنہ ۱۹۴۶ء میں مجلس کے صدر منتخب ہوئے مسٹر قاسم رضوی نے مجلس کی صدارت کا جائزہ لینے کے بعد ان تمام اراکین کو بے اثر کر دیا جو ان کے لیے غیر مفید تھے۔ اپنے مخالفین کو سیاست سے دور رکھنے کے لیے ان کو سرکاری عہدوں پر تقرر کرا دیا۔ وہ بہادر یار جنگ کی طرح اعلا مقرر نہیں تھے لیکن ان کی روانی تقریر سے عوام کافی متاثر ہوا کرتے تھے۔ وہ جنوبی ہند کے جناح بننے کے خواہش مند تھے۔ وہ اس بات سے

واقف تھے کہ ایک اقلیت کی بنا پر وہ حکومت میں کوئی موثر مقام پیدا نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے وہ خوف پیدا کر کے زیادہ سے زیاد فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھیں نواب صاحب چھتاری کی کمزور صدارت اعظمی سے کافی مدد ملی چھتاری وزارت میں قاسم رضوی کے تایدی وزراٗ کو زیادہ سے زیادہ شامل کیا گیا جن میں پنگل وینکٹ را ما ریڈی نواب معین نواز جنگ اور محمود یار جنگ قابل ذکر ہیں۔ پولیس کا محکمہ جو نواب علی یاور جنگ کے تحت تھا وہ معین نواز جنگ کے سپرد کر دیا گیا جس سے محکمہ کو تالی پر مجلس کا کنٹرول قایم ہوگیا۔

ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۷ء میں نواب صاحب چھتاری صدارت اعظمی سے سبکدوش ہوئے۔

سر مرزا اسمٰعیل کا مختصر دور وزارت

سر مرزا اسمٰعیل نے اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں بحیثیت صدر اعظم باب حکومت خدمت کا جائزہ لیا اور کم وبیش دس ماہ اس خدمت پر کارگزار رہنے کے بعد بتاریخ ۵- مئی ۱۹۴۸ء اپنا استعفیٰ پیش کیا۔

ایرانی النسل سر مرزا اسمٰعیل سنہ ۱۸۸۳ء میں بمقام بنگلور پیدا ہوئے[1]۔ آپ کے والد آغا جان، علی عسکر شیرازی کے فرزند تھے آپ کی والدہ اور نانا بھی شیراز سے ہندوستان آئے تھے۔ اولاً ایرانی تاجر بمبئی میں مقیم ہوئے اور وہاں شیعہ مسجد کی تعمیر کی۔ مسجد کی تعمیر کے لیے ایران سے مزدور بلائے گئے تھے۔ اس مسجد کی ماہانہ آمدنی چار ہزار روپے ہے جو مسجد کے علاوہ بمبئی کے شیعہ فرقہ کے فلاحی کاموں پر صرف کی جاتی ہے۔ سر مرزا کے دادا علی عسکر شیرازی سنہ ۱۸۲۴ء میں بنگلور آئے اور ایرانی عربی گھوڑوں کے علاوہ ایرانی شال اور قالین کی تجارت کیا کرتے تھے۔ علی عسکر بنگلور کے ماحول اور موسم سے اس قدر متاثر

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے
My Public Life By Sir Mirza Ismail

ہوئے کہ انھوں نے بنگلور کو اپنا وطن بنالیا اور پھر کبھی ایران کا رخ نہ کیا۔ علی عسکر سرکاری یا خانگی ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے انھوں نے اپنی اولاد کو سرکاری ملازمت سے دور رکھا۔ میسور کے دیوان رنگاچارلو نے بڑی مشکل سے سر مرزا کے والد آغا جان کو مہاراجہ میسور کے مصاحب بننے پر آمادہ کیا۔

سر مرزا کی ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرک اسکول میں ہوئی۔ ۱۸۹۶ء میں سر مرزا کو ان نو لڑکوں میں شامل کیا گیا جو نو عمر یوراج کے ہم جماعت اور مصاحب تھے۔ اس حیثیت سے وہ مہاراجہ کے ساتھ گرمائی محل میں رہا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں وہ سینٹرل کالج بنگلور میں شریک ہوئے اور سنہ ۱۹۰۵ء میں ڈگری حاصل کی۔ ان کا اولاً تقرر محکمہ پولیس میں کیا گیا اور بعد میں وہ محکمہ دیوانی منتقل کیے گئے وہ اسسٹنٹ سکریٹری بنے اور سنہ ۱۹۱۳ء میں مہاراجہ کی پیشی کے سکریٹری مقرر ہوئے سنہ ۱۹۲۲ء میں مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری بنائے گئے۔ وہ مہاراجہ کے پہلے ہندوستانی پرائیویٹ سکریٹری تھے اور ریاست میں " دیوان میسور " کے بعد یہ ایک اہم عہدہ تھا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں جب کہ سر مرزا کی عمر بمشکل ۴۲ سال تھی وہ ریاست کے دیوان بنائے گئے۔ وہ سنہ ۱۹۴۱ء تک اس خدمت جلیلہ پر فائز رہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء سے جولائی سنہ ۱۹۴۶ء تک وہ ریاست جے پور کے وزیر اعلا رہے۔

۱۹۴۶ء میں چند خاص حالات کی بنا پر سر مرزا نے حیدرآباد میں صدارت اعظمی کو قبول کیا۔ ورنہ اٹھارہ سال قبل حیدرآباد کے رزیڈنٹ سر ولیم بارٹن نے ان سے ریاست حیدرآباد کی صدارت اعظمی کو قبول کرنے کی پیش کش کیا تھا۔ لیکن سر مرزا اپنی ریاست کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے کچھ سال بعد گورنر جنرل لارڈ اروین کی جانب سے سر مرزا سے خواہش کی گئی کہ حیدرآباد کے مخصوص حالات کے پیش نظر وہ وزارت اعظمی کی خدمت قبول کرلیں۔ لیکن سر مرزا نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس پیش کش کو مسترد کردیا۔ اگر سر مرزا سنہ ۱۹۴۶ء سے قبل سر ولیم بارٹن یا لارڈ اروین کے حسب خواہش حیدرآباد کی وزارت اعظمی قبول کرلیتے تو شاید حیدرآباد فرقہ وارانہ سیاست کا شکار نہ ہوتا اور معاشی و سیاسی انقلاب سے بچ سکتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں صدر مسلم لیگ مسٹر محمد علی جناح نے نظام حیدر آباد کو تار کے ذریعہ مطلع کیا کہ وہ سر مرزا کے تقرر کو پسند نہیں کرتے اور اس تقرر کی صورت میں وہ آیندہ حضور نظام یا ریاست حیدر آباد کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ حضور نظام نے مسٹر جناح کے اس تار کو نظر انداز کر دیا اور حیدر آباد میں سر مرزا کی آمد کی افواہیں پھیل گئیں۔ ان حالات میں مسٹر جناح حضور نظام سے ملنے کے لیے خود حیدر آباد آئے لیکن کنگ کوٹھی کے مقررہ قاعدوں کی پابندی قاید اعظم کے بس کی بات نہ تھی ڈرائینگ روم میں مسٹر جناح کا سگار پینا اور صوفے پر غلط انداز سے بیٹھنا نظام حیدر آباد کو قطعاً پسند نہ آیا۔ ان حالات میں "حضرت اقدس اعلا" سے ان کی ملاقات بہ مشکل دس پندرہ منٹ رہی۔ ابتداً جب حضور نظام نے مسٹر جناح کو اپنے آگے سگار پیتے دیکھا تو گرجدار آواز میں پوچھا۔

"کیا آپ اس طریقہ سے نظام حیدر آباد کی عزت کرنا پسند کریں گے۔"

مسٹر جناح، نواب میر عثمان علی خاں کے اعتراض کو سمجھ گئے اپنا سگار پھینک دیا اور معافی چاہی۔ لیکن حضور نظام کے تیور نہ بدلے حضور نظام نے پھر اونچی آواز میں پوچھا۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔"

"اور کیا کہنے آئے ہیں۔"

مسٹر جناح سر مرزا کے تقرر کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے کہ حضور نظام نے درمیان میں کہہ دیا

"میں اپنی ریاست کے معاملات میں بیرونی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ میں اپنی ریاست کا فائدہ نقصان خوب جانتا ہوں اور اس تعلق سے کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔"

مسٹر جناح نے اپنا آخری تاش کا پتہ یہ کہہ کر سامنے رکھا کہ سر مرزا کے تقرر کی صورت میں مسلم لیگ نظام یا حیدر آباد کی کوئی مدد نہیں کر سکے گی۔

حضور نظام نے پھر انتہائی جذباتی انداز میں کہا:۔

"میں کسی کی مدد نہیں چاہتا۔ آپ نے میری کبھی مدد نہیں کی اور نہ آیندہ کوئی مدد چاہتا ہوں"

اس کے بعد کچھ لمحے خاموشی رہی۔ سکوت کو توڑتے ہوئے حضور نظام نے دریافت کیا:۔

"کیا آپ کچھ اور کہیں گے"

جناح صاحب نے جواب دیا۔

"جی نہیں"

حضور نظام نے پھر اونچی آواز میں کہا:۔

"خدا حافظ"[1]

اصلاحات کے تحت پہلی مجلس مقننہ کا افتتاح

وزارت اعظمی کا جائزہ لینے کے کچھ عرصہ بعد سر مرزا اسمٰعیل نے منظورہ اصلاحات کے مطابق مجلس مقننہ کے اجلاس کو طلب کیا مقننہ کے صدر نواب معین نواز جنگ اور قاید ایوان مسٹر ڈبلیو۔ وی۔ گرگسن نامزد کیے گئے۔ ٹاؤن ہال باغ عامہ (موجودہ عمارت لیجس لیچر اسمبلی) میں مناسب تبدیلیاں کی گئیں۔ اس اجلاس کے موقع پر پبلک گیلریاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ابتداً سر مرزا نے پیام شاہانہ پڑھ کر سنایا۔ اور اراکین استادہ ہوکر اس پیام کو سماعت کرتے رہے۔ پیام میں کہا گیا تھا کہ

"میرے جلوس کے چھتیسویں سال میں ماہ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ کی پچیس تاریخ ایک ایسی تاریخ ہے جب کہ بفضل ایزدی میری یہ دیرینہ تمنا پوری ہوئی کہ میرے ملک کی رعایا اور میری حکومت کے مابین زیادہ موثر طریقہ پر تعاون عمل پیدا ہو۔ لہٰذا اس مبارک اور یادگار موقع پر میں اراکین مجلس مقننہ کو ایک حوصلہ افزا پیام بھیجتا ہوں"

"راعی اور رعایا کے درمیان مفاد و اغراض کی یکسانیت اور رعایا

---

[1] My Public Life By Sir Mirza

کی مرضی کے ساتھ حکومت کی مطابقت پذیری اچھی حکومت کا جوہر اصلی ہے اور گذشتہ پینتیس[35] برسوں سے جب سے کہ اس مملکت کی عنان حکومت میرے ہاتھ آئی ہے میرا یہی اصول رہا ہے۔ اس مدت میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور گو میری یہ دلی تمنا تھی کہ کئی سال پہلے ہی اصلاحات کی ایک جامع اسکیم کا نفاذ عمل میں آئے لیکن اسے ایسے حالات کے تحت ملتوی کر دینا پڑا جو متعدد حکومتوں کے دستور میں کئی بنیادی تبدیلیوں کا باعث ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک میں مختلف اقسام کے تغیرات عمل میں آ رہے ہیں جو بعض کے لیے رحمت اور بعض کے لیے زحمت کا باعث رہیں۔

"جس کام کی انجام دہی آپ کو تفویض کی گئی ہے اس کے آغاز پر میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں میری دعا ہے کہ یہ مجلس میرے اور میری عزیز رعایا کے باہمی تعلقات کو مضبوط اور استوار کرنے کا ذریعہ بنے اور اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ وہ ہر چیز میں حیدر آباد کے بہترین مفاد ہی کو پیش نظر رکھے۔ خدا ان نئی مساعی کو کامیاب کرے"[1]

سر مرزا نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا:۔

"کسی کا ـــ حتیٰ کہ حکومت کا ـــ بھی یہ دعوا نہیں ہے کہ یہ دستور ترقی کی جانب ایک اقدام ایک شاندار اور اگر آپ چاہیں تو ایک انوکھے تجربے سے زیادہ کچھ اور بھی ہے۔ یہ دستور وسٹ منسٹر یا نئی دہلی کے قایم کردہ نمونہ پر مرتب نہیں کیا گیا ہے بلکہ اپنی علاحدہ انفرادیت رکھتا ہے اعلیٰ حضرت نے ایک ایسا دستور منظور فرمایا ہے جس کی موجودہ حالات اجازت دے سکتے تھے۔ اس زمانہ میں جو چیزیں ہمیں دعوت مقابلہ دے رہی ہیں ان میں مادی اعتبار سے عوام کا افلاس۔ ذہنی اعتبار سے ان کی جہالت۔ روحانی اعتبار سے باہمی بدگمانی اور نزاع شامل ہے۔ اس

---

[1] رسالہ "اطلاعات" شایع کردہ محکمہ اطلاعات حکومت حیدر آباد

سہ گونہ مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ہمیں جمہوریت اور دفتریت یا ذمہ داریاں یا غیر ذمہ دار حکومت میں انتخاب کرنا نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مقننہ میں اپنی اکثریت کا یقین ہوتے ہی ایک نام نہاد ذمہ دار حکومت انتہائی غیر ذمہ دارانہ طرز عمل اختیار کر سکتی ہے اور عوام کے جذبات اور مفادات کو نظر انداز کر سکتی ہے۔"[1]

مجلس اتحاد المسلمین شروع ہی سے سر مرزا کی موجودگی کو اپنے مفادات کے لیے عظیم خطرہ تصور کرتی تھی۔ حکومتی حلقوں میں نواب معین نواز جنگ اور مسٹر لایق علی سر مرزا کے شدید مخالفین میں سے تھے۔ معین نواز جنگ کو حیدر آباد کی مقننہ کا اسپیکر بنایا گیا تھا جس سے وہ خوش نہ تھے۔ مسٹر لایق علی جو رشتہ میں نواب معین جنگ کے برادر نسبتی تھے اور حیدر آباد کی صنعتی دنیا پر کافی اثر رکھتے تھے وہ اس بات سے ناراں تھے کہ سر مرزا ان کی بڑی بڑی جائدادوں کو حکومتی اغراض کے لیے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح معین نواز جنگ کی حکمت عملی اور مسٹر لایق علی کی رقمی امداد نے مخالف سر مرزا محاذ کو طاقتور بنا دیا۔ مسٹر قاسم رضوی کی صدارتی سرگرمیوں نے اس خصوص میں بڑی خدمات انجام دیں۔

سر مرزا اسمٰعیل کا استعفیٰ

۱۵-مئی ۱۹۴۶ء کو سر مرزا نے بنگلور سے اپنا استعفیٰ حضور نظام کی خدمت میں روانہ کیا استعفیٰ میں لکھا تھا کہ

"میں انتہائی افسوس کے ساتھ آپ کی خدمت میں اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہوں۔ میں اپنی ممکنہ صلاحیتوں کے ساتھ حیدر آباد کو ترقی دینے کا ایک منصوبہ بنایا تھا اور اگر وقت اور حالات میرا ساتھ دیتے تو یقیناً میں حیدر آباد کی بہت کچھ خدمت کر سکتا تھا بدقسمتی سے مجھے چند ایسے لوگوں سے سابقہ ہوا جو عمداً خودکشی پر تلے ہوئے تھے اور

---

[1] رسالہ "اطلاعات" شایع کردہ محکمہ اطلاعات حکومت حیدر آباد

ریاست کے چین وآرام کے بدترین دشمن تھے۔میں نے ان کو مطمئن
کرنے کی لاکھ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔میری کوششوں کے
برعکس مخالفین نے میری ہر تجویز کی مخالفت کی اور میرے خلاف ہر
قسم کا پروپگنڈہ کیا گیا۔ان تمام چیزوں سے بڑھ کر جان لیوا حقیقت
تو یہ ہے کہ پور اگزالٹیڈ ہائنس" اعتماد بھی مجھے حاصل نہ ہو سکا۔ورنہ فرماں
روا کے ایک اشارہ پر میرے مخالفین خاموش ہو سکتے تھے لیکن فرماں
روا کی خاموشی سے مخالفین نے یہ سمجھا کہ انھیں حکمراں کی تائید حاصل
ہے اور ان کی مخالفت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا حال ہی میں برار
سے میں نے ایک معروضہ خدمت عالی میں روانہ کیا تھا کہ جب تک
حکمراں کی قطعی تائید مجھے حاصل نہ ہو میں اپنے مشن میں کامیاب نہ
ہو سکوں گا۔میرے معروضہ کے جواب سے مجھے سرفراز نہیں فرمایا
گیا۔ان حالات میں میرے لیے بس یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ اپنی
سبکدوشی کی اجازت مانگوں۔
خدا آصف جاہی تخت وتاج کی حفاظت کرے"[1]

حیدرآباد کی وزارت اعظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد سرمرزا کو مہاراجہ کشمیر اور مہاراجہ بڑودہ نے اپنی اپنی ریاستوں میں وزارت اعظمیٰ کا پیش کش کیا۔لیکن سرمرزا تبدیل شدہ حالات میں کسی اور ریاست کی کوئی ذمہ داری قبول کرنا پسند نہ کرتے تھے اس زمانہ میں ہندوستان کی تقریباً تمام بڑی ریاستوں میں سیاسی اور دستوری بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور ایسے زمانہ میں صحیح معنی میں ریاستوں کی کوئی خدمت ممکن نہ تھی۔

شہر کو دلکش بنانے کے لیے سرمرزا کی کوشش

دس ماہ کی مختصر ترین مدت میں سرمرزا نے حیدرآباد کو جے پور اور میسور کی طرح دلکش شہر بنانے میں کوئی کمی نہیں کی۔نوبت پہاڑ اور کالا پہاڑ کی بلند و بالا

My Public Life By Sir Mirza ـ1

چوٹیوں پر ایرانی اور مغل طرز تعمیر کے خوبصورت جھروکے تعمیر کیے گئے جو دور دور سے بڑے دلکش نظر آتے تھے۔ باغ عامہ کے حصار کی بلندی اس طرح کم کر دی گئی کہ شاہراہ عام سے باغ عامہ کا نظارہ ہو سکے۔ سر مرزا کے بعد یہ حصار پھر بلند کر دی گئی۔ اسی طرح کٹہ حسین ساگر کے دیوار کی اونچائی فٹ پاتھ کے برابر کر دی گئی جس سے حسین ساگر کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا۔ عثمانیہ ہاسپٹل کے روبرو پہلے سیمنٹ روڈ کے کنارے کنارے ایک جدید یاد سیمنٹ روڈ تعمیر کرائی اور نئے پل کے چمن کو ہاسپٹل کے احاطہ میں شامل کر دیا تاکہ رو بہ صحت مریض اس چمن میں چہل قدمی کر سکیں۔ افسوس ہے کہ یہ چمن اب ویران ہوتا جارہا ہے۔

نواب چھتاری کا دوسرا دورِ وزارت

لفٹیننٹ کرنل محمد احمد سعید خاں نواب صاحب چھتاری دوسری مرتبہ حیدرآباد کے وزیر اعلا مقرر ہوئے اولاً سر اکبر حیدری کے سبکدوشی ہونے کے بعد اور دوسری مرتبہ سر مرزا کے استعفیٰ کے بعد انھوں نے اعلیٰ حضرت کے احکام کی تکمیل میں اس خدمت کو قبول کیا۔ نواب صاحب چھتاری کو اس دوسرے دورِ وزارت میں وہ ہر دلعزیزی حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ بجا طور پر حقدار تھے۔ اس وقت مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد میں ایک انتہائی طاقتور جماعت تھی اور سر مرزا اسمٰعیل کی مخالفت میں نمایاں کامیابی حاصل کر چکی تھی۔ مرکزی حکومت کے اثرات کی بنا پر انھیں دوبارہ صدر اعظم بنایا گیا تھا لیکن مرکزی انگریز حکومت خود ترک وطن پر آمادہ تھی۔ ریاست کے ہندو نواب چھتاری سے زیادہ قریب نہ ہو سکے اور نہ وہ ان کی صلاحیتوں پر زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ مجلس اور ریاست کے دوسرے مسلمان اس وزارت کو صرف ایک عارضی انتظام خیال کرتے تھے۔ نواب صاحب چھتاری کے پہلے دورِ وزارت میں مسجد ڈچپلی کا واقعہ اور شاہ منزل کی تباہی لوگوں کے ذہن میں ابھی تازہ تھی اور اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ نواب صاحب چھتاری مجلس کی قیادت پر قابو نہ پاسکیں گے۔ بہر حال نواب چھتاری کسی طرح سر مرزا اسمٰعیل سے زیادہ بااثر شخصیت کے مالک نہیں تھے اور جس میدان سے سر مرزا ناکام

واپس ہو چکے تھے وہاں نواب چھتاری کا کامیاب ہونا یقیناً ناممکن تھا۔

انڈین یونین میں انضمام یا اشتراک کے متعلق گفتگو کا آغاز

اس دوسرے دور میں حیدرآبادی وفود بار بار دہلی جاتے اور دہلی کے ویسرینگل لاج میں طویل مباحث کے بعد حیدرآباد واپس ہوتے رہے۔ حیدرآباد کی سیاسی فضا اس قدر مکدر ہو چکی تھی کہ سر سلطان احمد اور سر والٹر مانکٹن جیسے ماہرین قانون بھی عاجز آ چکے تھے۔

برطانوی حکومت کے ۳۔جون سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد حضور نظام نے اپنے ایک فرمان کے ذریعہ اعلان کیا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان کی دستور ساز اسمبلیوں کو اپنا کوئی نمائندہ روانہ نہیں کریں گے اور ۱۵۔اگست سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد اقتدار اعلیٰ انھیں پھر سے حاصل ہو جائے گا۔

[1] ۱۱۔جون سنہ ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد کا پہلا وفد دہلی روانہ ہوا جس کی قیادت نواب چھتاری نے کی اور اراکین میں نواب علی یاور جنگ۔سر والٹر مانکٹن محمد عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ راما ریڈی شامل تھے۔اس وفد نے تین موضوعات پر گفتگو کی۔

۱۔ واپسی برار۔

۲۔ حیدرآباد کا نوآبادیاتی درجہ اور

۳۔ انضمام حیدرآباد۔ دہلی نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ برار کا علاقہ صوبہ جات متوسط میں اس قدر ضم ہو گیا ہے کہ اسے جنگ یا استصواب عامہ کے سوائے اس صوبہ سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ دونوں صورتیں ناممکن تھیں۔ نوآبادیاتی موضوع کے متعلق لارڈ ماؤنٹ بیاٹن نے وضاحت کی کہ ۳۔جون سنہ ۱۹۴۷ء کے اعلان میں صرف دو نوآبادیاتی ریاستوں کا ذکر ہے اس لیے حیدرآباد کو نوآبادیاتی درجہ دینے کا سوال

---

[1] The Story of the Integration of the Indian State By V.P Menon page 318

— Do — " 319

ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انضمام حیدرآباد کے متعلق ریاستی وفد نے وکالت کی کہ حضور نظام کو انضمام کے لیے مجبور نہ کیا جائے اور انھیں بحیثیت مقتدر ریاست تسلیم کیا جائے۔ اگر انضمام ضروری ہو تو ممکن ہے کہ نظام پاکستان سے انضمام کو ترجیح دیں[1] دہلی نے وضاحت کی کہ جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے یہ کوئی دانش مندانہ تجویز نہ ہوگی۔ لیکن حیدرآبادی وفد اپنے ادعا پر قایم رہا۔ لارڈ ماؤنٹ بیاٹن نے دو ماہ کی مدت حاصل کی تاکہ وہ اس موضوع پر آئندہ ریاستی وفد سے گفتگو کرسکیں۔

۸۔ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو نواب میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد نے لارڈ ماؤنٹ بیاٹن کو لکھا کہ وہ انضمام ریاست کے حامی نہیں ہیں البتہ وہ حکومت ہند سے کوئی ایسا معاہدہ کرنا پسند کریں گے جس سے حیدرآباد کی سالمیت اور انفرادیت قائم رہے۔ شرائط معاہدہ ان خطوط پر ہوں گے کہ ہند و پاکستان کے درمیان کسی تصادم کی صورت میں حیدرآباد غیر جانبدار رہے۔ ریاست حیدرآباد کو اختیار ہوگا کہ جہاں وہ مناسب خیال کرے اپنے ایجنٹ جنرل مقرر کرے اور اگر حکومت ہند برطانوی دولت مشترکہ سے علاحدہ ہونے کا فیصلہ کرے تو حیدرآباد کو حق ہوگا کہ وہ ہندوستان سے اپنے تعلقات کے متعلق از سر نو غور کرے[2] لارڈ ماؤنٹ بیاٹن نے اپنے جواب میں صرف انضمام کی تجویز دہرائی۔

۱۰۔ اگست ۱۹۴۷ء کو نواب چھتاری نے مرکزی حکومت سے گفتگو کرنے کی خواہش کی اور مطلع کیا کہ ریاستی وفد ۲۰۔ اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچ جائے گا۔ ۲۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو سر والٹر مانکٹن نے لارڈ ماؤنٹ بیاٹن کو مطلع کیا کہ وہ مستعفی ہونے کے لیے مجبور کیے گئے ہیں حالانکہ نظام حیدرآباد ان پر کامل اعتماد رکھتے ہیں[3] گورنر جنرل کی دعوت پر سر والٹر دہلی پہنچے اور ماؤنٹ بیاٹن سے کہا کہ اتحادی پریس ان کا سخت مخالف ہوگیا ہے اور ان پر شدید حملے کیے جا رہے ہیں ایسی صورت میں وہ حیدرآباد کی

۱۔ V.P. Menon, On Integration — States p.320

۲۔ —Do— „ 320

۳۔ —Do— „ 322

کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ انھوں نے بتایا کہ مجلس کی شدید مخالفت کی بنا پر نواب چھتاری اور نواب علی یاور جنگ بھی وفد کی رکنیت سے مستعفی ہونے والے ہیں۔ سروالٹر نے اعلان کیا کہ وہ اپنے استعفے کو صرف اس صورت میں واپس لے لیں گے جب کہ نظام حیدرآباد "اتحادی" سرگرمیوں سے متعلق اپنی ناپسندی کا اعلان کریں۔ حضور نظام نے ایک فرمان جاری کیا جس میں ریاستی وفد پر مجلس کی جانب سے کیے گئے حملوں پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس طوفان کے بعد سروالٹر اور لارڈ ماؤنٹ بیاٹن میں طویل گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ حیدرآباد "دستاویز انضمام" کی بجائے "اقرار نامہ اشتراک" پر دستخط کرنے کو تیار تھا۔ لیکن وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل اس خصوصی موقف کے خلاف تھے وہ چاہتے تھے کہ تمام دیسی ریاستوں سے ایک ہی اصول کی بنا پر معاہدہ کیے جائیں[1]۔ ۲۷۔ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیاٹن نے حضور نظام سے خواہش کی کہ انضمام کے مسئلہ پر استصواب عامہ (REFRENDUM) کیا جائے[2] لیکن دوسرے ہی دن حضور نظام نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ ۸۔ستمبر سنہ ۱۹۴۷ء کو نواب چھتاری اور سروالٹر دہلی آئے اور تجویز پیش کی کہ دستاویز انضمام کے مقررہ مسودے کے بجائے نظام حیدرآباد سے ایسا معاہدہ کیا جائے جو شرائط دستاویز کے مطابق ہو اور بہ ظاہر مختلف بھی معلوم ہو۔ مرکزی حکومت کی جانب سے کہا گیا کہ ایسے مسودہ کو مرتب کیے بغیر اس مسئلہ پر غور نہیں ہو سکتا۔

۱۸۔ستمبر سنہ ۱۹۴۷ء کو حضور نظام نے گورنر جنرل کو مطلع کیا کہ انضمام کے مطالبہ پر حکومت ہند کو کچھ حاصل نہ ہوگا[3]۔ حیدرآباد صرف اقرار نامہ اشتراک کی تکمیل کا خواہش مند ہے اور اس سے زیادہ نہیں۔

اس کے بعد سر ظفر اللہ خاں کے توسط سے حضور نظام نے مسٹر جناح سے گفتگو جاری رکھنا چاہی لیکن سر ظفر اللہ خاں کی اقوام متحدہ کو روانگی کے بعد

1۔ V.P. Menon, On Integration of —— States P. No 322
2۔ —— Do —— ,, ,, 323
3۔ —— Do —— ,, ,, 323

یہ کارروائی ختم ہو گئی ہے[1]

حیدرآباد کا تیسرا وفد ۲۲-ستمبر سنہ ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچا اس مرتبہ سر سلطان احمد بھی وفد میں شریک تھے- وفد کی جانب سے وہی پرانی گفتگو رہی سر والٹر مانکٹن نے مسودہ "فہرست امور معاہدہ" مسٹر مینن کے حوالے کیا جو مرکزی حکومت کے خیال میں بالکل ناکافی تھے۔ ۲۴- ستمبر سنہ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیاٹن نے حکومت حیدرآباد کو مطلع کیا کہ فہرست امور معاہدہ ناقابل قبول ہیں- دہلی سے واپسی کے بعد سر والٹر نے لارڈ ماؤنٹ بیاٹن کو مطلع کیا کہ حضور نظام حکومت ہند سے غیر یقینی گفتگو کو ختم کرنا چاہتے ہیں اتحادی اثرات سے وہ اس قدر متاثر ہیں کہ پاکستان سے تعلقات قایم کرنا چاہتے ہیں- انھیں ہدایت دی گئی ہے کہ وہ یکم اکتوبر کو کراچی میں مسٹر جناح سے ملاقات کریں[2]

۱۰- اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء کو حیدرآبادی وفد جو نواب چھتاری سر سلطان احمد وغیرہ پر مشتمل تھا دہلی پہنچا- حکومت ہند جنوب میں امن و امان قایم رکھنا چاہتی تھی اور حیدرآباد کی کمزور حکومت کو جو امن و امان کی بحالی میں ناکام ہو چکی تھی کچھ سہارا لینا چاہتی تھی اس غرض سے ایک عارضی معاہدہ "معاہدہ جاریہ" (STAND STILL AGREMENT) مرتب کیا گیا اور ۲۲- اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء کو ریاستی وفد کے حوالے کیا گیا- ریاستی وفد نے وعدہ کیا کہ نظام حیدرآباد کی دستخط حاصل کر کے ۲۶- اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پھر دہلی آئے گا[3] ۲۲ تا ۲۵- اکتوبر تک نظام کی اگزیکیوٹیو کونسل نے اس معاہدہ پر غور کیا اور تین آرا کے مقابل چھ آرا سے طے پایا کہ معاہدہ جاریہ پر دستخط کرنے کے لیے حضور نظام سے سفارش کی جائے- ۲۵- اکتوبر کی شام میں ریاستی وفد کنگ کوٹھی میں باریاب ہوا اور حضور نظام کو اگزیکیوٹیو کونسل کے تصفیہ سے آگاہ کیا ساتھ ہی صدر اعظم باب حکومت کا معروضہ بھی پیش کیا گیا- نواب میر عثمان علی خاں نے اگزیکیوٹو کونسل کی توثیق کی لیکن معاہدہ پر دستخط کو دوسرے دن

۱- V P Menon, On Integration of — States P. 328

۲- —— Do —— " 328

۳- —— Do —— " "

کے لیے ملتوی رکھا[1] ۲۶-اکتوبر کو جب وفد نے معاہدہ پر دستخط کے لیے توجہ دلائی تو دستخط کو دوسرے دن صبح تک ملتوی کر دیا گیا[2] حالانکہ دوسرے دن صبح ہی وفد کو دہلی پرواز کرنا تھا۔

۲۷-اکتوبر کی صبح میں تین بجے حیدرآباد کی سڑکوں پر اچانک سرگرمی شروع ہوئی۔ بڑے بڑے ٹرکس میں رضا کار بیٹھے لاوڈ اسپیکرس سے اعلان کر رہے تھے" اٹھو زمانہ چال قیامت کی چل گیا"

"تمھاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

" خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا"

برادران ملت سے کہا گیا کہ سلطنت کا سودا ہو گیا ہے اور ملت کی تقدیر مکفول ہونے والی ہے اس لیے وہ سر سے کفن باندھ کر وفد کے اراکین کے گھروں پر پہنچ جائیں اور حلقہ ڈال دیں تاکہ وہ طیران گاہ نہ پہنچ سکیں۔ ادھر کچھ لوگ طیران گاہ پہنچ گئے اور رن وے پر قبضہ کر لیا اور نعرے لگانے لگے کہ" رک جاؤ۔ دہلی نہیں جا سکتے" سر والٹر مانکٹن۔ نواب چھتاری اور سر سلطان احمد کی قیام گاہوں پر جو شاہ منزل (موجودہ راج بھون) کے متصل واقع تھیں۔ پچیس تا تیس ہزار افراد نعرے لگاتے ہوئے جمع ہو گئے حیدرآباد کی سٹی پولیس کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ حالانکہ صدر اعظم بہادر کی سرکاری قیام گاہ مظاہرین سے محصور ہو چکی تھی۔ تقریباً صبح کے پانچ بجے لاچار صدر اعظم نواب چھتاری نے جنرل العیدروس سے ربط قایم کیا جنھوں نے وفد کے معزز اراکین کو ان کی قیام گاہوں کے پچھلے دروازوں سے نکال کر حیدرآباد آرمی کے ایک برٹش افسر کے مکان پہنچا دیا[3] چند گھنٹوں کے بعد نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کا فرمان جاری ہوا کہ ریاستی وفد ابھی کچھ دن تک اپنا دورہ

---

1. V.P. Menon, On Integration of — States P-328

2. —Do— "

3. —Do— "

دہلی ملتوی رکھے گا۔اس فرمان کی اطلاع بہ ذریعہ ٹیلیگرام جنرل کو دی گئی کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر حیدرآبادی وفد دہلی نہ آسکا اور ۳۰۔یا ۳۱۔اکتوبر تک وفد دہلی پہنچ جائے گا۔ گورنر جنرل نے پروگرام کی اس تبدیلی کو قبول کرلیا۔

۲۷۔ اکتوبر کی سہ پہر میں حیدرآبادی وفد کو قصر کنگ کوٹھی میں باریابی کا موقع دیا گیا۔ مجلس کے صدر قاسم رضوی بھی موجود تھے۔نظام بہت مشتعل اور ناراض دکھائی دے رہے تھے اور اپنی گرجدار آواز میں بار بار کہہ رہے تھے کہ میری اگزیکیوٹیو کونسل کا تصفیہ مجلس کو ماننا پڑے گا۔ قاسم رضوی نے عرض کیا کہ وہ وفد کے اراکین سے مطمئن نہیں ہیں اور دہلی سے گفتگو کے لیے نئے اراکین مقرر کیے جائیں۔ انھوں نے دعوا کیا کہ حکومت ہند کو وہ مجبور کریں گے کہ جو معاہدہ اس نے مسترد کردیا ہے اس پر عمل کیا جائے [1] ان کے خیال میں کشمیر پر قبائیلوں کے حملے کے باعث حکومت ہند اس قدر سراسیمہ ہوگئی تھی کہ وہ کوئی کارروائی حیدرآباد کے خلاف نہیں کرسکے گی۔ اتحادین کی جانب سے عام جلسوں میں یہ کہا گیا کہ نواب چھتاری یو۔پی کے بڑے زمیندار ہیں اس لیے وہ نہ صرف ہندوستان کے ایک باشندے ہیں بلکہ اپنے مفادات کی خاطر وہ حیدرآباد کی بہتر خدمت نہیں کرسکتے۔حیدرآباد کے مفادان کے ہاتھ میں محفوظ نہیں ہے۔سر سلطان احمد کے متعلق بھی یہی کہا گیا کہ وہ ہندوستان کے باشندے ہیں اور ان کے اغراض ہندوستان سے وابستہ ہیں۔سر والٹر کے متعلق یہ کہا گیا کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیاٹن کے قریبی دوست ہیں اور وہ اپنے دوست کو ہندوستان کا ہیرو بنانے کے لیے حیدرآباد کی قربانی دے رہے ہیں غرض ان "غیر ملکیوں" پر شدید حملے کیے گئے اور پولٹیکل گفتگو کے لیے ملکیوں کا انتخاب کیا گیا جو نہ حیدرآباد کے حقیقی نمایندے تھے اور نہ کوئی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔حیدرآباد کے ناخدا وہ لوگ مقرر ہوئے جو نہ ہوا کی رخ کو جانتے تھے اور نہ طوفان کی شدت کا اندازہ کرسکتے تھے۔

ابتداً نواب چھتاری اور سر والٹر مانکٹن نے حضور نظام کو یہ سمجھانے کی کوشش

---

[1] V.P. Menon on Integration of — States P.329

کیونکہ مسٹر قاسم رضوی کا طریق عمل خودکشی کے مماثل ہے۔ لیکن ان دلائل کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ایسی حالت میں نواب چھتاری۔ سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد وفد کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔[1] ۳۰۔ اکتوبر کو حضور نظام نے سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد سے آخری ملاقات کی۔ حضور نظام نے دہلی کی ناتمام گفتگو کو جاری رکھنے کے لیے ایک وفد منتخب کیا جس کی قیادت نواب معین نواز جنگ کے سپرد کی گئی۔ اراکین وفد کی حیثیت سے عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ رامار یڈی نائب صدر اعظم مقرر کیے گئے نواب معین نواز جنگ اس وقت صدر المہام پولیس اور اطلاعات تھے۔ عبدالرحیم صاحب حیدرآباد ہائیکورٹ کے ایک سینیر ایڈوکیٹ تھے۔ پنگل وینکٹ رامار یڈی حیدرآباد کے ریڈی فرقہ کے ایک سرمایہ دار رکن تھے۔ زراعتی اور تجارتی حلقوں میں ان کا کافی اثر تھا۔ مسٹر عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ رامار یڈی کے انتخاب کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگزیکیوٹیو کونسل میں معاہدہ جاریہ کے خلاف انھوں نے معین نواز جنگ کے ساتھ ووٹ دیا تھا۔[2] لارڈ ماؤنٹ بیاٹن کو نئے وفد کے انتخاب پر بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن سردار ولبھ بھائی پٹیل اس وفد کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ نئے وفد سے کسی بات چیت کے قایل ہی نہ تھے۔ ۳۱۔ اکتوبر کو حیدرآبادی وفد دہلی آیا اور شام میں لارڈ ماؤنٹ بیاٹن سے ملاقات ہوئی۔ گورنر جنرل قدیم مسودہ پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، جو ایک بار مسترد کر دیا گیا تھا۔ معین نواز جنگ پچھلے وفد سے جو گفتگو ہوئی تھی اس کی تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ گورنر جنرل نے انھیں جواب دیا کہ وہ تمام تفصیلات سر سلطان احمد سے حاصل کرلیں جو ان دنوں دہلی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔[3]

۲۔ نومبر کو حیدرآبادی وفد پھر دہلی آیا۔ نواب معین نواز جنگ معاہدہ جاریہ کے مسودہ میں کچھ ترمیم کرنا چاہتے تھے گورنر جنرل نے صاف کہہ دیا کہ مسودہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی کیونکہ دونوں حکومتوں نے اس کو پہلے ہی منظور کرلیا ہے انھوں

V. P. Menon, On Integration of — states P. 330 [1]

— DO — 330 [2].

— DO — [3]

نے نواب معین نواز جنگ سے کہہ دیا کہ حکومت ہند کشمیر کے جھگڑے سے ہرگز پریشان نہیں ہے اور اگر حیدر آبادی وفد کوئی ایسا خیال رکھتا ہے تو وہ محض ایک خوش فہمی ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیاٹن نے وضاحت کی کہ معاہدہ جاریہ جس صورت میں کہ وہ منظور کیا گیا ہے وہ دستخط کرنے کو تیار ہیں ورنہ گفتگو کے ختم ہونے کی ذمہ داری حیدر آبادی وفد پر رہے گی۔

نواب معین نواز جنگ حکومت ہند کو کسی صورت میں اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔ آخر کار انھوں نے وی۔پی۔ مینن سے کہا کہ مسودہ انضمام میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضروری ہے ورنہ حیدر آبادی وفد کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حیدر آباد میں وفد پر بڑی نکتہ چینی کی جائے گی۔ وی۔پی۔ مینن نے جواب دیا کہ یہ صورت حال خود حیدر آباد نے پیدا کی ہے اب وقت آگیا ہے کہ حضور نظام اپنے طور پر فیصلہ کریں کہ آیا وہ خود حیدر آباد کے حاکم ہیں یا عنان اقتدار اتحادی قائدین کے ہاتھ میں ہے تو اگر دراصل اقتدار اتحادی قائدین کے ہاتھ میں ہے تو حکومت ہند نظام حیدر آباد کی کوئی مدد نہیں کر سکتی[1] نظام مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ ان حالات میں مزید گفت و شنید وقت کی بربادی ہے۔ مسٹر مینن کی گفتگو سے مایوس ہو کر نواب معین نواز جنگ نے لارڈ ماؤنٹ بیاٹن سے گفتگو کرنا ضروری سمجھا۔ ماؤنٹ بیاٹن نے واضح طور پر حیدر آباد وفد سے کہہ دیا کہ معاہدہ جاریہ پر نظام کی دستخط نہ ہونا ہندوستانی حکومت کے لیے محض ایک رسمی بات ہے لیکن حیدر آباد کے لیے تو یہ مسئلہ اس کی سلامتی کا مسئلہ ہے[2]

ان مایوس کن حالات میں نومبر سنہ ۱۹۴۷ء میں نواب چھتاری صدارت اعظمیٰ سے مستعفی ہو گئے اور اپنے وطن واپس چلے گئے۔ نواب مہدی یار جنگ کو منصرم صدر اعظم مقرر کیا گیا۔ نواب مہدی یار جنگ دیکم دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

V.P. Menon, On Integration of states P— 332 [1]

— Do — P— 333 [2]

نواب چھتاری کے صدارت اعظمیٰ سے استعفیٰ کے بعد اس عہدہ جلیلہ کے لیے مجلس اتحاد المسلمین کے دو امیدوار تھے ایک میر لائق علی اور دوسرے زاہد حسین میر لائق علی ایک ملکی اور حیدرآباد کے ممتاز تاجر تھے۔ انھوں نے اقوام متحدہ میں ایک بار پاکستان کی نمایندگی بھی کی تھی۔ مسٹر زاہد حسین ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ حضور نظام نے مسٹر جناح سے مشورہ لیا۔ جنھوں نے ان دونوں امیدواروں کو پسند نہیں کیا[1] لیکن قاسم رضوی کی پرزور سفارش پر میر لائق علی کو صدر اعظم مقرر کیا گیا[2]

میر لائق علی حیدرآباد کے آخری صدر اعظم

یکم دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء کو میر لائق علی نے بحیثیت صدر اعظم اپنے عہدہ کا حلف لیا۔ میر لائق علی کا نام مجلس نے اپنے نمایندے کے طور پر پیش کیا تھا۔ جو مسٹر غلام محمد (وزیر مالیات پاکستان) کے انکار کے بعد سب سے موزوں ملکی امیدوار سمجھے گئے تھے۔ عہدہ وزارت قبول کرنے سے پہلے میر لائق علی نے مسٹر جناح سے اجازت حاصل کی اور مسٹر جناح نے صرف ایک سال کے لیے اس عہدہ کو قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ میر لائق علی حیدرآباد کے ایک مشہور صنعت کار تھے اور عرصہ سے مجلس کی مالی امداد کر رہے تھے۔ اپنے صنعتی حلقہ میں میر لائق علی کے کئی ہندو دوست احباب تھے اس لیے توقع تھی کہ وہ تمام سیاسی جماعتوں کے درمیان بطور ثالث کام کریں گے۔ اس توقع کی ایک وجہ سیاسی نظربندوں کی رہائی تھی جو میر لائق علی کے کارگزار ہونے کے بعد تیزی سے جاری رہی۔ لیکن یہ توقع بہت جلد ختم ہو گئی۔ میر لائق علی یا تو بہت کمزور پالیسی کے آدمی تھے یا پھر وہ اتحادین کے اثر کی وجہ سے بالکل مفلوج ہو گئے تھے۔ ان میں اپنے طور پر کوئی تحریک شروع کرنے یا کسی موقع پر خود حالات

۱۔ V.P. Menon, On Integration of States P-332

۲۔ —DO— P-333

کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ صدارت اعظمیٰ کے سرکاری اختیارات بڑی حد تک نواب معین نواز جنگ کو حاصل ہو گئے تھے جو مجلس کے مشیر بھی تھے اور معاون بھی دراصل میر لائق علی نے صدارت اعظمیٰ کے عہدہ کو محض اس لیے قبول کیا تھا کہ مناسب وقت پر اس کو اپنے برادر نسبتی (معین نواز جنگ) کے حوالے کر سکیں۔ اس مقصد کے تحت نواب معین نواز جنگ سے سینیر کئی سابق وزرا کو نئی وزارت میں شریک نہیں کیا گیا۔ نئی وزارت چار ہندو اور چار مسلم وزرا پر مشتمل تھی۔ ہندو طبقہ کی نمایندگی چار غیر معروف اصحاب کو دی گئی جن کے نام اور پتہ سے کوئی واقف نہ تھا۔ نواب چھتاری کی کچھ عینت حکومت کی جگہ ملکیوں کی ایک غیر معروف اور ناتجربہ کار ٹولی نے عنان حکومت سنبھال لیا۔ اور "حکیم السیاست" کو محض "مظہر اقتدار" کا نام دے دیا۔

میر لائق علی کی حکومت کے قیام کے بعد ایک وفد ۲۴۔ نومبر ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچا لیکن اپنی سعی محکم میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر ۲۹۔ نومبر سنہ ۴۷ ۱۹ء کو حضور نے Stand Still Agrement (معاہدہ جاریہ) پر اپنی دستخط ثبت کر دیے۔[1]

معاہدہ جاریہ کے شرائط کے تحت حکومت ہند نے مسٹر کے ایم۔ منشی کو حیدرآباد میں اپنا ایجنٹ جنرل مقرر کیا۔ مسٹر منشی سنہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک بمبئی کے کانگریسی حکومت میں وزیر داخلہ رہ چکے تھے۔ مسٹر منشی کے تقرر پر اتحادی پریس اور مسٹر قاسم رضوی نے شدید مخالفت شروع کر دی۔ حکومت نظام کی جانب سے ایجنٹ جنرل کے قیام کے لیے کوئی بنگلہ الاٹ نہیں کیا گیا تھا ایسی صورت میں حکومت ہند نے مسٹر منشی کو بلارم یا چادر گھاٹ رزیڈنسی میں قیام کی اجازت دے دی۔ اس اعلان پر رضوی نے کہا کہ رزیڈنسی کے تمام پتھر رودموسیٰ میں بہا دیے جائیں گے۔ معاہدہ کی سیاہی ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ حکومت نظام نے دو آرڈیننس جاری کیے جن کی رو سے معدنیات کو حیدرآباد

---

[1] V.P Menon, On Integration of States P. 333

سے باہر لے جانے پر پابندی قایم ہوئی اور ہندوستانی کرنسی کو قلمرو نظام میں غیر قانونی زرمبادلہ قرار دیا گیا[1] اس پر اور ستم یہ ہوا کہ حکومت نظام نے پاکستان کو بیس کروڑ روپے کے ہندوستانی تمسکات بطور قرضہ حوالے کر دیے۔ قرضہ کی یہ پیش کش معین نواز جنگ کے توسط سے ہوئی جو دہلی سے گفت و شنید میں حیدرآبادی وفد کی قیادت بھی کر رہے تھے[2] کراچی میں حیدرآباد کی جانب سے ایک پبلک ریلیشن افسر مقرر کیا گیا اور حکومت ہند کو اس سلسلہ میں قبل از قبل اطلاع نہیں دی گئی[3] لائق علی وزارت کی تشکیل کے بعد مسٹر سید قاسم رضوی کو حیدرآباد کی سیاست میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی۔ میر لائق علی کے صدر اعظم ہونے کے کچھ دن بعد مسٹر رضوی نے اپنی ایک تقریر میں اعلان کیا کہ

> "کینا کماری کی لہریں بہت جلد اعلی حضرت بندگان اقدس کی پابوسی کریں گی اور دہلی کے لال قلعہ پر آصف جاہی پرچم اپنے پورے آب و تاب سے لہرائے گا"[4]

مسٹر رضوی نے اس عسکری شان کو قایم کرنے کے لیے رضاکاروں کی بھرتی شروع کی اور ہر محلہ و بستی میں لار رضا کار، رضاکاروں کو تربیت دینے لگے۔

میر لائق علی کے وزیر اعلیٰ مقرر ہونے کے چند روز بعد سید قاسم علی دہلی روانہ ہوئے اور سردار پٹیل، وی۔پی مینن وغیرہ سے گفتگو کی۔ وی۔پی مینن نے مسٹر رضوی کو اپنی خاطر اور ریاست کے بہترین مفادات کے لیے دانش مندی سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ حیدرآباد واپس آنے کے بعد رضوی نے ہندوستانی حکومت اور ہندوستانی قائدین کے متعلق بڑی اشتعال انگیز تقاریر شروع کیں۔ مہاتما گاندھی کے تعزیتی جلسہ میں جو نظام کالج میں نواب اکبر جنگ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا

---

1. V. P. Menon, On Integration of State. P- 334
2. —Do— ، 334
3. —Do— ، 339
4. —Do— ، 339

رضوی نے اعلان کیا کہ " اہمسا کیا ہے یہ دکن کے مسلمانوں سے پوچھیے۔ہندوستانی فوجیں جب حیدرآباد آئیں گی تو وہ یہاں صرف مسلمانوں کی راکھ دیکھیں گی۔اس سے بڑھ کر ہم اور کیا اہمسا کے نذر کر سکتے ہیں۔" اس تقریر کی بنا پر جلسہ میں ایک ہنگامہ ہوگیا اور مہاتما گاندھی کا تعزیتی جلسہ بڑی افراتفری کے ساتھ ختم ہوا۔ایک دوسری تقریر میں انھوں نے الزام لگایا کہ حکومتِ ہند ہندو طبقہ کو مسلح کر رہی ہے اور یہ کہ مجلس اتحاد المسلمین ہندوستان کے مسلمانوں کی نجات دہندہ ہے۔مسٹر کے۔ایم منشی نے میر لائق علی صدر اعظم سے مجلس اتحاد اور رضاکاروں کے متعلق کئی بار گفتگو کی لیکن یہ گفتگو بے اثر رہی۔ لائق علی میں نہ اتنی لیاقت تھی اور نہ سکت کہ رضاکاروں کے مقابل کھڑے ہوتے وہ اپنی جان اور جائیداد کی فکر میں غلطاں تھے۔

۴۔ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء کو میر لائق علی اپنے وفد کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے۔ پہلی ہی ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیاٹن نے انھیں مطلع کر دیا کہ سردار پٹیل کی یہ قطعی رائے ہے کہ حیدرآباد میں ذمہ دارانہ حکومت قایم کی جائے جو ارباب دہلی سے ذمہ دارانہ طور پر گفتگو کر سکے۔ ایک غیر ذمہ دارانہ حکومت سے گفتگو قطعی ناممکن ہے یہ[1] انہی دنوں سردار پٹیل کے قلب پر حملہ ہوا اور حیدرآبادی وفد واپس آگیا۔ دہلی کے بدلے ہوئے ماحول کے پیش نظر میر لائق علی چاہتے تھے کہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح سب کچھ داؤ پر لگا دیں۔انھوں نے تمام ریاستی جماعتوں کی ایک گول میز کانفرنس طلب کرنے کی تجویز پیش کی لیکن مسٹر رضوی نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔سوامی رامانند تیرتھ صدر اسٹیٹ کانگریس کو طویل نظربندی سے رہا کیا گیا۔اسٹیٹ کانگریس نے ایک قرارداد منظور کی کہ جب تک ریاست میں ذمہ دارانہ حکومت قایم نہ ہو اور حضور نظام انضمام ریاست کو تسلیم نہ کریں کانگریس کی تحریک بدستور جاری رہے گی[2] اس قرارداد کے منظور ہونے کے بعد سوامی رامانند تیرتھ دیگر کانگریسی قائدین کے ساتھ پھر نظربند کر دیے گئے میر لائق علی

---

[1] V.P. Menon, On Integration of States P-352

[2] —— Do ——

اور نواب معین نواز جنگ نے مسٹر کے۔ ایم۔ منشی سے کئی ملاقاتیں کیں اور صورت حال کی وضاحت کی لیکن حالات میں کوئی بہتری نہ ہو سکی۔ سرحدی علاقوں میں تشدد کی وارداتیں بڑھنے لگیں۔

میر لائق علی نے ۱۵۔ اپریل سنہ ۱۹۴۸ء کو مسٹر نہرو سے ملاقات کی لیکن مسٹر نہرو ذمہ دارانہ حکومت کے قیام پر اصرار کرتے رہے[1] اور یہی مطالبہ دوسرے دن سردار پٹیل نے دہرایا۔ حکومت نظام کی جانب سے مصالحتی گفتگو کو طوالت دی جاتی رہی۔ حتیٰ کہ ۲۱۔ جون سنہ ۱۹۴۸ء کو لارڈ ماؤنٹ بیاٹن انگلستان واپس ہوئے اور شری سی۔ راج گوپال چاری گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ حکومت نظام نے لارڈ ماؤنٹ بیاٹن کے خلوص اور ان کے بہترین مشوروں کو نظر انداز کر دیا حالانکہ ماؤنٹ بیاٹن ان حالات میں حضور نظام کے بہترین دوست اور مددگار ہو سکتے تھے۔ حیدرآبادی وفد کو لارڈ ماؤنٹ بیاٹن نے جو مراعات عطا کیں وہ کسی اور گورنر جنرل کے بس کی بات نہ تھی۔

ہندوستانی افواج کا حیدرآباد کے خلاف پولیس ایکشن

۱۱۔ ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء کو وجے واڑہ اور شولاپور سے ہندوستانی افواج کو حیدرآباد میں داخل ہونے اور بلارم تملگیری کے بیرکس میں پھر سے ٹھہرنے کے احکام دیے گئے۔ لیکن مسٹر جناح کے اچانک انتقال کی وجہ سے "کوچ" کا یہ حکم ۱۵۔ ستمبر تک ملتوی رہا[2] ۱۳۔ ستمبر کو صبح تین بجے ہر دو سمت سے ہندوستانی افواج نے پیش قدمی شروع کر دی۔ نلدرگ کے مقام پر حیدرآبادی افواج اور رضاکاروں نے کچھ دیر مزاحمت کی لیکن بعد ازاں حیدرآبادی فوج مورچے سنبھال نہ سکی۔ تمام اضلاع کے ۵۰ر مقام بغیر مزاحمت کے ہندوستانی افواج کے قبضہ میں آ گئے اور ریاستی عوام کو عثمان آباد بیدر اور لاتور میں جانی نقصان

---

1. V.P. Menon, On Integration of States P-344
2. —— DO —— „ 346

اٹھانا پڑا۔ ۱۷۔ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر میں حضور نظام میر عثمان علی خاں نے دکن ریڈیو حیدرآباد سے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ریاستی افواج کو جنگ بندی کا حکم دیا گیا ہے اور ہندوستانی افواج بلارم اور تلملگیری کے بیرکس میں پھر سے قیام کر سکتی ہیں۔ رضاکار تنظیم کو غیر قانونی قرار دیا گیا اور ریاست میں جلد از جلد ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

مسٹر کے۔ ایم منشی جو شاہ منزل سے قریب گرین لینڈ گیسٹ ہاوس میں نظر بند تھے رہا کیے گئے اور حضور نظام نے عارضی حکومت کی تشکیل کے متعلق ان سے گفتگو کی۔ عوامی نمایندوں کی حیثیت سے شری راما چاری اور مولوی ابوالحسن سید علی اور پنا لال پتی کے نام بحیثیت وزرا تجویز کیے گئے۔ حکومتِ ہند کی جانب سے مسٹر کے۔ ایم۔ منشی کو ہدایت دی گئی کہ وہ حکومت ہند کی جانب سے حضور نظام کو کوئی تیقن نہ دیں اور یہ کہ جنرل چودھری حیدرآباد کے ملٹری گورنر ہوں گے۔ اور تمام انتظامات کی نگرانی خود ملٹری گورنر کریں گے۔[1]

اس زمانہ میں شریمتی سروجنی نائیڈو بحیثیت گورنر یو۔ پی کارگزار تھیں۔ جب انھیں پولیس ایکشن کے کامیاب اختتام کی اطلاع راج بھون لکھنؤ میں دی گئی تو انھوں نے بیساختہ کہہ دیا کہ

> "مجھے خوشی ہے کہ ایک جھگڑا ختم ہوا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے حیدرآباد کو شکست ہوئی۔"

سچ تو یہ ہے کہ تمام حیدرآبادیوں کا یہی احساس تھا۔

۱۸۔ ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء کو ہندوستانی افواج میجر جنرل جے۔ این۔ چودھری کی قیادت میں سکندرآباد میں داخل ہوئیں۔ ۱۹۔ ستمبر کو سید قاسم رضوی کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب کہ وہ مجلس اتحاد المسلمین کے ہیڈ کوارٹر دارالسلام میں اپنے صدارتی کمرہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میر لائق اور ان کے تمام ساتھی وزرا ۱۹۔ ستمبر کے بعد اپنے اپنے مکانوں میں نظر بند کر دیے گئے۔ سابق وزرا فوجی حکومت کی اجازت کے بغیر اپنے گھروں سے باہر نہیں جا سکتے تھے اور نہ کسی سے ربط قایم رکھ سکتے تھے۔ البتہ ان کے اراکین خاندان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

---

1. V.P. Menon, On Integration of States P-354 [1]

سید قاسم رضوی پر شعیب اللہ کے قتل اور بی بی نگر کے ڈکیتی کے سلسلہ میں مقدمہ چلایا گیا۔ آخر الذکر مقدمہ میں انھیں ہائیکورٹ سے سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ سزا کے اختتام کے بعد وہ پاکستان روانہ ہوئے جہاں انھوں نے انتقال کیا۔

پولیس ایکشن کے بعد ریاست کا انتظام

پولیس ایکشن کے اختتام کے بعد نظم و نسق کی نگرانی میجر جنرل جے - این چودھری نے سنبھال لی۔ ان کی مدد کے لیے چند ہندوستانی ایڈمنسٹریٹرس طلب کیے گئے۔ آصف سابع کے تمام اعزازات بدستور قایم رہے البتہ ذریعہ فرمان جنرل چودھری کو ریاست کے وزیر اعلا یعنی صدر اعظم کے تمام اختیارات سپرد کیے گئے۔

حضور نظام کے نام جنرل چودھری کا ایک اہم خط

یکم فروری سنہ ۱۹۴۹ء کو ملٹری گورنر نے حکومت ہند کی جانب سے ایک خط حضور نظام کو لکھا[1] جس میں ریاست اور والی ریاست کے ساتھ حکومت ہند کے آیندہ تعلقات کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس بات کی وضاحت کی گئی کہ والی ریاست کے آیندہ درجہ اور پوزیشن کے متعلق تصفیہ ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے ذمہ رہے گا۔ البتہ جہاں تک جیب خاص، خطابات اور مراعات کا تعلق ہے وہ حسب دستور قایم اور برقرار رہیں گے۔ اور حکومت ہند ان امور کی برقراری کے لیے مناسب تعاون کرے گی۔ خاندان شاہی کے تحفظ اور مسئلہ جانشینی سے متعلق امور میں والی ریاست کی رائے کو اہمیت دی جائے گی۔ اور ان امور سے متعلق آیندہ ایک مستقل معاہدہ ترتیب دیا

---

[1] V.P. Menon, On Integration of States P-376

جائے گا جس سے ریاست اور مرکز کے درمیان سیاسی اور معاشی پالیسی کی وضاحت کی جائے گی۔ جنرل چودھری نے شاہی خاندان کے آیندہ تحفظ اور انتظام کے لیے ٹرسٹ کے قیام کی تجویز بھی پیش کی۔ جنرل چودھری نے اس بات کی وضاحت کردی کہ صرف خاص کو موجودہ حالت میں برقرار نہیں رکھا جاسکتا کیوں کہ ریاست کے نظم و نسق میں یہ دوعملی مناسب نہیں ہے۔ صرف خاص کو دیوانی میں ضم کیا جائے گا۔ اور حضور نظام کو پچیس لاکھ روپے بطور معاوضہ صرف خاص ہر سال ادا کیے جائیں گے۔

جنرل چودھری نے اپنے اس خط کو ان الفاظ میں ختم کیا کہ :۔

" یہ چند تجاویز اس قابل ہیں کہ یور اگزالٹیڈ ہائینس ان کو قبول فرمائیں تاکہ اندرون ریاست اور ہندوستان میں آپ کی عزت اور احترام میں اضافہ ہو سکے۔"

والی ریاست کے جیب خاص امتیازات وغیرہ سے متعلق حکومتِ ہند سے جدید معاہدہ

۲۵ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء یعنی نفاذ دستور ہند سے صرف ایک دن قبل حضور نظام اور حکومت ہند کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے بموجب قرار پایا کہ دستور ہند جس صورت میں کہ ہندوستانی قانون ساز مجلس نے منظور کیا ہے۔ وہ دیگر دیسی ریاستوں کی طرح ریاست حیدرآباد میں بھی نافذ ہوگا۔[1] جہاں تک ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو حاصل شدہ مراعات۔ استحقاق۔ امتیازات۔ جیب خاص مسئلہ جانشینی وغیرہ کا تعلق ہے اس کا تصفیہ علاحدہ معاہدہ کے ذریعہ کیا جائے گا۔ معاہدہ کا فقرہ دوم ریاست کے مالیہ میں اصلاح سے متعلق تجاویز پر مشتمل ہے۔ فقرہ سوم اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس

ع1 V. P. Menon, On Integration of States P. 377

حضور نظام اوران کے اراکین خاندان کو وہ تمام مراعات اور امتیازات اندرون وبیرون ہندوستان حاصل رہیں گے جو ۱۵-اگست سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل انھیں حاصل تھے۔ فقرہ چہارم میں مندرج ہے کہ حکومت ہند اس امر کا تیقن دیتی ہے کہ حضور نظام کے جانشین کا مسئلہ قانون اور ریاست کے رواج کے مطابق طے کیا جائے گا۔ فقرہ ۳ اور ۴ کا منشا یہ تھا کہ حکومت ہند نہ صرف گدی" کو برقرار رکھے گی بلکہ گدی نشین" کے اعزاز و مراتب کا حسب دستور خیال رکھا جائے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ (یکم اپریل سنہ ۱۹۵۰ء سے حضور نظام پچاس لاکھ روپے سالانہ جیب خاص حاصل کریں گے اور یہ جملہ رقم ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ رہے گی۔ جیب خاص کی یہ رقم چار یہ سہ ماہی اقساط میں پیشگی ادا کی جائے گی اور حکومت ہند ادائی جیب خاص کی ضامن رہے گی۔ اس امر کی بھی صراحت کی گئی کہ متذکرہ صدر جیب خاص صرف موجودہ نظام حیدرآباد کو تاحیات ادا کیا جائے گا البتہ ان کے جانشین کے لیے علاحدہ جیب خاص مقرر کیا جائے گا جس کی صراحت جدید معاہدہ میں کی جائے گی جنرل چودھری نے اپنے خط میں جیب خاص کی رقم سوا کروڑ روپے تجویز کی تھی جو مختلف مدات کے تحت قابل ادائی تھی لیکن معاہدہ میں صرف پچاس لاکھ روپے سالانہ جیب خاص مقرر کیا گیا جس میں تمام مدات شامل تھے۔ رقم جیب خاص میں آئندہ اضافہ کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی۔ معاہدہ میں اس امر کی وضاحت کی گئی کہ تاریخ معاہدہ تک وہ تمام جائیداد منقولہ۔ غیر منقولہ جواہرات۔ زیورات۔ شیرز۔ تمسکات اور دیگر اثاثہ جات جو حضور نظام کی ملکیت ہیں وہ آیندہ بھی حضور نظام کی ملکیت رہیں گی۔ حضور نظام نے اپنی تمام جائیداد منقولہ۔ غیر منقولہ۔ جواہرات وغیرہ کی فہرست حکومت ہند کے پاس روانہ کردی ہے۔ اگر آیندہ کسی جائیداد کے متعلق یہ نزاع پیدا ہو کہ وہ جائیداد نظام کی شخصی جائیداد ہے یا ریاست حیدرآباد کی تو اس نزاع کا تصفیہ حکومت ہند کے مقرر کردہ ثالث کے ذمہ رہے گا۔ ثالث کا فیصلہ تمام فریقین کے لیے قطعی اور قابل پابندی ہوگا۔ بعد میں مراسلہ مورخہ یکم فروری سنہ ۱۹۵۰ء کے تحت اس بات کی وضاحت کی گئی کہ ثالث کا تقرر حضور نظام سے مشاورت کے بعد عمل میں آئے گا۔ معاہدہ میں اس امر کی

وضاحت کی گئی کہ تمام مراعات اور امتیازات کے ساتھ خطاب "ہز اگزالٹیڈ ہائنس نظام حیدرآباد" برقرار رہے گا۔

اس معاہدہ سے متعلق ایک تنقیدی مقالہ " Ruler To Rajpramukh " حضور نظام کے مالیاتی ایڈوائزر کی جانب سے کلر بچ اینڈ کمپنی کے توسط سے شائع کیا گیا ہے جس میں کمترین جیب خرچ کی بنا پر حضور نظام کی مالیاتی دشواریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

حیدرآباد میں پہلی ذمہ دارانہ حکومت

۲۰۔جون سنہ ۱۹۵۰ء کو حیدرآباد میں پہلی ذمہ دارانہ حکومت تشکیل دی گئی۔ اس حکومت کے سربراہ یعنی چیف منسٹر مسٹر ایم۔کے۔ ولوڈی مقرر کیے گئے دیگر وزرا میں نواب زین یار جنگ۔ شری بی رام کشن راؤ۔ شری ونایک راؤ ویدیالنکار۔ شری بی۔ وی راجو اور شری پھول چند گاندھی قابل ذکر ہیں۔ یہ پہلی ذمہ دارانہ حکومت آٹھ وزرا پر مشتمل تھی۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں بی۔ رام کشن راؤ کی سرکردگی میں کابینہ تشکیل دی گئی۔

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع تقریباً چھ سال بحیثیت راج پرمکھ کارفرما رہے اس زمانہ میں انھوں نے اپنی روایتی مطلق العنانی کی جگہ خود کو ایک دستور پسند سربراہ ریاست ثابت کیا۔ اب وزرا ریاست ان کے آگے جواب دہ نہ تھے بلکہ وہ مجلس مقننہ اور عوام کے آگے جواب دہ تھے۔ ہندوستانی سماج کئی فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں پر مشتمل رہا ہے۔ مذہب اور علاقائی زبانوں نے بہت جلد سیاسی جماعتوں اور قانون ساز اداروں میں اہمیت حاصل کرلی۔ حیدرآباد میں تین مختلف زبانوں یعنی تلگو۔ مراٹھی اور کنڑی کا سنگم رہا ہے۔ علاقائی زبانوں کے صوبوں کی تشکیل کے بعد اس مشترکہ سہ لسانی ریاست کے ٹکڑے کر دیے گئے اور حیدرآباد کا کم و بیش ہر خاندان ان تین علاقائی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔

جدید ریاست آندھرا پردیش کا قیام

یکم نومبر سنہ ۵۶ ۱۹ء کو قدیم "شاہ منزل" اور جدید "راج بھون" میں جس وقت گورنر آندھرا پردیش شری چندو لعل تریویدی اپنے وزراء کو حلف وفاداری اور رازداری دے رہے تھے اس وقت کنگ کوٹھی میں حضور نظام مجلس اعزا میں منہمک تھے۔ وہ والی ریاست اور عہدہ راج پرمکھی سے سبکدوش ہو گئے تھے اور ایک آزاد ہندوستانی شہری کی طرح اپنے مسلک اور مذہب پر چلنے کا انھیں فطری۔ دستوری اور قانونی حق حاصل ہو گیا تھا۔ اس طرح حیدرآباد میں ایک خاموش انقلاب آیا جو نہ صرف ایک بڑے خاندان کی حکمرانی کے اختتام کا اعلان تھا بلکہ ایک دور ایک عہد اور ایک طرز زندگی کے خاتمہ کا اعلان بھی تھا۔

آخر ۲۴۔ فروری سنہ ۶۷ ۱۹ء کو دوپہر میں ۸۲ سال کی عمر میں میر عثمان علی خاں نے اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا۔ حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے سرکاری سوگ منایا گیا اور عام تعطیل کا اعلان کیا گیا۔ جنازے میں حکومت ہند کی نمایندگی سدرن کمانڈر انڈین آرمی نے کی جنازے کے تمام راستوں پر کثیر عوام بلا لحاظ مذہب قطار باندھے گھنٹوں کھڑے رہے۔

جلوس جنازے میں عوام کے جذبات اور احساسات سے ہرگز یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ یہ ایک سبکدوش شدہ حکمراں کا جنازہ ہے۔

نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع

نواب میر عثمان علی خاں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱ ۱۹ء میں مسند نشین ہوئے اس وقت ان کی عمر پچیس سال تھی۔ نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کے مدار المہامی سے سبکدوشی کے بعد نواب میر عثمان علی خاں نے بغیر کسی مدار المہام کے پانچ سال تک حکومت کا انتظام سنبھالا۔ اس زمانہ میں وہ حکومت کے تمام محکموں کی خود نگرانی کیا کرتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ ریاست کے بہترین مفادات کی خاطر وزیر اعلا اور وزراء کا تقرر مناسب ہے تو نئے طریق حکمرانی کے

بموجب سنہ ۱۹۱۹ء میں باب حکومت تشکیل دی گئی جس میں ایک وزیر اعلا (صدر اعظم) اور دیگر سات وزرأ شامل کیے گئے۔

نواب میر عثمان علی خاں نے ریاست کے نظم ونسق کی اصلاح کے لیے بہترین ایڈ منسٹریٹرس کی خدمات حاصل کیں۔ اس انتخاب کے موقع پر انھوں نے کبھی ذات پات رنگ اور نسل کا خیال نہیں کیا۔ رائے مرلی دھر راجہ فتح نواز ونت کو درجہ بہ درجہ ترقی دیتے ہوئے وزیر مال مقرر کیا گیا اور بعد میں وہ صدر المہام صرف خاص مقرر ہوئے نواب فریدون الملک (فریدون جی) نے حیثیتوں سے کم و بیش پچاس سال تک مختلف عہدوں پر کار فرما رہے وہ معتمد سیاسیات رہے۔ صدر المہام سیاسیات ہوئے۔ صدر اعظم بنائے گئے اور اپنی موت تک صدر المہام بلا قلم داں مقرر کیے گئے۔

سر علی امام۔ سر اکبر حیدری۔ سر مرزا اسمٰعیل جیسے ماہرین نظم ونسق کی خدمات حاصل کی گئیں۔ سنہ ۱۹۲۳ء کے بعد ریاست کے اعلا عہدوں پر مقامی یا ہندوستانی عہدہ دار ہی مقرر کیے گئے غیر ہندوستانی یا انگریز عہدہ داروں کا شدید ضرورت یا مصلحت کی بنا پر تقرر کیا جاتا تھا۔

"سدیشی" سے متعلق ایک فرمان

سدیشی کے متعلق ایک فرمان اس طرح جاری کیا گیا:۔

" میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمام ممالک میں یہ رجحان ترقی کر رہا ہے کہ مقامی تیار شدہ مال خریدا جائے خواہ وہ بناوٹ میں بیرونی تیار شدہ اشیأ سے کمتر ہی کیوں نہ ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ میری ریاست میں بھی اسی خیال کو کیوں نہ اپنایا جائے جو بڑی حد تک درست اور واجبی ہے میں خود مقامی اشیأ خریدتا ہوں۔ مثلاً گولکنڈہ سوپ جو حیدرآباد میں تیار کیا جاتا ہے میرے تمام ایوانات میں استعمال کیا جاتا ہے یہ نہ صرف بہتر بلکہ کم قیمت بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری رعایا کے لیے میری یہ مثال کافی ہوگی اور جب کہ وہ مجھے اس قدر عزیز رکھتے ہیں تو یقیناً میرے طریق عمل کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے۔"

دو حکمرانوں کے متعلق سروجنی نائڈو کا تجزیہ

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع شریمتی سروجنی نائیڈو کا بڑا احترام کرتے تھے شریمتی سروجنی نائیڈو نواب میر محبوب علی خاں کا دور بھی دیکھ چکی تھی۔ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت نے سروجنی نائیڈو سے دریافت کیا۔ "سروجنی تم نے مجھ میں اور میرے والد میں کیا فرق دیکھا ہے" مسز سروجنی نائیڈو نے برجستہ جواب دیا۔

"مرحوم اعلیٰ حضرت کو اللہ نے دل دیا تھا اور آپ کو دماغ دیا ہے"

میر عثمان علی خاں اس جواب سے بے حد خوش ہوئے اور فرمایا۔

"کیا خوب تجزیہ کیا ہے"

روزمرہ کی عام مصروفیات

میر عثمان علی خاں عموماً صبح چھ یا سات بجے خواب گاہ کے کمرے سے برآمد ہوا کرتے تھے[1] برامدہ (یعنی شہ نشین) پر ایک معمولی غیر پالش شدہ کرسی پر بیٹھ جاتے۔ منہ دھوکر چائے نوش فرماتے اور میز خانہ کے تیار کردہ ایک دو بسکٹ بھی چکھ لیتے تھے۔ چائے کے باقی گھونٹ افیون کی گولیوں کے ساتھ لے لیتے تھے[2] گیارہ اور بارہ بجے دوپہر کا خاصہ (لنچ) اور رات میں ساڑھے سات یا آٹھ بجے کے درمیان رات کا خاصہ تناول فرماتے تھے۔ جس میں عموماً ایک قسم کا سالن اور ایک قسم کے کباب (عموماً بیضوی پتوں کی شکل کے) باریک چاول کا موتیا خشکہ، پراٹھے، شیرمال۔ بالائی اور سیب کا مربہ ہوا کرتا تھا[3]

صبح میں مختلف اخبارات کا مطالعہ کیا کرتے تھے یہ مطالعہ اکثر دس بجے دن سے شام میں چار بجے تک جاری رہتا تھا۔

---

[1] مشاہدات از ہوش یار جنگ ص ۲۲۱

[2] 〃 〃 〃 ص ۲۲۳

[3] 〃 〃 〃 ص ۲۲۷

اسٹاف کی حاضری سے قبل پہرہ کے سپاہیوں سے بھی ان کی خیریت اور ان کے خاندان کی ضرورتوں کے متعلق گفتگو فرماتے۔ ان سپاہیوں میں حسین خاں پر بطورِ خاص مہربان تھے اور مذہب و سیاست کے مسائل اس کو سمجھایا کرتے تھے۔[1] لباس میں کرتہ پائجامہ اور نیم آستین کا کوٹ پسند کیا کرتے تھے۔ خاص مواقع پر شیروانی زیب تن فرماتے تھے[2] سرکاری تقاریب میں طرہ دستار پہنا کرتے تھے۔

مذہبی رجحان

مولوی انوار اللہ خاں جو بعد میں نواب فضیلت جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ مذہبی تعلیم دی۔ مذہبی تعلیم حنفی المذہب طریقہ پر پائی لیکن نواب تہور جنگ کی اتالیقی کے اثرات کی بنا پر شیعہ مذہب کے پابند ہو گئے[3] محرم میں عزاخانہ زہرہ میں اگربتی خود جلاتے تھے ۱۱۔ ۱۲۔ محرم کو فولادی علم کا وزن بڑی عقیدت سے سنبھالتے تھے۔ آصف جاہی حکمرانوں کے قدیم رواج اور دستور کے برخلاف وہ میت پر فاتحہ پڑھتے اور جلوس جنازہ میں شریک ہوا کرتے تھے۔ آصفی خاندان میں یہ رواج چلا آتا تھا کہ کسی شخص کے انتقال کی خبر والی ریاست کو راست طور پر نہیں دی جاتی تھی۔ پہلے اس شخص کے شدید علالت کا ذکر کیا جاتا پھر کچھ عرصہ کے بعد اطلاع دی جاتی کہ "مسافر چلا گیا" نواب میر عثمان علی خاں نے اس رواج کی پابندی نہیں کی۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی میت پر آپ تشریف لائے اور حسرت سے فرمایا:

"پرانی بساط کا آخری مہرہ چل بسا" اسی طرح نواب بہادر یار جنگ کے انتقال پر آپ نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر تشریف لائے اور بیگم صاحبہ بہادر یار جنگ کو پرسہ دیا۔

ع[1] مشاہدات از ہوش یار جنگ ص۲۲۳

ع[2] " " " ص۲۲۴

ع[3] مشاہدات " ص۲۲۴

سواری شاہانہ

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں شام میں تقریباً ساڑھے پانچ بجے یا چھ بجے کنگ کوٹھی سے برآمد ہوتے اور عابد روڈ سے گزرتے ہوئے رزیڈنسی سے رلے سے ہوتے ہوئے گولی گوڑہ کے راستے پرانے شہر کلے محل خلوت اور پرانی حویلی کو تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ جب رزیڈنسی کے چوراہے پر شاہی سواری پہنچی تو علاقہ رزیڈنسی کے پولیس کانسٹبل نے عمداً یا اشارتاً اعلیٰ حضرت کی موٹر کو روک کر دوسری سواریوں کے گزرنے کا اشارہ دے دیا۔ اس واقعہ کے فوری بعد اعلیٰ حضرت نے پرانے شہر کو جانے کے لیے اپنا راستہ بدل دیا۔ اب رزیڈنسی کی بجائے شاہی سواری ترب بازار کی تنگ شاہراہ سے گزرنے لگی۔ یہ کچی سڑک دھول سے اٹی رہتی تھی مگر نواب میر عثمان علی خاں کے لیے یہ راستہ بہ درجہ بہتر تھا کیوں کہ یہ ان کا علاقہ تھا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد عابد سے افضل گنج تک ایک کشادہ اور سیدھی سڑک تعمیر کی گئی اور بعد میں وائسرائے بھی اپنے دورہ حیدرآباد کے موقع پر اس شاہراہ سے گزرنے لگے۔ اس طرح رزیڈنسی تا افضل گنج کی سڑک ایک ضمنی شاہراہ بن گئی۔

سواری شاہانہ کے برآمد ہونے کے وقت کنگ کوٹھی کے پردہ گیٹ کا پردہ اٹھا دیا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی چار سیٹیاں دی جاتی تھیں۔ پہلی سیٹی کا مطلب یہ تھا کہ سرکار تیار ہو گئے ہیں اور موٹر منگوائی گئی ہے کنگ کوٹھی کے صدر دروازہ کا پردہ اٹھا دیا گیا ہے اور سرکار کچھ دم میں روانہ ہو رہے ہیں دوسری مرتبہ چار سیٹیاں بجیں تو اس کا مفہوم یہ تھا کہ سواری شاہانہ کنگ کوٹھی سے روانہ ہو گئی ہے۔ آخری چار سیٹیاں آوازیں قدرے مختلف ہوا کرتی تھیں اور کچھ زیادہ زوردار ہوا کرتی تھیں جس کا مطلب تھا کہ سواری کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ جہاں سے سواری گزرتی وہ شاہراہ گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ پیشتر بند کر دی جاتی۔ سڑک پر آئی ہوئی موٹروں اور سواریوں کو قریب کے گلی کوچوں میں موڑ دیا جاتا۔ پیدل راہ رو اپنے اپنے مقام پر ٹھہرا دیے جاتے تھے۔ سواری شاہانہ کے روانہ ہونے

کے بعد کچھ عرصہ تک ٹرافک پر کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کنگ کوٹھی کی موٹروں پر ابتداً کوئی نمبر پلیٹ نہیں ہوتا تھا۔

محکمہ پولیس کے وظیفہ یاب عہدہ دار جن میں رائے بہادر دوار کا ناتھ۔ مسٹر ایس این ریڈی اور جناب فضل رسول خاں نائنٹ قابل ذکر ہیں معقول تنخواہ پر کنگ کوٹھی میں مقرر کیے گئے تھے۔ کنگ کوٹھی میں عرب پہرہ داروں کے ساتھ ساتھ سکھ پہرہ دار بھی مقرر تھے۔ کنگ کوٹھی کے ہر مکیں کی کیفیت حضور کے گوش گزار ہوتی تھی اور وہ اپنے وابستگان سے پوری طرح باخبر رہا کرتے تھے۔ اگر کوئی رکن خاندان بیمار ہو جاتا تو وہ خود علاج معالجہ کی فکر کرتے تھے۔ مریض کی دوا اور غذا کے لیے ہدایت جاری فرماتے۔ خدمت گاروں کی موجودگی کو نظر انداز کر کے رسید اور ایسے ہی متفرق تحریرات خود لکھتے اور لفافوں کو گوند سے خود بند کرتے تھے ہاتھ دھونے کے لیے بار بار کرسی سے اٹھتے اور پھر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔

"خاصہ" وابستگان دولت اور بعض امرأ کے پاس بہ مراحم خسروانہ روانہ کیا جاتا تھا۔ امرأ "خاصہ سے سرفرازی" کے لیے نذر پیش کرتے آب خاص (چشمہ رکن الدولہ کا پانی)، بھی بعض وقت امرأ کو روانہ کیا جاتا تھا اور جواب میں نذر قبول کی جاتی تھی۔ شاہی بیزخانہ کے پکوان میں مرچ برائے نام اور ترشی بہت مشکل سے محسوس کی جاتی تھی۔

شاہی حرم

نواب ہوش یار جنگ کے بیان کے بموجب (مشاہدات صہ ۲۲۰) اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کے حرم کی تعداد صرف پون سو تھی۔ لیکن ان کے والد نواب میر محبوب علی خاں کا حرم ۲۰۵ خواتین پر مشتمل تھا۔ حرم کی یہ تعداد اس زمانہ کے اس نظریہ کی بنا پر لازم تھی کہ "تاج و تخت کا لوازمہ عیش ہے جس کی زینت پری جمالوں کے بغیر ہوتی ہی نہیں"

کنگ کوٹھی

حضرت جوش ملیح آبادی اور دیوان جرمنی داس نے اپنی اپنی تصانیف میں کنگ کوٹھی کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن "زیب داستان کے لیے کچھ مبالغہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔

نواب میر عثمان علی خاں کا عہد بچپن پرانی حویلی میں گزرا جب بڑے ہو گئے تو بہ حیثیت ولی عہد ریاست ایڈن گارڈن میں رہنے لگے۔ ایڈن گارڈن کے روبرو حیدرآباد کے ایک بڑے جاگیردار نواب کمال خاں کی عالی شان کوٹھی اور وسیع میدان تھا۔ اس خوبصورت اور نوساختہ عمارت کے مالک نواب کمال خاں نے ایک تقریب کے موقعہ پر نظام دقت نواب میر عثمان علی خاں کو مدعو کیا۔ والی ریاست کو پرسکون علاقہ میں تعمیر کردہ یہ عمارت بے حد پسند آئی۔ نواب کمال خاں نے بہ پاس وفاداری اور عقیدت یہ محل اور اس کی وسیع آراضی نواب میر عثمان علی خاں کے نذر کر دیا۔ نواب میر عثمان علی خاں کا دور حکمرانی اس عمارت میں گزرا۔ اس عمارت سے قریب نواب میر عثمان علی خاں نے اپنی سکونت کے لیے ایک جدید عمارت تعمیر کرائی جسے نذری باغ کہا جاتا ہے۔ کنگ کوٹھی کی عمارت معزز مہمانوں سے ملاقات کے لیے مختص کر دی گئی۔ نذری باغ اور کنگ کوٹھی کے درمیان ایک عمارت تعمیر کرائی گئی جس کو عثمان مینشن کا نام دیا گیا۔ لیکن یہ عمارت کسی وجہ سے استعمال میں نہیں رہی۔ کنگ کوٹھی کے حصول کے بعد اس کے بام ودر پر کندہ "کے" "کے" انگریزی حروف کو بدلنے کی تجویز پیش ہوئی۔ نواب فریدون الملک نے سابق مکین کمال خاں کے ان سرحروف کو کنگ کوٹھی میں تبدیل کر دیا اور یہ عمارت "کنگ کوٹھی" کے نام سے موسوم ہو گئی۔ کنگ کوٹھی بطور دیوان خانہ استعمال ہونے لگی۔ اسی عمارت میں رزیڈنٹ وائسرائے امرائے عظام شاہی مہمان اور اعلا عہدہ داروں کو شرف باریابی عطا کیا جاتا تھا۔ اسی محل میں آصف سابع اپنے اقتدار کے استحکام کی بات چیت کیا کرتے تھے۔ اور بعد میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ سنہ ۱۹۴۸ء میں اور اس کے بعد

انھوں نے مطلق العنانی کے دور کے خاتمہ کے معاہدوں پر اپنے دستخط ثبت کیے اس کنگ کوٹھی میں آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے آصف سابع سے ملاقات کی تھی۔ ان سے بہت پہلے غیر منقسم ہندوستان کی مسلم لیگ کے لیڈر مسٹر محمد علی جناح نے بھی اس کنگ کوٹھی میں حضور نظام سے ملاقات کی لیکن سگار کے دھوئیں کے باعث یہ ملاقات بہ مشکل دس منٹ جاری رہ سکی۔ حیدر آباد کی پہلی ذمہ دارانہ حکومت مسٹر ایم۔ کے۔ ڈبلوڈی کی سرکردگی میں کنگ کوٹھی ہی میں حلف رازداری اور حلف وفاداری اٹھایا تھا۔

"نذر باغ" کا پردہ گیٹ

حضور نظام کے رہائشی محل نذری باغ کا باب الداخلہ پردہ گیٹ کے نام سے موسوم ہے اس گیٹ پر ہمیشہ پردہ پڑا رہتا تھا اور رواجاً آج تک یہ پردہ پڑا ہوا ہے۔ جب حضور نظام محل سے باہر نکلتے تھے تو پردہ اٹھا دیا جاتا تھا جو ان کے محل میں نہ رہنے کی علامت تھی پردہ گیٹ پر فوج باقاعدہ۔ میسرم رجمینٹ پولیس۔ صرف خاص چوب داروں۔ سکھوں۔ اور شاگرد پیشہ کا کڑا پہرہ اور ہجوم رہا کرتا تھا۔ پردہ گیٹ کے عین روبرو کنگ کوٹھی کی امین کچہری کی ایک مختصر عمارت تھی اور اس عمارت میں نایب کوتوال کا اجلاس بھی ہوا کرتا تھا عثمان مینشن اور نذری باغ کے درمیان نذری باغ کا اندرونی مشرقی پھاٹک ہے جو بگل کنٹہ کی سڑک پر واقع ہے۔ گھڑیال پھاٹک کو لگی ہوئی گھڑیال گیٹ، کہا جاتا تھا۔ اس پھاٹک کے روبرو معتمد پیشی مبارک اور مشیر مالیہ کے دفتر تھے۔ نذری باغ کے حدود میں نواب اظہر جنگ مہتمم کوٹھیات کا دفتر تھا جس کو اظہر جنگ کی نشست کہا جاتا تھا۔

کنگ کوٹھی اکیس ایکڑ کے رقبہ پر مشتمل ہے۔ اس وسیع و عریض محل میں نگہداشت آہک پاشی، تعمیر و ترمیم دفتر چیف انجنیر تعمیرات ایوانات شاہی کے سپرد تھی۔ اس دفتر کے ایک سوپروائزر مسٹر کیوسامی نائیڈو ان کاموں کے انچارج تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق حضور نظام کے تقریباً تین سو ارکان خاندان و ملازین

وغیرہ کنگ کوٹھی میں رہتے تھے۔ کنگ کوٹھی کی عمارت کے پیچھے شاہی مطبخ تھا جہاں شاہی کھانے تیار کیے جاتے تھے شاہی مطبخ کی عمارت اب بھی موجود ہے جہاں کچھ زمانہ پیشتر سب کلکٹر وغیرہ کے دفاتر قایم کیے گئے تھے۔ قصر کنگ کوٹھی اور نذری باغ سے کچھ فاصلہ پر نواب میر عثمان علی خاں نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور اسے اپنے ایک کمسن مرحوم شہزادہ جواد جاہ کے نام سے موسوم کیا اور یہ مسجد جودی کہلانے لگی۔ اس شہزادہ کو اس مسجد کے احاطہ میں دفن کیا گیا تھا۔ دیگر لواحقین کی تدفین کے لیے ایک مقبرہ تعمیر کیا۔ جہاں حضور نظام میر عثمان علی خاں کی والدہ زہرہ بیگم دفن ہیں۔ نواب میر عثمان علی خاں کو ان کی خواہش کے مطابق مسجد جودی کے احاطہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ ورنہ سلسلہ آصفی کے دیگر حکمراں مکہ مسجد کے صحن میں دفن کیے گئے تھے۔ نواب اعظم جاہ پرنس آف برار کو مسجد جودی کے بجائے مکہ مسجد میں نواب میر محبوب علی خان کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

مسجد جودی کے پیچھے موٹر خانہ کی عمارت تھی۔ حضور نظام کے پاس کئی موٹریں تھیں اس کے باوجود محرم کے زمانہ میں محلات و دیگر ارکان خاندان کو پرانے شہر لے جانے کے لیے شہر کی تقریباً تمام ٹیکسیاں کرایہ پر لی جاتی تھیں۔

کنگ کوٹھی کا ماحول

حیدرآباد کی کئی چھوٹی بڑی ڈیوڑھیوں کی طرح کنگ کوٹھی کا بھی اپنا ایک ماحول تھا باریابی کے لیے بگلوس اور دستار کا لگائے رکھنا ضروری تھا۔ شیروانی کے تمام بٹن اور گلے کا کالر لگا رہنا ضروری تھا۔ ورنہ شاگرد پیشہ باریابی کے لیے پیش نہ کرتا تھا۔ پولیس ایکشن کے کچھ دن بعد مصاحبین اور وابستگان کو اجازت دی گئی کہ وہ بگلوس لگانے اور دستار پہننے کے لیے مجبور نہیں ہیں لیکن حیدرآباد کے اکثر امرا جس میں نواب تراب یار جنگ اور نواب زین یار جنگ قابل ذکر ہیں دستار کو اپنے لباس کا جز بنا چکے تھے اور وہ بہت کم سادہ ٹوپی استعمال کرتے تھے۔

نذری باغ کے ورانڈے میں سیڑھیوں کے عین اوپر صرف ایک معمولی

چوبی کرسی رہا کرتی تھی حضور نظام میر عثمان علی خاں عموماً برآمدے میں ٹہلا کرتے اور اگر کسی سے ملاقات کرنی ہو تو صرف سیڑھیوں پر ٹھہر جاتے۔ خادمت عالی میں جو شخص باریاب ہوتا وہ آخری سیڑھی کے پاس کھڑا رہتا اور پہروں اسی طرح گفتگو ہوا کرتی تھی۔ گفتگو کے دوران حضور نظام ایک کے بعد ایک سوال فرماتے اور موجود شخص ہر سوال کا مختصر جواب عرض کرتا تھا۔ ٹیلیفون کو کنگ کوٹھی کی زبان میں "تار" کہا جاتا تھا۔

شاہ دکن سے اپنی پہلی ملاقات کا حال جوش ملیح آبادی اپنی سرگزشت "یادوں کی بارات" میں اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"[1] پردہ گیٹ سے محل سرا کے اندر پہنچا تو یہ حسرت ناک تماشہ دیکھا کہ وہاں نہ سبزے کا فرش ہے نہ کیاریاں، پھولوں کے پودے ہیں نہ سرو چنار سوکھا سوکھا صحن ہے اور اس بجھے بجھے صحن میں ہزاروں چیزیں بے قاعدگی کے ساتھ اِدھر اُدھر پڑی ہوئی ہیں۔ سامنے ایک نہایت چھوٹا سا تین سیڑھیوں کا برآمدہ ہے برآمدے میں ایک بے پالش کی ایک چھوٹی سی کرسی پر ایک ادھیڑ اور خشک چہرے کا دبلا پتلا آدمی معمولی اور سادہ کپڑے پہنے اکڑا ہوا بیٹھا ہے ..... ان کے سامنے تیس چالیس عمایدِ شہر اور عیان ریاست دستانگلوس لگائے دست بستہ و سرنگوں کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے پیچھے بہت سے چیز کے ناکارہ بکس پڑے ہوئے ہیں"

نواب ہوش یار جنگ اس شہ نشین کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں (مشاہدات صـ۲۲۲)

"شہ نشین کے چاروں طرف پوٹلے پوٹلیاں، صندوق اور مختلف قسم کا سامان رکھا رہتا ہے سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اِدھر اُدھر پڑے رہتے ہیں جو کوٹھری بند ہوگئی وہ برسوں نہ کھلی،

---

[1] یادوں کی بارات از جوش ملیح آبادی صـ۱۷۱

کمیاب قلمی کتابیں کیڑوں کی غذا بن گئیں اور محبوب شاہی توشک خانہ میں قیمتی تھان کے تھان دیمک چاٹ گئی۔"[1]

نواب آصف سابع کی سادگی اور کفایت شعاری

نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کی سادگی اور کفایت شعاری کا ایک قصہ نواب صمد یار جنگ معتمد پیشی کے حوالہ سے ادارہ محبان دکن کراچی کی جانب سے شائع شدہ کتاب "مملکت آصفیہ" میں یوں درج ہے:-

"نواب صمد یار جنگ کو ایک موسم سرما میں بلا کر حکم دیا کہ میرا کمبل بوسیدہ ہو گیا ہے بازار سے ایک کمبل خرید کر لاؤ جس کی قیمت پندرہ روپے سے زائد نہ ہو معتمد پیشی نے بازار میں کمبل کی قیمت دریافت کی اور پھر عرض کیا کہ بازار میں کوئی کمبل اٹھارہ روپے سے کم قیمت کا نہیں ہے اگر حکم ہو تو کمبل گزرانتا ہوں۔ حضور نظام نے یہ سن کر اپنی گرجدار آواز میں ارشاد فرمایا یہ موسم سرما تو اسی کمبل میں گزر جائے گا آئندہ سال دیکھا جائے گا۔"

"بادی النظر میں یہ بیان صرف ایک قصہ معلوم ہوتا ہے۔

اعلیٰ حضرت کی سادگی کے متعلق نواب ہوش یار جنگ اپنی تصنیف مشاہدات (ص۲۲۳) میں لکھتے ہیں کہ:- "سردی میں "سردیا" رہے ہیں مگر نہ کوئی کشمیری دوشالہ اوڑھتے ہیں اور نہ کوئی گرم کوٹ پہنتے ہیں۔ دنیا کو سبق دیتے ہیں کہ نفس کو اس طرح مارا جاتا ہے۔ نفس کشی کی ایسی تصویر نہ زاہدوں میں نظر آئی نہ مرتاضوں میں تلاش سے مل سکی اور نہ اس زمانہ کے دوسرے انسانوں میں دیکھی گئی۔"

حضور نظام میر عثمان علی خاں کی نجی زندگی کا حال مولانا خواجہ حسن نظامی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

---

[1] مشاہدات ص۲۲۲

" بادشاہ جہاں تشریف رکھتے ہیں یعنی ایوان شاہی میں مختصر دو چار گز کا حجرہ جس میں سادہ فرش کیا ہوا اور معمولی کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ سب کو کیا چھوٹا کیا بڑا کیا اپنا کیا پرایا اسی مقام پر شرف باریابی بخشا جاتا ہے۔ ظل اللہ نہایت سادہ لباس زیب تن فرماتے ہیں۔ لیکن عظمت خداداد اور جاہ وجلال کا یہ عالم کہ بڑے بڑے قوی دل رعب شاہی سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔"

ایک مرتبہ وعظ کی ایک مجلس میں آپ نے ایک درباری کو بگلوس باندھے ہوئے دیکھا اور اپنی گرجدار آواز میں ارشاد فرمایا:۔

" یہ میرا دربار ہے یا رسول اللہ کا "

اس اشارہ کے ساتھ ہی درباری نے بگلوس کمر سے نکال دیا۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں اعلیٰ حضرت۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے زیارت کے بعد بغرض ادائی نماز جمعہ مسجد میں تشریف لائے اس موقعہ پر ایک شاعر نے قصیدہ سنانا چاہا لیکن اعلیٰ حضرت نے شاعر کو یہ کہہ کر روک دیا کہ مسجد میں بندے کی عظمت کبھی بیان نہ ہونا چاہیے۔ خانہ خدا میں شاہ اور گدا سب برابر ہیں۔ یہاں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ اسی سال سنہ ۱۹۲۵ء میں جب اعلیٰ حضرت آستان حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز پر تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ خانقاہ کی سیڑھیوں کے پاس گارڈ آف آنر کی سلامی کا انتظام کیا گیا ہے۔ آپ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ " ہم خود یہاں سلام کو آئے ہیں۔ سلامی کی ضرورت نہیں"

حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں ایسے طرحدار اور بے نیاز اصحاب بھی تھے جو بادشاہ کو ظل اللہ یعنی سایہ خدا جانتے تھے۔ لیکن مذہبی اجتماعات میں وہ محمود و ایاز میں کسی قسم کی تفریق اور امتیاز کو پسند نہ کرتے تھے۔ اسی روش کے ایک طرحدار مولوی احمد حسین کلرک کا واقعہ جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی بارات" میں یوں لکھا ہے (ص ۴۲۶)

ـؔا ” خواجہ کے چھلہ میں ہر سال بڑے اہتمام کے ساتھ قوالی ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی نظام میر عثمان علی خاں بھی تشریف لاتے تھے چنانچہ ایک بار وہاں پہلی صف میں نظام اور دوسری صف میں عین نظام کے پیچھے مولوی احمد حسین بیٹھے ہوتے تھے۔ حسب دستور قوالی سے پیشتر قرات ہونے لگی اور خوش گلو قاری نے سورۂ رحمٰن اس طرح پڑھنا شروع کیا کہ پوری محفل جھوم اٹھی۔ اسی عرصہ میں نظام مہاراجہ کشن پرشاد سے کچھ سرگوشی کرنے لگے۔ رعب شاہی سے قاری کی آوازمیں تھراہٹ پیدا ہو گئی اور لوگوں کی توجہ نظام کی سرگوشی کی جانب مرکوز ہو گئی۔ احمد حسین نے جھک کر نظام سے کہا ” اثنا قرات میں باتیں کرنا سوء ادب ہے۔ آپ خاموش ہو جائیں“ نظام نے مڑ کر ان کو دیکھا۔ کوتوال شہر راجہ وینکٹ راما ریڈی جو اپنی جمعیت کے ساتھ نظام کے رو برو کھڑے تھے احمد حسین کی جانب بڑھے نظام نے انھیں اپنی گرجدار آواز میں روکا اور خود پوری طرح متوجہ ہو گئے قاری کی روندھی آواز کھل گئی قرأت پھر پینگ لینے لگی اور لوگ عقیدت سے جھومنے لگے لیکن کچھ ہی دیر بعد نظام نے مہاراجہ سے پھر سرگوشی شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر احمد حسین پھر بپھر گئے اور بلند آواز میں پکار اٹھے ” اثنأ قرأت میں باتیں کرنا بدتمیزی ہے خاموش ہو جائیے اور مزید بدتمیزی نہ کیجیے“ احمد حسین کی یہ گرجدار آواز سن کر حاضرین تھرا گئے قاری کی آواز پھر گلے میں گھٹنے لگی۔ کوتوال شہر پھر احمد حسین کی طرف جھپٹے۔ لیکن نظام نے انھیں پھر روکا اور مہاراجہ کو ساتھ لے کر درگاہ سے چلے گئے لوگوں نے احمد حسین کو ان کی جرأت پر مبارک باد دی۔ انھوں نے انکساری کے ساتھ کہا کہ بڑوں کی موت نے مجھے بڑا بنا دیا۔ پہلے کے

ـؔا یادوں کی بارات صـ۴۳۶

لوگ باقی نہیں رہے اسی لیے میں بڑا معلوم ہو رہا ہوں۔"
کنگ کوٹھی واپس آکر حضور نظام نے مہاراجہ کے توسط سے احمد حسین کو ایک ہزار روپے بطور انعام روانہ کیے لیکن احمد حسین نے یہ کہہ کر انعام واپس کردیا کہ کلمہ حق فروختنی نہیں ہوا کرتا۔ مہاراجہ اس دلیر انسان سے کچھ کہہ نہ سکے اور فرط مسرت سے ان کا ہاتھ چوم لیا۔ نظام نے فرمان جاری کیا کہ احمد حسین کی تنخواہ تیس روپے ماہانہ سے تین سو روپے تاحیات مقرر کی جائے اور وہ دفتر کی حاضری سے معاف رہیں گے۔ لیکن احمد حسین نے تین سو روپے اور دفتر کی غیر حاضری قبول نہ کی اور عرض کیا کہ تیس روپے ان کے لیے بہت کافی ہیں وہ محنت کا معاوضہ چاہتے ہیں اس لیے ان کی نوکری بحال رکھی جائے۔

نواب میر عثمان علی خاں کے لیے قومی قایدین کا احترام

سقوط حیدرآباد کے بعد پنڈت جواہر لعل نہرو بحیثیت وزیر اعظم جب پہلی مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ حضور نظام طیران گاہ حکیم پیٹھ پر تشریف نہ لائیں اور رسمی استقبال کے لیے صرف ولی عہد بہادر کی موجودگی کافی ہے۔ پنڈت جی کے ارشاد کے بموجب ایسا ہی ہوا لیکن بلارم اور کنگ کوٹھی میں پنڈت نہرو سے ملاقات کے بعد اعلی حضرت پنڈت نہرو سے کافی متاثر ہوئے اور ان کی روانگی کے وقت وداعی ملاقات کے لیے بہ نفس نفیس طیران گاہ تشریف لائے اور اپنے مصاحبین کے ساتھ ایک جانب کھڑے رہے۔ پنڈت نہرو کے اطراف قائدین اور سربراہ حکومت کھڑے ہوئے تھے۔ پنڈت نہرو نے شری کرشنا مینن سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ حضور نظام اب بادشاہ نہیں ہیں لیکن ان کی چال ڈھال اور گفتگو کے انداز سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اب وہ والی ریاست نہیں ہیں۔
اسی طرح ہندوستان کے تیسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین جب بحیثیت صدر جمہوریہ حیدرآباد تشریف لائے تو انھوں نے بھی بطور خاص حضور نظام سے خواہش کی کہ وہ ان کے استقبال کے لیے طیران گاہ تشریف

نہ لائیں بلکہ وہ خود قصر کنگ کوٹھی پر ملاقات کریں گے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی ملاقات کے وقت اعلیٰ حضرت سے کہا کہ میری حیثیت صدر جمہوریہ ہند کے علاوہ دوسری نوعیت بھی رکھتی ہے۔ میرے والد دربار آصفی سے منسلک رہے ہیں اس لیے میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں اعلیٰ حضرت کو استقبال کی زحمت دوں جب کہ بہ اعتبار پیدائش میں اس ریاست کی رعایا کی حیثیت رکھتا ہوں۔

ہندوستان کے پہلے ہندوستانی گورنر جنرل چکرورتی راج گوپال چاری، حیدرآباد کے پہلے سرکاری دورہ کے موقع پر جب پہلی بار یکم اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء کو حضور نظام سے پہلی بار ملے تو وہ ان کی سادگی اور شاہی آداب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور قصر فلک نما میں اپنی سرکاری ملاقات کے بعد وہ قدیم رواج اور آداب کے خلاف اعلیٰ حضرت کو ان کی موٹر تک چھوڑنے کے لیے تشریف لاتے۔ چکرورتی راج گوپال چاری کے انتقال تک حضور نظام سے ان کے تعلقات انتہائی دوستانہ رہے۔

نواب میر عثمان علی خاں کا تمول

نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے تمول کا دنیا میں کافی شہرہ تھا۔ اس خصوص میں لندن ڈیلی ٹیلیگراف اور ڈیلی ایکسپرس نے کئی افسانے شائع کیے ہیں لیکن ایک فرانسیسی صحافی کے اندازے کے مطابق نواب میر عثمان علی خاں کی دولت تقریباً ایک سو ملین پونڈ یعنی دس کروڑ پونڈ تھی۔ جو تخمیناً ایک ارب کروڑ سکہ عثمانیہ کے مساوی ہوتے ہیں۔ اس صحافی نے حضور نظام میر عثمان علی خاں سے دریافت کیا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ یور ہائنس کی دولت ایک سو ملین پونڈ ہے"؟ حضور نظام نے جواب دیا اگر سچ پوچھو تو خود مجھے بھی اپنی دولت کا اندازہ نہیں ممکن ہے سو ملین پونڈ ہو ممکن ہے اس سے بھی زیادہ ہو ممکن ہے کم ہو یقین سے کچھ نہیں بتا سکتا۔ کیوں کہ مجھے صحیح اندازہ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا کوئی عہدہ دار بھی میری دولت کا صحیح اندازہ نہیں رکھتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نواب میر عثمان علی خاں کئی لاقیمت جواہرات کے مالک تھے جو صنعت کاری اور کاریگری کے لاثانی نمونے تھے۔ وہ جواہرات کے شائق ہی نہیں بلکہ عاشق بھی تھے اور اپنے من پسند جواہرات کے حصول کے لیے وہ ہمیشہ بےچین رہا کرتے تھے۔ وہ ایسا کوئی موقع نہ کھوتے تھے خواہ ان جواہرات کے حصول کے لیے کثیر رقم ہی کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ اس طرح وہ جواہرات کی پرکھ اور تمیز میں ایک خاص نگاہ رکھتے تھے کہا جاتا ہے کہ ان کے جمع کردہ جواہرات کا ایک بڑا حصہ زار شہنشاہ روس کی تباہی کے بعد ان کے قبضہ میں آیا۔ جواہرات کا ایک بڑا حصہ انھیں حیدرآباد کے امرأ اور حیدرآباد اور بمبئی کے مشہور جیولرس سے حاصل ہوا۔ ان کے منتخب جواہرات میں زمرد۔ موتی اور ہیروں کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔ جیکب ڈائمنڈ دنیا میں تیسرا بڑا ہیرا سمجھا جاتا ہے۔ جو نواب میر عثمان علی خاں کو اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ یہ ہیرا ایک جیکب نامی جیولر سے خریدا گیا تھا اس لیے اس نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ ہیرا ۱۸۰ کیرٹ کا تھا۔ جیکب ہیرے کی خریدی سے متعلق کئی افسانے مشہور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ ہیرا جیکب فروخت کے لیے نواب میر محبوب علی خاں کے پاس لے آیا تو محبوب علی پاشا مصروف تھے اور انھیں اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ وہ اس ہیرے پر ایک نظر ڈال سکیں حالانکہ وہ بھی جواہرات کے حد درجہ شائق تھے۔ جیکب اس ہیرے کو کسی نہ کسی طرح نواب میر محبوب علی خاں کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے ہدایت دی گئی کہ وہ پھر کبھی حاضر ہو جائے۔ جیکب وہ ہیرا ایک کاغذ میں لپیٹ کر نواب میر محبوب علی خاں کے میز پر رکھ کر چلا گیا۔ دوسرے دن جب شاگرد پیشہ میز کی صفائی کے لیے پہنچا تو اس نے مرحوم نظام کے میز پر ایک بڑا چمکتا دمکتا ہیرا پیپر ویٹ کی طرح رکھا ہوا دیکھا۔ غالباً اسی شاگرد پیشہ نے یہ بات پھیلا دی کہ حضور نظام اس بڑے ہیرے کو بطور پیپر ویٹ استعمال کرتے ہیں۔ نواب میر محبوب علی خاں نے محسوس کیا کہ جیکب ڈائمنڈ اس قدر وزنی نہیں ہے جس قدر کے جیولر نے بیان کیا تھا۔ جیکب جیولر کو اصرار تھا کہ اس کا بیان صحیح ہے غرض یہ تنازعہ عدالت سے

رجوع کیا گیا۔ نواب میر محبوب علی خاں نے اپنے خاندانی اعزاز اور رواج کو نظر انداز کرتے ہوئے بہ نفس نفیس عدالت میں حاضر ہوئے اور اپنا بیان قلم بند کرایا۔ امرائے ریاست نے عدالت میں حکمراں کی حاضری سے متعلق اعتراض کیا لیکن نواب میر محبوب علی خاں نے اس اعتراض کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ان کی ریاست میں عدالت کا احترام بادشاہ اور رعایا دونوں پر لازم ہے۔

محبوب علی پاشا جیکب ہیرے کو منحوس تصور کرتے تھے کیوں کہ اس کی وجہ سے انھیں ایک مقدمہ کا فریق بننا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کبھی اس ہیرے کو پھر نہیں دیکھا۔ ایک روایت کے مطابق نواب میر عثمان علی خاں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد اس قیمتی ہیرے کو ایک پرانے جوتے میں پڑا ہوا پایا اور اپنے ذخیرہ جواہرات میں شامل کرلیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آیا اس ہیرے کی نحوست کی بنا پر ہی وہ خاندان آصفی کے آخری تاجدار قرار پائے۔

ایک مرتبہ سر سلطان احمد نے حضور نظام میر عثمان علی خاں سے جیکب ڈائمنڈ دیکھنے کی خواہش کی۔ حضور نظام نے اس بیش قیمت ہیرے کو ایک معمولی سوپ باکس میں رکھا تھا۔ یہ ہیرا جب تک سر سلطان احمد کے ہاتھ میں رہا وہ کافی بےچین دکھائی دے رہے تھے۔

نظامس جیولری ٹرسٹ

سقوط حیدرآباد کے بعد انھوں نے کئی جواہرات بمبئی میں فروخت کیے۔ لیکن انھوں نے ۸۷ قیمتی اور نادر جواہرات مرکنٹائل بینک بمبئی کے سیف لاکر میں رکھوا دیے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ایچ۔ ای۔ ایچ نظامس جویلری ٹرسٹ قایم کیا گیا۔ تاکہ ان کے ارکین خاندان کا آیندہ تحفظ ہو سکے۔ حضور نظام کی خواہش کے بموجب حکومت ہند کے ایک نمایندے کو اس ٹرسٹ کا رکن اور صدر نشین بنایا گیا اس وقت مسٹر این۔ آر۔ ملہوترا ایڈیشنل سکریٹری معاشی امور وزارت مالیات حکومت ہند اس ٹرسٹ میں حکومت کے

نمایندے اور صدر نشین ہیں۔ ٹرسٹ کے دیگر اراکین نواب مفخم جاہ بہادر۔ جناب ظہیر احمد مشیر حکومت آندھرا پردیش برائے دیہی ترقیات۔ جناب عطاء الرحمٰن بیرسٹر اور جناب حامد علی عباسی سابق معتمد فینانس حکومت آندھرا پردیش ہیں۔

نواب میر عثمان علی خاں نے یہ صریحی ہدایت کی تھی کہ اگر ان جواہرات کی فروخت اشد ضروری ہو تو یہ جواہرات نواب اعظم جاہ پرنس آف برار کے انتقال کے تین سال بعد ہی فروخت کیے جائیں کیوں کہ وہ اپنے آخری زمانہ میں شہزادہ موصوف سے خوش نہیں تھے اس لیے اپنے جانشین کی حیثیت سے انھوں نے اپنے پر پوتے نواب مکرم جاہ بہادر کو نامزد کیا تھا جس کی توثیق حکومت ہند سے کرالی گئی تھی۔ اس ہدایت کا صریحی منشأ یہ تھا کہ نواب اعظم جاہ ان جواہرات کے فروخت کی صورت میں کوئی استفادہ نہ کرسکیں۔ انھوں نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ ان جواہرات میں سے دو عدد بیش قیمت جواہرات ان کے ہر دو پوتوں یعنی نواب مکرم جاہ بہادر (نواب میر برکت علی خاں) اور نواب مفخم جاہ کو ان کی شادی کے موقع پر دیے جائیں۔ دو عدد جواہرات آثار مقدسہ کے ٹرسٹ کے حوالے کیے جائیں تاکہ مقدس آثار کی حفاظت اور انتظام کیا جا سکے۔ باقی ۸۳ عدد جواہرات سے متعلق یہ ہدایت کی گئی کہ یہ جواہرات ان کے اراکین خاندان کی حفاظت اور بہ وقت ضرورت ان کی امداد کے لیے مختص رہیں گے ان جواہرات میں سے چار عدد اعظم جاہ کے اراکین خاندان کے لیے چار عدد نواب معظم جاہ کے اراکین خاندان کے لیے ایک حصہ شہزادی پاشا کے لیے اور ایک حصہ نواب بسالت جاہ بہادر کے لیے۔ چار حصے دیگر شہزادگان اور تین حصے شہزادیوں کے لیے مختص کیے گئے۔

نواب میر عثمان علی خاں نے ہدایت کی کہ یہ تمام جواہرات بہ ایک وقت فروخت نہ کیے جائیں بلکہ ۴۰ عدد جواہرات پہلی مرتبہ فروخت کیے جائیں دیگر ۴۳ جواہرات صرف اسی صورت میں فروخت کیے جائیں

جب کہ ان کے اراکین خاندان شدید معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہو جائیں اور ان سے بچاؤ کے لیے ان جواہرات کا فروخت کرنا اشد ضروری ہو جائے۔

نواب اعظم جاہ پرنس آف برار نے ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء میں انتقال کیا۔ ٹرسٹیز نے محسوس کیا کہ دولت ٹیکس کی ادائی اور دیگر مطالبات کی یکسوئی کے لیے ان جواہرات کی فروخت اشد ضروری ہے اس کے علاوہ شاہی خاندان کے کئی افراد معاشی طور پر سخت پریشان تھے۔ مسٹر ظہیر احمد نے تجویز پیش کی کہ ان بیش قیمت جواہرات کے عام نیلام سے یہ نادر و نایاب جواہرات ملک سے باہر منتقل ہو جائیں گے اور جب کہ قوم "کوہ نور" ہیرے کی واپسی کی خواہش مند ہے تو ایسی صورت میں ان جواہرات کی بیرون ملک منتقلی مناسب نہ ہوگی۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ اولاً حکومت ہند سے خواہش کی جائے کہ وہ نادر جواہرات خرید لے تاکہ ان جواہرات کا ایک نیشنل میوزیم قایم کیا جا سکے۔ دیگر ٹرسٹیز نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور ایک میمورنڈم اس وقت کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے پاس روانہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں حکومت ہند سے گفتگو بھی شروع ہوئی لیکن جب مسٹر ظہیر احمد حکومت ہند کے سفیر برائے سعودی عرب مقرر ہو کر بیرون ہند چلے گئے تو اس سلسلہ میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔ سفارت سے واپسی آنے کے بعد مسٹر ظہیر احمد نے اس بارے میں کارروائی شروع کی۔ وزیر اعظم نے ان جواہرات کو حکومت ہند کی جانب سے خریدی کے لیے اتفاق کیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے تخمینہ کنندگان نے ان جواہرات کی جو قیمت مشخص کی وہ ٹرسٹیز کی جانب سے مشخص کردہ قیمت سے کافی کم تھی۔ حکومت ہند نے ان جواہرات کی قیمت ۱۲ کروڑ روپے مقرر کی حالانکہ ٹرسٹیز کے تخمینہ کے لحاظ سے ان کی قیمت ۱۴/۵ کروڑ روپے تھی۔ لیکن یہ معاملہ طے ہونے کے قریب تھا کہ سنہ ۱۹۷۷ء میں مرکز میں کانگریسی حکومت کو شکست ہو گئی اور جنتا پارٹی نے اقتدار سنبھال لیا۔ جنتا پارٹی کے وزیر مالیات مسٹر ایچ۔ ایم۔ پٹیل نے ۹۔ نومبر سنہ ۱۹۷۷ء کو ان جواہرات کا معائنہ بمبئی میں کیا اور نئی حکومت سے ان جواہرات کی خریدی کی سفارش

کی۔ لیکن آخر کار جنتا پارٹی حکومت نے خریدی جواہرات کی تجویز کو یکسر مسترد کر دیا۔ حکومت ہند کے آثار قدیمہ کے عہدہ دار اور مشیروں نے ان جواہرات کا معائنہ کیا اور قرار دیا کہ ۲۳ عدد جواہرات نوادرات میں شامل ہیں اس لیے صرف ساٹھ عدد جواہرات کے اندرون ملک یا بیرون ملک فروخت کی اجازت دے دی۔ اجازت کے حصول کے بعد ٹرسٹیز نے تمام عالمی جیولرس کو ان جواہرات کی فروخت سے مطلع کیا۔ جن نامی شہرت یافتہ جیولرس کو مطلع کیا گیا ان میں روس تھیلاس۔ ہنری ونسٹن۔ الکزینڈر ریزا اور چیف آف پرولوکول سعودی عرب۔ عراق اور دوبئی شامل تھے۔

۲۰ عدد جواہرات فوری فروخت کے لیے رکھے گئے۔ ۶-مارچ سنہ ۱۹۷۸ء سے سہ یومی نیلام کا اعلان کیا گیا۔ دنیا کے مشہور جیولرس اور تقریباً ۳۸ ہندوستانی جیولرس نے ان جواہرات کا معائنہ کیا اور ہر عدد کے لیے اپنا علاحدہ علاحدہ ٹینڈر پیش کیا۔ فیس معائنہ جواہرات پندرہ سو روپے مقرر کی گئی جو ناقابل واپسی تھی۔ ٹرسٹیز نے گیارہ ٹینڈر قبول کیے اور جواہرات کی حوالگی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ لیکن اسی عرصہ میں پرنسیس فوزیہ دختر شہزاد معظم جاہ (جو اپنے والد کی وفات کے بعد اگر حین حیات ہوں تو جواہرات کی وصول شدنی قیمت میں نواب معظم جاہ بہادر کو حاصل ہونے والی رقم میں ۱/۸ حصہ کی مستحق ہوں گی) عدالت دیوانی بلدہ میں ایک دعوا دایر کر دیا اور حکم امتناعی بھی حاصل کر لیا تا کہ ٹرسٹیز حسب اعلان جواہرات جیولرس کے حوالہ نہ کر سکیں۔ شہزادی نے ادعا کیا کہ صرف جیکب ڈایمنڈ کی قیمت ایک سو کروڑ روپے سے کم نہیں ہے۔ حالانکہ اسے صرف ایک کروڑ روپے میں فروخت کیا جا رہا ہے ٹرسٹیز نے جواب دہی کی کہ جیکب ڈایمنڈ ان ۲۰ فروخت شدنی جواہرات میں شامل نہیں ہے۔ بالآخر عدالت دیوانی بلدہ سے حکم امتناعی اٹھا لیا گیا۔ لیکن شہزادی نے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ ہائیکورٹ میں ایک جیولرس پیٹر جیوسن فرنانیڈیس نے درخواست پیش کی کہ وہ دوبئی کے شرکا کے ساتھ یہ جواہرات ۲۰.۲۵ کروڑ روپے میں خریدنے پر آمادہ ہے۔ انھوں نے

اس رقم کے لیے اپنی جانب سے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی ضمانت بھی داخل کردی۔ ہائیکورٹ نے جواہرات کو مسٹر فرنانڈیز کے ہاتھ ۲۰۰۲۵ کروڑ روپے میں فروخت کرنے کا حکم دیا۔ لیکن دیگر جیولرس نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر کے حکم التوا حاصل کرلیا۔ تاحال یہ جواہرات نیلام نہ ہو سکے۔

حضور نظام کی دولت کی یہ فراوانی دوسری جنگ عظیم سے قبل رہی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۲ء حکومت برطانیہ نے کافی رقمیں بہ عنوان عطیہ اعلیٰ حضرت سے حاصل کرلی۔ آزادی کے بعد حکومت ہند کو اکثر و بیشتر کثیر رقمیں بطور عطیہ دی گئیں خصوصاً سنہ ۱۹۶۲ء میں چینی حملہ کے بعد شاہی خزانہ سے طلائی اشرفیاں اور سکے پرائم منسٹرس فنڈ میں جمع کیے گئے۔ یہی حال سنہ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے فوری بعد بھی جاری رہا۔ اعلیٰ حضرت کثیر رقومات شہزادگان نواب اعظم جاہ و نواب معظم جاہ کے بے دریغ قرضوں کی ادائی میں بھی صرف کرتے رہے جب یہ قارونی خزانہ بڑھتے ہوئے اخراجات کو برداشت نہ کرسکا تو کنگ کوٹھی کے بے جا مصارف کم کردیے گئے۔ ایم رکن الدولہ سے اب خاصہ کی فراہمی کے لیے جو گاڑیاں اور سوار مقرر کیے گئے تھے ان میں کافی کمی کردی گئی لیکن کنگ کوٹھی اور دیگر شاہی محلات پر متعین ملازمین کی تخفیف نہیں ہوئی۔ شہزادگان والا شان اور کنگ کوٹھی کے وابستگان کی حفاظت کے لیے کئی ٹرسٹ قایم کیے گئے جو اب ناموافق حالات میں ان کی دستگیری کا سبب بن رہے ہیں۔

نواب میر عثمان علی خاں عثمان کی اردو شاعری

اردو اپنے آصف جاہی روپ میں دکن کی قدیم اردو سے خاصی مختلف ہو چکی تھی چنانچہ آصف جاہی خاندان کے سلسلہ اور حیدرآباد کو دارالسلطنت بنانے کے ساتھ ہی قدیم اور جدید اردو کی کشمکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ قطب شاہی خاندان کے آخری فرماں روا ابوالحسن تانا شاہ کا مندرجہ ذیل شعر دکن کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

تجھ مکھ کوئی چندا کہتے کوئی صورتیں انور کہتے
کوئی حسن کا مندر کہتے، کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

نظام الملک آصف جاہ اول نے شمالی ہند کے ڈھلے ہوئے لہجہ میں کہا:۔

گالی نہ کہو کوئی میرے دلبر کو حسد سے
مجھ دل کے گلے میں یہ دعائے یمنی ہے

آصف جاہ اول کے فرزند اور جانشین نے اس لہجہ اور اسلوب کو اپنے کلام میں جاری رکھا:۔

چشم بد دور دلبراں سارے
اپنے ناصر کو پیار کرتے ہیں

نواب میر عثمان علی خاں عثمان اردو شعر کی عظیم روایت کے محافظ اور ضامن تھے[1] اور ان کے کلام میں اس روایت کے پرتو کا پایا جانا لازم تھا۔ تشبیہ و استعارہ۔ محاورہ۔ روزمرہ اور زبان و بیان کے اعتبار سے حضرت عثمان کے کلام میں اردو کے مستند و معروف غزل گو شعرائ کی بازگشت ملتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا مطالعہ گہرا اور نظر وسیع تھی اور وہ ہر گلستاں کی گلچینی کر سکتے تھے۔

نیا یہ رنگ نکالا میری عیادت کا
وہ دیکھ کر میرے زخموں کو مسکراتے ہیں

مئے گل رنگ کی ہے جلوہ گری شیشے میں
بند کی ہے میرے ساقی نے پری شیشے میں

بات میں بات کیا نکالی ہے
اس کی جو بات ہے نرالی ہے

---

[1] کلام آصف سابع دیباچہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی تاریخ اشاعت سنہ ۱۹۷۵ء

رخسار و چشم یار کی تصویر دیکھنا
نرگس کے پھول باندھ دیے ہیں گلاب میں

اس قدر کھپ گئی آنکھوں میں یہ صورت تیری
اب کسی کو بھی نہ ہم تیرے سوا دیکھیں گے

تیری نظر سے ترا مدعا سمجھتے ہیں
نظر شناس تیری ہر ادا سمجھتے ہیں

زبان کی صحت، صفائی اور سلاست کے اہتمام کی ضرورت شاعری اور موسیقی کے لیے اولاً محسوس کی گئی بعد میں نثر میں بھی اس کا لحاظ رکھا جانے لگا۔ زبان و ادب کے ارتقاء اور ترقی میں یہ عمل مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ گفتگو اور تحریر میں اس کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ زبان کس درجہ صحیح صاف اور سلیس، سادہ اور خوبصورت ہے زبان کی صحت و صفائی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کلام میں فکر، جذبہ اور تخیل کا عنصر کم یا برائے نام ہو۔ ایسے میں حُسن بیان کے اعتبار سے دل نشین ہو جاتا ہے۔ اور کلام کا دل نشین ہونا کلام اور صاحب کلام دونوں کا بڑا قابل قدر کارنامہ ہے۔ ان امور کی روشنی میں نواب میر عثمان علی خاں کے یہ شعر پیش کیے جاتے ہیں:۔

آہوں میں کچھ کمی نہ ہوئی داغ عشق میں
تھا یہ عجب چراغ کہ روشن ہوا میں تھا

آتا ہے تو، نہ جان نکلتی ہے ہجر میں
تیری طرح سے بھول گئی ہے قضا مجھے

ناز و ادا سے آپ کا آنا تو دیکھیے
تعظیم کو کھڑی ہے قیامت بھی راہ میں

ہمارے عشق کا افسانہ اکثر
وہ سنتے ہیں رقیبوں کی زبانی

جب حالِ دل کہا ہے ملا ہے یہی جواب
کچھ اور کہیے ، ذکر یہ سو بار ہو گیا

ہم سے قفس نصیب کو صیاد کیا خبر
باقی ہیں کچھ بہار کے دن یا گزر گئے

ہم پہ کیا موقوف پروانے کی حالت دیکھ لو
شمع کی صورت جلا، پہنچا جو بزمِ یار تک

عثمان کہیں کہیں داغ دہلوی کے رنگ کو اپنانے میں نمایاں حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً

الٰہی خیر ہو بدلے ہوئے ہیں یار کے تیور
ستم آیا ، غضب آیا ، بلا آئی ، قضا آئی

اس درجہ بے اثر میری آہ جگر ہوئی
اس بے خبر کے دل کو نہ مطلق خبر ہوئی

نگاہیں قہر ڈھاتی ہیں ادائیں دل لبھاتی ہیں
قیامت جس کو کہتے ہیں تیری اٹھتی جوانی ہے

آنکھوں میں اثر مئے کا ہے لغزش ہے قدم میں
یہ تو کہو ، اس شان سے آتے ہو کہاں سے

دبستان لکھنؤ میں صنایع بدایع اور دوسرے تکلفات اردو شاعری کا وسیلہ نہیں بلکہ مقصد سمجھا جانے لگا۔ اس سے ہر صنف کلام کو نقصان پہنچا۔ زندگی نے یکسر اور یک بیک پلٹا دکھایا ہوتا تو اردو شاعری مدتوں ان کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکتی تھی فورٹ ولیم کے اثرات کی بنا پر لکھنؤ۔ علی گڑھ۔ دہلی اور لاہور میں تکلف اور تصنع کی شاعری دیر تک قایم نہ رہ سکی۔ حیدرآباد اس محور اور منطقہ سے بہت دور اور الگ تھلگ تھا۔ شاید اس وجہ سے عثمان کی شاعری کا انداز اور اسلوب زیادہ تر وہی رہا جو لکھنؤ اسکول کا تھا۔ مثلاً

یہ بھی درازیٔ شب ہجراں کی ہے دلیل
جو شام سے تصور گیسوئے یار ہے

مثل پروانہ جلائے ہیں دلوں کو کیا کیا
شعلہ رویوں نے بھی اندھیر مچا رکھی ہے

افشاں جما کے تم نے یہ اندھیر کر دیا
گرنے لگے زمیں پہ ستارے نئے نئے

کسی نے دست حنائی سے پوچھ کر آنسو
لگا دی آگ مری اشک بار آنکھوں میں

صبح عشرت اپنی یاں شام جدائی ہو گئی
زلف کو عارض پہ کیوں تو نے پریشان کر دیا

شاعری بالخصوص غزل گوئی میں شعرا غم دوراں اور غم جاناں کے ساتھ ساتھ اپنے بارے میں بھی کچھ اعلان و اعتراف کرتے رہتے ہیں جو شاعر کے تجربے۔ تخیل یا تاثر کا خلاصہ ہونے کے باعث اس کی شخصیت اور شاعری کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ کلام یا حاصل کلام کا اختتام شعرا اکثر اپنے تخلص پر کرتے

ہیں۔ مقطع۔ نظم کا نقطہ عروج اور شاعر کی فکر و نظر کی رسائی یا نارسائی کا پیمانہ یا پیمائش ہوتا ہے اور اس میں "سخن گسترانہ بات" کا آنا لازمی ہے۔ عثمان کے کچھ مقطعے ملاحظہ ہوں۔

عثمان بھی شاعری میں بڑا نام کر گیا
گو اک سے اک بڑھا ہوا خلق خدا میں تھا

عثمان طمع رہی نہ کسی بات کی مجھے
سب کچھ ہے میرے پاس خدا کا دیا ہوا

ہمیشہ رہے فضل خالق سے عثمان
ریاست تمھاری حکومت تمھاری

مجھے شاہد پرستی سے نہیں انکار اے عثمان
نہ عابد ہوں نہ زاہد ہوں نہ عالم ہوں نہ فاضل ہوں

علوم مشرقی کی آج عثمان
توجہ نے تیری رفعت بڑھادی

آپ کی ایک مشہور غزل کا مقطع ایک زمانہ تک بڑا نزاعی بنا رہا۔

سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشان باقی

کچھ لوگ مصرعہ ثانی کو کچھ اس طرح پڑھنے لگے۔

"مسلمانوں سے تیری سلطنت کا ہے نشان باقی"

حمد و نعت و منقبت میں شاعر، خدا اور رسول کے حضور میں اپنی عبودیت اور عقیدت کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کے اردو کلام

(نعت و منقبت) میں جو والہانہ عقیدت اور زبان و بیان کی بے ساختگی ملتی ہے اس کی چند مثالیں پیش ہیں:-

دل کو خدا نے اپنی محبت سے بھر دیا
تسبیح کو زبان دی سجدے کو سر دیا
کس منھ سے شکر ایزد باری ادا کروں
ناچیز تھا سو اس کو بھی اک چیز کر دیا
عثمان یہ اس کا فضل ہے تجھ پر کہ بے سوال
نعمت سے اپنی دامن مقصود بھر دیا

ایک غزل ملاحظہ ہو:-

خوب رو کرتے ہیں انداز سے مائل اپنا
دیکھنا یہ ہے کہ آتا ہے کدھر دل اپنا
داغ کھانے کے لیے سینہ میں اپنے ہے جگر
درد کے واسطے پہلو میں بنا دل اپنا
ناخدا کی نہیں حاجت کہ خدا مالک ہے
آ ہی پہنچا ہے سفینہ لب ساحل اپنا
قدر داں دل کے زمانہ میں بہت ہیں لیکن
کیا کریں ہم کہ نہیں دل کسی قابل اپنا
رکھ قدم کوچۂ الفت میں سنبھل کر عثمان
آدمی سوچ لے ہر کام میں حاصل اپنا

پروفیسر رشید احمد صدیقی دیباچہ "کلام آصف سابع" (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) میں یوں لکھتے ہیں:-

" اعلیٰ حضرت نے اپنی عمر میں زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اور خانوادہ آصفی کے آخری فرمانروا میر عثمان علی خاں آصف سابع بیشتر لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مماثل ہیں۔ یہ دونوں اپنی محرومی و بربادی دیکھنے کے

سے بیے دیر تک زندہ رہے۔ ایک جلاوطنی میں دوسرا اپنی بارگاہ بام و در میں۔ شاہ ظفر کی شاعری میں "دردِ گدایا" کا کرب جا بجا ملتا ہے۔ ناممکن تھا کہ میر عثمان علی خاں کی شاعری میں "دضع روزگار کا غم نہ ملے۔ ٹھمریاں لکھنے کا دونوں کو شوق تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ شاہ ظفر اس طرح کے گانے تصنیف کرکے مغنیوں سے سننے کے شایق تھے۔ ممکن ہے اعلیٰ حضرت بھی ہوں لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ عمر کے آخر حصہّ میں جب حیات اور حکومت کا آفتاب ڈوبنے کے قریب تھا اور یاس و تنہائی اور خاموشی کے سائے اور سردی بڑھنے لگتی ہے تو اسی طرح کے غم ناک راگوں میں پناہ لینے سے کسی قدر تسکین ملتی ہے۔ کاش اعلیٰ حضرت کا کلام تاریخ وار مرتب کیا جا سکتا تاکہ معلوم ہو سکتا کہ سوزِ غم اور درد و داغ کہاں کہاں اور کیسے آئے۔ تاہم بعض اشعار خواہ وہ کسی دور کے ہوں یا تو حقیقت حال ہیں یا اندیشہ فردا۔" مثلاً

ستم کا دور رہا بار بار ہم پر بھی
نہ پوچھ کیسے تھے یہ روزگار ہم پر بھی
بتائیں کیا تھیں قصے زماں ماضی کے
گزر چکے ہیں یہ لیل و نہار ہم پر بھی
اک نہ اک طرح تھیں عمر کو اپنی عثماںؔ
جھیل کر آفت و آلام بسر کرنا ہے
سابق کے رنگ ڈھنگ وہ عثماںؔ بدل گئے
منظر نئے نئے ہیں قرینے نئے نئے

وہ شہ عثماںؔ شاہ دکن سلطان الشعراء جو کسی زمانہ میں یہ کہتے تھے کہ

جبہ سا خاک دکن یہ آج ہے سارا جہاں
ملک دارا اور ہے اقبال عثماںؔ اور ہے

یا یہ دنیا کہتی جاتی ہے صداقت کی قسم کھا
عروج و شان و شوکت میں ذرا ملک دکن دیکھ
یا' زمانہ کہتا ہے بے لاگ عثمان
ہر اک کو آس ہے تیری ہی در سے

بدلے ہوئے حالات میں اس کا لہجہ کتنا بدل جاتا ہے :-

کس نے ملایا بادہ میں سم کچھ نہ پوچھیے
کیا کیا ہوئے ہیں ہم پہ ستم کچھ نہ پوچھیے
زمانہ کے حالات کا ہے اثر
میری زیست مجھ پر گراں ہوگئی

۲۴۔ فروری سنہ ۱۹۶۷ء کو میر عثمان علی خاں آصف سابع کے انتقال کے ساتھ ہی ایک عہد ایک دور اور ایک تمدن کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ایک نئے معاشرہ نے جنم لیا۔

فلک کے جور سے سب لطف مٹ گیا عثمان
نہ مئے رہی نہ وہ صحبت نہ یار باقی ہے

ضمیمہ ۱

سلاطین آصف جاہی حیدر آباد

	تاریخ پیدائش	دورِ حکومت	انتقال
میر قمر الدین علی خاں آصف جاہ اول	۱۱؍جولائی ۱۶۷۱ء	۳۱ جولائی ۱۷۲۰ء تا ۲۲ مئی ۱۷۴۸ء	۲۲؍مئی ۱۷۴۸ء
میر احمد علی خاں ناصر جنگ نظام الدولہ	۱۵؍فروری ۱۷۱۲ء	۲۳؍مئی ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۰ء	۵؍دسمبر ۱۷۵۰ء
ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ		۵؍دسمبر ۱۷۵۰ء تا ۳؍فروری ۱۷۵۱ء	۳؍فروری ۱۷۵۱ء
سید محمد خاں امیر الملک صلابت جاہ	۱۷۱۸ء	۱۷۶۲ء تا ۸؍جولائی ۱۷۶۴ء	۱۱؍ستمبر ۱۷۶۳ء
نواب میر نظام علی خاں نظام الملک دوم	۲۴؍فروری ۱۷۳۴ء	۶؍اگست ۱۸۰۳ء	۶؍الست ۱۸۰۳ء
نواب میر اکبر علی خاں نظام الملک سوم سکندر جاہ	۱۱؍نومبر ۱۷۶۸ء	۱۱؍اگست ۱۸۰۳ء تا ۲۱؍مئی ۱۸۲۹ء	۲۱؍مئی ۱۸۲۹ء
میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ نظام الملک آصف جاہ چہارم	۲۵؍اپریل ۱۷۹۴ء	۲۳؍مئی ۱۸۲۹ء تا ۱۷؍مئی ۱۸۵۷ء	۱۷؍مئی ۱۸۵۷ء

میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ نظام الملک آصف جاہ چہارم	۱۱ر اکتوبر ۱۸۲۷ء	۱۸ر مئی ۱۸۵۷ء تا ۲۶ر فروری ۱۸۶۹ء	۲۶ر فروری ۱۸۶۹ء
نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک آصف جاہ ششم	۱۷ر اگست ۱۸۶۶ء	۲۹ر فروری ۱۸۶۹ء تا ۲۹ر اگست ۱۹۱۱ء	۲۹ر اگست ۱۹۱۱ء
نواب میر عثمان علی خاں نظام الملک آصف جاہ ہفتم	۵ر اپریل ۱۸۸۶ء	۱۸ر ستمبر ۱۹۱۱ء تا ستمبر ۱۹۴۸ء	۲۴ر فروری ۱۹۶۷ء

ضمیمہ ۲

صدرالمہامان (وزیراعلیٰ) ریاست حیدرآباد

دیانت خاں	۱۷۲۴ء	تا	۱۷۳۶ء
انوراللہ خاں	۱۷۳۶ء	تا	۱۷۴۲ء
خدابندہ خاں	۱۷۴۲ء	تا	۱۷۴۸ء
شاہنواز خاں	۱۷۴۸ء	تا	۱۷۵۰ء
راجہ رام دار (رگھوناتھ داس)	۱۷۵۰ء	تا	۱۷۵۲ء
سید لشکر خاں	۱۷۵۲ء	تا	۱۷۵۵ء
شاہنواز خاں شمس الدولہ بار دوم	۱۷۵۵ء	تا	۱۷۵۸ء
نواب بسالت جنگ	۱۷۵۸ء	تا	۱۷۶۰ء
وٹھل سندر (راجہ پرتاپ ونت)	۱۷۶۱ء	تا	۱۷۶۳ء
سید لشکر خان۔ بار دوم المخاطب نواب رکن الدولہ	۱۷۶۵ء	تا	۱۷۷۵ء
نواب شمس الملک وقار الدولہ	۱۷۷۵ء	تا	۱۷۷۸ء
نواب نظام الامرآ ارسطوجاہ	۱۷۷۸ء	تا	۱۷۹۵ء
راجہ شام راج راجہ رایاں	۱۷۹۵ء	تا	۱۷۹۷ء
نواب ارسطوجاہ بار دوم	۱۷۹۷ء	تا	۱۸۰۴ء
نواب میر عالم	۱۸۰۴ء	تا	۱۸۰۸ء
نواب منیر الملک	۱۸۰۹ء	تا	۱۸۳۲ء
مہاراجہ چندو لعل	۱۸۳۲ء	تا	۱۸۴۲ء
راجہ رام بخش	۱۸۴۳ء	تا	۱۸۴۶ء
نواب سراج الملک	۱۸۴۶ء	تا	۱۸۴۸ء

سیف جنگ حلف المجید الملک	نومبر ۱۸۴۸ء	تا	دسمبر ۱۸۴۸ء
نواب شمس الامراٗ	جنوری	تا	مئی ۱۸۴۹ء
راجہ رام بخش	۱۸۴۹ء	تا	۱۸۵۱ء
راجہ گنیش راؤ	ماہ اپریل	تا	ماہ جون ۱۸۵۱ء
راجہ سراج الملک	۱۸۵۱ء	تا	۱۸۵۳ء
نواب سالار جنگ اول	۱۸۵۳ء	تا	۱۸۸۳ء
دور ریجنسی بہ وجہ نابالغی حکمراں	۱۸۸۳ء	تا	۱۸۸۴ء
نواب عماد الملک سالار جنگ دوم	۱۸۸۴ء	تا	۱۸۸۷ء
سر آسمان جاہ	۱۸۸۸ء	تا	۱۸۹۴ء
سر وقار الامرا	۱۸۹۴ء	تا	۱۹۰۰ء
مہاراجہ سرکشن پرشاد	۱۹۰۰ء	تا	۱۹۱۲ء
نواب یوسف علی خاں سالار جنگ سوم	۱۹۱۲ء	تا	۱۹۱۴ء
بالراست نگرانی میر عثمان علی خاں نظام الملک نظام ہفتم	۱۹۱۴ء	تا	۱۹۱۹ء
تقرر کونسل وزرا زیر صدارت سر علی امام	۱۹۱۹ء	تا	۱۹۲۲ء
نواب سر فریدوں ملک	۱۹۲۲ء	تا	۱۹۲۳ء
نواب ولی الدولہ	۱۹۲۳ء	تا	۱۹۲۵ء
مہاراجہ سرکشن پرشاد صدر اگزکیٹو کونسل	۱۹۲۵ء	تا	۱۹۳۶ء
سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ	۱۹۳۶ء	تا	۱۹۴۱ء
احمد سعید خاں چھتاری سعید الملک	۱۹۴۱ء	تا	۱۹۴۶ء
سر مرزا اسمٰعیل امین الملک	۱۹۴۷ء	تا	۱۹۴۸ء
میر لایق علی	جون ۴۸ء	تا	ستمبر ۱۹۴۸ء

ضمیمہ ۳

LIST OF THE BRITISH RESIDENTS AT HYDERABAD

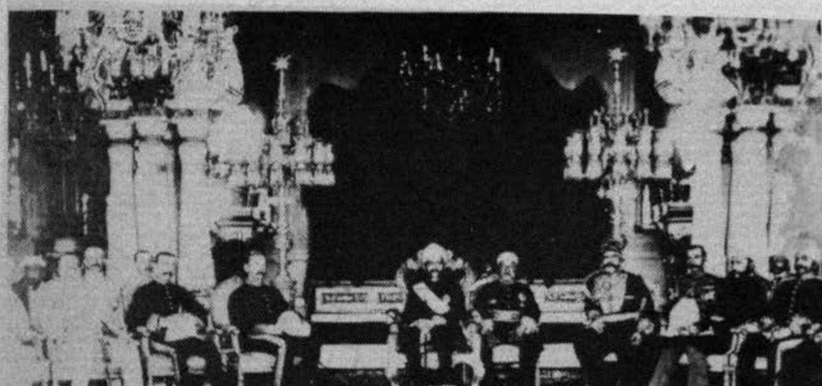
1 Mr. Hollond, the first British Envoy	10th April 1779
2. Mr. Grant	1780 – 1784
3. Mr. R. Johnson	1784 – 1787
4. Captain Kennaway	1788 – 1794
5. Captain W. A. Kirkpatrick	1794 – 1797
6. Captain J.A. Kirkpatrick	1798 – 1805
7. Mr. H. Russell	1805 – 1806
8. Captain T. Sydenham	1806 – 1810
9. Lieutenant C. Russell	1810 – 1811
10. Sir Henry Russell	1811 – 1820
11. Sir Charles Metcalfe	1820 – 1825
12. Captain H. C. Barrett	Aug to Sept. 1825
13. Mr. W. B Martin	1825 – 1830
14. Mr. E C. Ravenshaw	Aug to Nov 1830
15. Colonel J. Stewert	1830 1838
16. Major J. C. Cameron	Jan. to June 1838
17. Brigadier J. Waheb, C.B.	June to July 1838
18. Major T. Tomkyns	July to Sept 1838
19. General J. S. Fraser	1838 – 1852
20. Major Davidson	1852 – 1853
21. General Low, C.B.	March to Sept 1853
22. Major R. Davidson	Sept to Nov 1853

23. Mr. G. H. Bushby	1853–1856
24. Captain A. R. Thornhill	1856–1857
25. Colonel R. Davidson	1857–1862
26. Sir George Yule, C.B., K.C.S.I.	Jan. to April 1863
27. Sir Richard Temple, K.C.S.I.	1857–1868
28. Mr. J. G. Cordery	Jan. to March 1868
29. Mr. H.A. Roberts, C.B., C.S.I.	March to May 1868
30. Mr. J. G. Cordery, I.C.S.	May to June 1868
31. Mr. C.B. Saunders, C.B.	1868–1872
32. Colonel P. S. Lumsden, C.S.I.	July to Dec. 1872
33. Mr. C. B. Saunders	1872–1875
34. Sir Richard Meade, K.C.S.I.	1875–1881
35. Sir Stuart Bayley, K.C.S.I.	1881–1882
36. Major G. H. Trevor	June 1882
37. Mr. W. B. Jones I.C.S.	1882–1883
38. Mr. J.G. Cordery, C.S.I.	1883–1884
39. Sir Oliver St. John, K.C.S.I.	1884–1886
40. Colonel E. C. Ross, C.S.I.	April to Oct. 1886
41. Mr. J.G. Cordery	Oct. 1886
42. Mr. D. Robertson	1887–1888
43. Mr. A. P. Howell	1888–1889
44. Sir Denis Fitzpatrick, K.C.S.I.	Aug. to Nov. 1889
45. Sir Trevor Plouden, K.C.S.I.	1891–1900
46. Sir David Barr, K.C.S.I.	1900–1905
47. Sir Charles Bayley, K.C.S.I.	1905–1908
48. Sir Michael O'Dwyer, K.C.S.I.	1908–1911
49. Sir Alexander Pinhey, K.C.S.I.	1911–1916
50. Mr. S. M. Fraser, C.S.I., C.I.E.	April 1914
51. Sir Alexander Pinhey	1914–1916
52. Sir Stuart Fraser, K.C.S.I.	1916–1919
53. Mr. C. L. S. Russell, I.C.S.	1919–1924
54. Sir W. P. Barton, K.C.S.I.	1924–1927
55. Terence Humphrey Keyer	1927–1930
56. D.C. Mackenzie	1930–1937
57. C.H. Gidney	1937–1938
58. A.C. Lothian	1938–1942
59. C.G. Herbert	1942– 25 Nov. 1946



Nawab Mahaboob Ali Khan (Nizam VI)when he was seven year old along with the court nobles.

نواب میر محبوب علی خاں نظام ششم کے "دور ریجنسی" میں امرائے حیدرآباد کا ایک گروپ فوٹو



Nizam VI with the Resident Mr. Crawford in Darbar at Chowmahalla Palace on 20th August, 1898.

قصر چو محلہ ۱۸۹۸ء میں رزیڈینٹ مسٹر کرافورڈ اپنے کاغذات تقرر
میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کی خدمت پیش کر رہے ہیں۔



شہر حیدر آباد میں نواب آسمان جاہ کے محل "خانہ باغ" کا ڈرائنگ روم

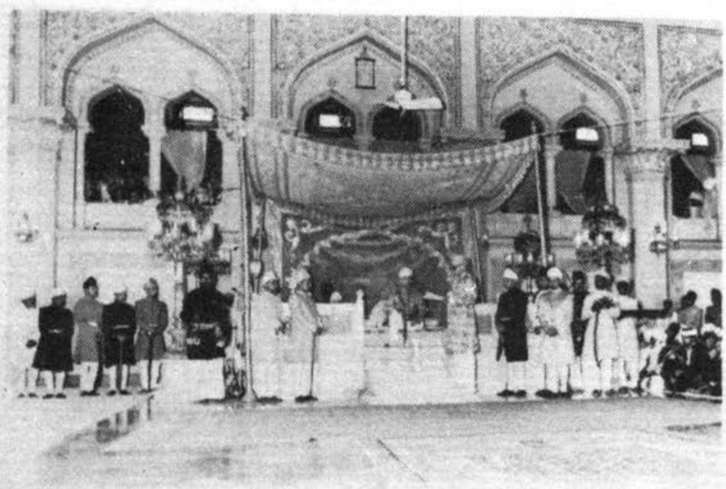


مہاراجہ سرکشن پرشاد
پیشکار ریاست
(خاندانی جواہرات سرپیچ،
بازوبند، مالا اور پٹکہ پہنے ہوئے)

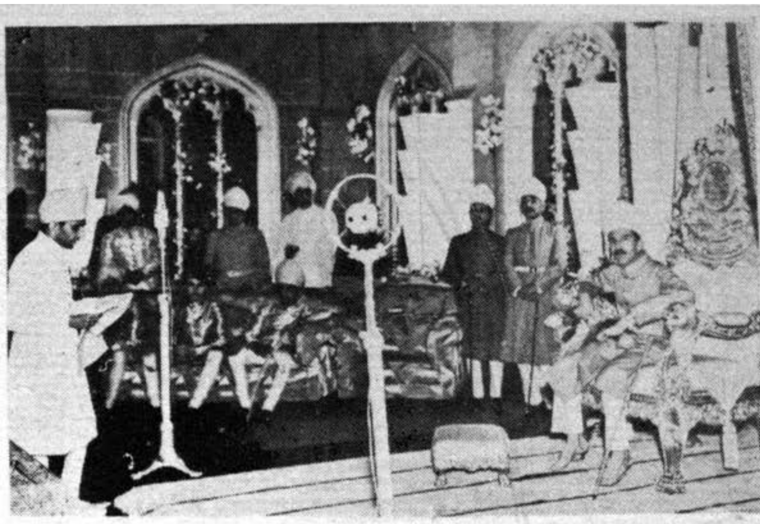


قصر کنگ کوٹھی میں نواب میر عثمان علی خاں نظام سابع کا ملاقاتی کمرہ

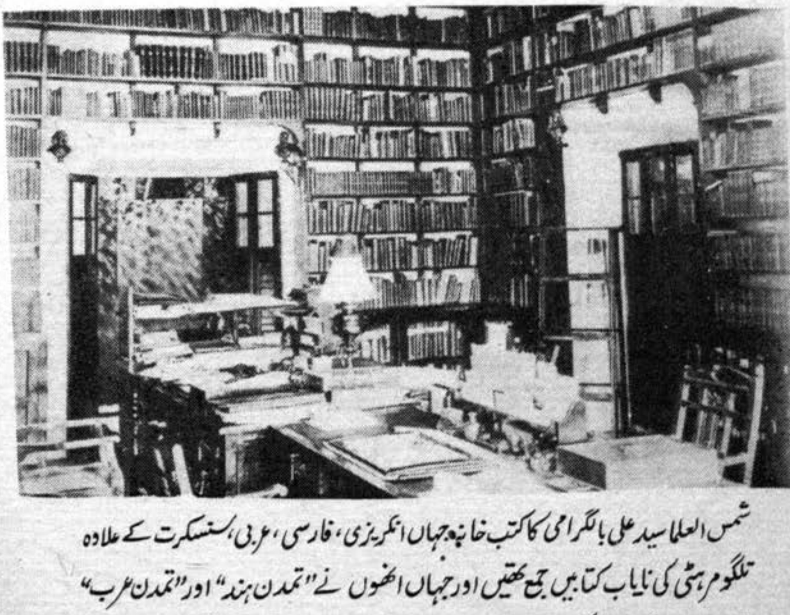
تصویر :۔ بشکریہ راجہ دین دیال



آخری نظام حیدرآباد کے مسند نشینی کی تقریب بتاریخ ۶/اپریل
شہ نشین کے آخری زینہ پر جناب ظہیر احمد، حکومت ہند کے اس حکم نامہ کو پڑھ رہے
ہیں جس کے ذریعہ نواب میر برکت علی خاں کو نظام ثامن (ہشتم) قرار دیا گیا۔



اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی سلور جوبلی کے موقعہ پر قصر "ہل فورٹ"
(موجودہ رٹز ہوٹل) میں ایک تہنیتی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب میں جونیر پرنس
نواب معظم جاہ (صدر نشین مجلس آرائش بلدہ)، سپاس نامہ پیش کر رہے ہیں۔ اعلیٰ
حضرت کے سیدھے جانب نواب ہوش یار جنگ (مصاحب خاص) اور کوتوال شہر
نواب رحمت یار جنگ کھڑے ہیں۔ سامنے سنیر پرنس اعظم جاہ بہادر (ولی عہد)
تشریف فرما ہیں



شمس العلما سید علی بالگرامی کا کتب خانہ جہاں انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت کے علاوہ
تلگو مرہٹی کی نایاب کتابیں جمع تھیں اور جہاں انھوں نے "تمدن ہند" اور "تمدن عرب"
جیسی مستند کتابیں لکھیں۔



۱۹۳۶ء میں بہ سلسلہ تقاریب سلور جوبلی ایک خاص دربار بمقام "جوبلی ہال" (باغ عامہ)
منعقد ہوا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت، اعلیٰ حضرت کے دائیں جانب شہریان
حیدرآباد کی جانب سے سپاس نامہ پیش کرنے کے بعد "جواب شاہانہ" سماعت کر رہے ہیں۔



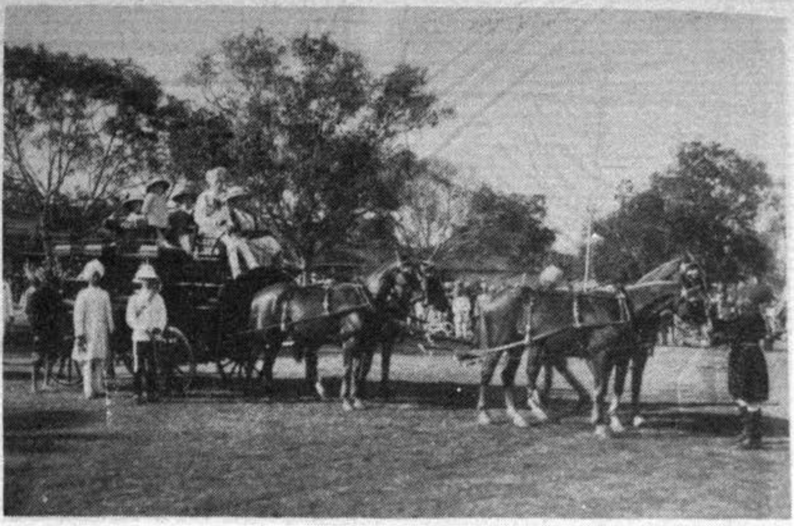
بشیر باغ پیالس کا ایک ڈرائنگ روم



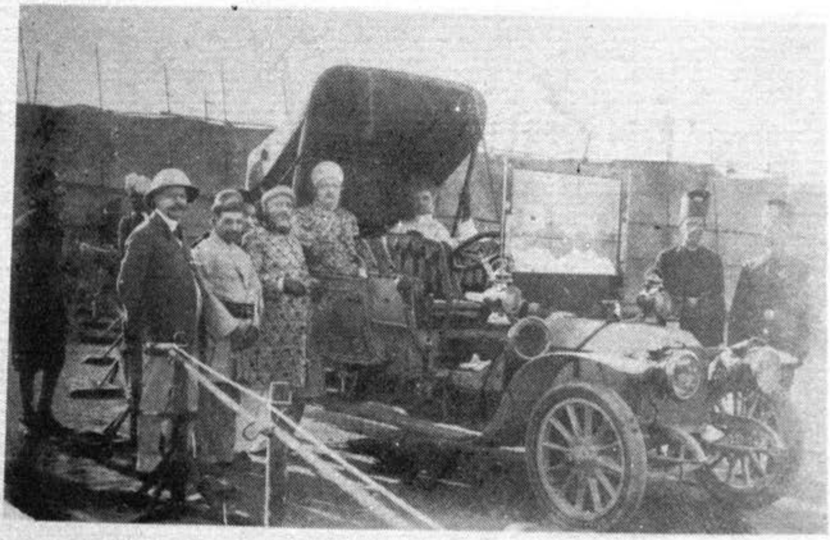
فریدوں جی (نواب فریدالملک، حیدرآباد کے پہلے اور آخری صدراعظم) کا ملاقاتی کمرہ۔



شاہراہ گلزار حوض کا ایک منظر ۱۸۹۲ء
قدیم سواریاں :۔ شکرام، رتھ اور ٹانگا نظر آرہے ہیں۔



چوکڑا:۔ موٹر کے رواج سے قبل ایک شاہی سواری۔

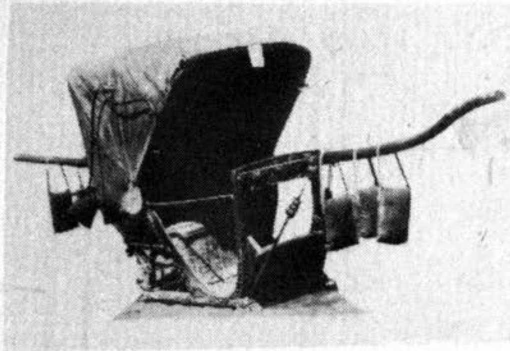


۔ایک حیدرآبادی امیر ۱۹۰۸ء ماڈل کی موٹر کار میں۔
۔حیدرآباد پولس کے جوان اپنی خاص وردی میں کھڑے ہیں۔

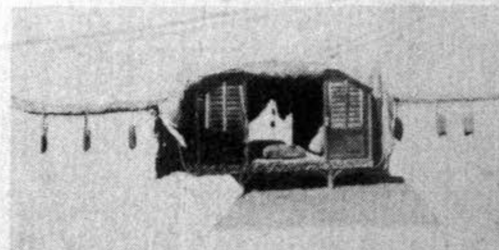
(تصویر۔ ادارہ ادبیات اردو)



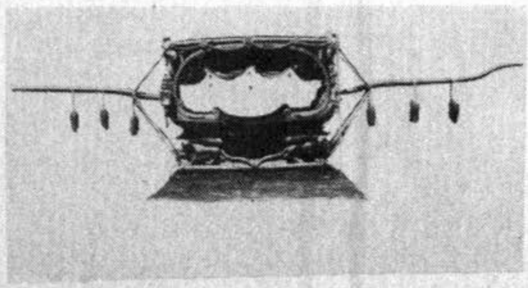
مہ لقا بائی چنداؔ اس زمانہ کے لباس میں



"پالکی" یہ سواری شکار یا تفریح کے لیے استعمال ہوتی تھی۔



"میانہ" جو زنانہ سواری کے لیے مخصوص تھا۔



"ہوادار" صبح اور شام کی تفریح کے لیے ایک پسندیدہ سواری تھی۔